

ریاستی اداروں کے مابین ہم آہستگی کا فروغ ... دورِ حاضر کا تقاضا ۱۱

اپریل ۲۰۱۸ء

اردو ڈائجسٹ

بھارتی جرنیل ممبئی حملوں کے خالق نکلے

شراغیہ سازش کی ڈرامائی کہانی

بیلو، پائے، پائے

۱۲۴ میاؤں مائوں کا انوکھا اندازِ تربیت

۱۲۵ لے پالک کہاں جائیں؟

۱۲۶ گولڈن ایچوں کا گھسیل چھس

معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو

۱۵۴ شجاعت و دلیری کی عجب نئی تاریخ رقم ہوئی

۱۵۵ اطلاعاتی ہمارے بھائی ہیں

۱۵۶ اٹلی کا لچپ و منفرد سفر نامہ



السنہ کا قرآن

پالی ہے اسے نورانوں رات اپنے بندے کو لے گیا مسجد حرام سے مسجد اقصا تک جس کے گرد و گرد
ام نے برکت رکھی کہ ہم اسے اپنی عظیم نشانیاں دکھائیں بیشک وہ مستند کھتا ہے۔ (پہنچ ایشو آفین: ۱)
پھر وہ قریب ہوا، اور قریب ہوا۔ یہاں تک کہ صرف دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے
گہی کم فاصلہ رہ گیا۔ پس وحی کی اللہ نے اپنے (محبوب) بندے کی طرف جو وحی کی۔ نہ
بھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشم مصطفیٰ نے)۔ کیا تم جھگڑاتے ہو ان سے اس پر جو انھوں
نے دیکھا اور انھوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا۔ سدرۃ المنتہی کے پاس۔ (التخجید: ۱۳ تا ۱۸)

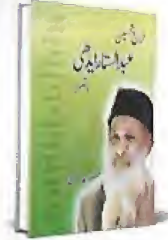
حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے
رب کو دو مرتبہ دیکھا ایک مرتبہ سر کی آنکھوں سے اور دوسری مرتبہ دل کی آنکھوں سے۔
(المعجم الکبیر، المعجم الاوسط، المواہب اللدنیہ، نشر الطیب)
حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے
سنا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب قریش نے میری (معراج کی) تکذیب کی اس
وقت میں حجر اسود کے پاس تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس میری نظروں میں
عیاں کر دیا اور میں اسے دیکھ دیکھ کر اس کی تمام نشانیاں قریش کو بتا لے لگا۔
(صحیح البخاری، جامع الترمذی، صحیح المسلم، مسند احمد بن حنبل)

السنہ کا فرمان

ممتاز بینکر اور عالمی سیاح مقصود چغتائی

نی منفرد با اعتماد... اور عملی معلومات پر مبنی نئی کتابیں شائع ہو گئی ہیں۔
بینک کے مروجہ قوانین اور ہولتوں سے فائدہ اٹھائیں
ایپورٹ ایکسپورٹ اور ترشحہ جات کی سہولیات
حقیقی زرمبادلہ سے لاکھوں کیسے کمائیں؟

بینکنگ گائیڈ اصل قیمت 1000 رعایتی قیمت 670 رعایت 330



سابق وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف، میاں شہباز شریف، عمران خان، سران الحق،
کرکٹر جاوید میاندادی دیگر اہم شخصیات کے تاثرات پر مبنی حیرت انگیز اور فکر انگیز

خراج تحسین عبدالستار ایدھی باتصویر

اصل قیمت 2000 رعایتی قیمت 1340 رعایت 660

اس کتاب کا منافع عبدالستار ایدھی ٹرسٹ کو جائے گا

ماہنامہ صدائے پاکستان کے خصوصی نمبر	اصل قیمت / ہدیہ	رعایتی قیمت / ہدیہ	رعایت
1 گرمیوں کی چھٹیوں میں کہاں جائیں؟ (شمالی علاقہ جات)	200	134	66
2 قرضہ لیں اور کاروبار شروع کریں (بینک کے مروجہ قوانین)	200	134	66
3 ایکسپورٹ کریں اور آمدنی بڑھائیں (حقیقی زرمبادلہ کمائیں)	200	134	66
4 امریکی ویزا کیسے حاصل کریں؟ (ڈوئل ٹرپ پالیسیاں)	200	134	66
دلچسپ اور معلوماتی نئی کتب انتہائی کم قیمت پر حاصل کریں			
5 چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا (حصوں ویزا ایگریگیشن قوانین) از مقصود چغتائی	500	335	165
6 غیور قبائل پر مبنی نوکلڈی۔ بلوچستان کا اہم حصہ از عبدالباقر حسن زئی	200	134	66
7 سکاؤٹ بچوں کی ہائیک اور اصول ہائیکنگ از مقصود چغتائی	200	134	66
8 سکاؤٹس والا کھانڈینڈا (پنجابی) از مقصود چغتائی	200	134	66
9 The Scouts Hike & Scouts Principles ایضاً	200	134	66
10 بوسنیا آوارہ گرد کی نظر سے از محمد زویب صدیقی	400	268	132
11 تفسیر قرآن حکیم پارہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ از ممتاز سرکار ڈاکٹر غلام مرتضیٰ	900	600	300
کل رعایت			1815

محدود اسٹاک ہے۔ ابھی رابطہ کریں اور گھر بیٹھے منگوائیں

ملک کا پتہ: ولید پبلشرز 394 بلاک G/4، ایم اے جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: 0092-321-4806800 / 0333-4254394

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طبیب اعجاز قریشی
ڈپٹی ایڈیٹر: سید عامر محمود
سب ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: ڈاکٹر آصف محمود چاہ، سہلی انصوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انتشار کی ٹیکنیشن: افغان کارمان قریشی
ڈیزائنر و کمپوزر: کاشف شہزاد، فیصل ایوب

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ڈی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisment@urdudigest.pk
0320-4437564
لاہور: ندیم حامد 0300-4242620

سالانہ خریداری

560 روپے کی بچت کے ساتھ

subscription@urdudigest.pk
خریداری کے لیے رابطہ
فون: +92-42-35290707
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں
یہ وہ ملک 100 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک کے خریداری رقم بذریعہ بینک ورافٹ
ورج ویل کا کوائف نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
PK34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت 100 روپے

جائی، ناشرانہ، سن، قرض، نمبر، ڈائجسٹ، پتہ، 24 گھنٹہ سے چھ ماہ تک

ایگزیکٹو ایڈیٹر سٹرنوٹ

**جہان شب ہے دھواں صبح انقلاب بنو
جلاد و تخت بتاں، دست احتساب بنو**

ہمارے سیکورٹی اداروں کی شبانہ روز سی و جستجو سے وطن عزیز میں دہشت گردی کے واقعات خاطر خواہ کم ہو چکے۔ امن و امان بحال کرنے کے لیے ان کی سائنسی انداز میں گنگی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ آج دورہ خمیر سے لے کر کراچی تک کوئی ملکی یا غیر ملکی کسی بھی ہوٹل میں شہرے تو اس کا شناختی کارڈ یا پاسپورٹ اسکیمن ہوتا ہے پھر کمپیوٹر میں سیکورٹی اداروں کے ڈیٹا بینک سے منسلک ایک خصوصی سافٹ ویئر ان شناختی دستاویزات کے کوائف کا جائزہ لیتا ہے۔ اگر معمولی سی مشکوک بات بھی ظاہر ہو، تو فورس فوراً اس شخص کے سر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں بین کے اس جدید نظام کی بدولت کئی دہشت گرد اور جرائم پیشہ افراد گرفتار ہو چکے۔

آپریشن روافساد کے ذریعے بھی ہر شہر میں گلی محلوں کی سطح پر شہریوں کی جانچ پڑتال جاری ہے۔ سیکورٹی ادارے ہر شہری کے کوائف نوٹ کر رہے ہیں۔ اس منظر کارروائی سے بھی دہشت گردوں اور مجرموں کے گروہ پکڑے جا چکے۔ غرض ہماری سیکورٹی فورسز مستحکم و خوشحال پاکستان کی بنیاد رکھ رہی ہیں۔ یہ خوش آئند تبدیلی ہے اور منبرے مستقبل کا پیغام دیتی امید کی علامت بھی۔

یہ بات مگر باعث تشویش ہے کہ پاکستان میں قانون کی حکمرانی مضبوط نہیں ہو پائی۔ ایسے وہ یہ کہ آج تک کسی طاقتور اور با اثر مجرم کو سزا نہیں مل سکی۔ جب بھی کوئی طاقتور مہستی احتساب کے شکنجے میں کے، تو وہ دیا شدہ ساری سے اپنا دفاع کرنے کے بجائے رونا روتی کہ فلاں فلاں بھی تو قانون کی گرفت سے آزاد گھومتے پھرتے ہیں۔ الزام تراشی کا یہ گھنٹا عمل افراد تک محدود نہیں رہا، احتساب کے چنگل سے بچنے کی خاطر ہر سرکاری ادارہ دوسرے اداروں کو فرائض یاد دلانے کی فکر میں گھلتا، اصلاحات نافذ کرنے پر زور دیتا اور دوسروں پر کچھ اچھا لگا دکھائی دیتا۔ اس روش سے نہ صرف عمل احتساب میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں بلکہ آئین بھی پامال ہونے لگا۔

ایک اور ایسا یہ کہ مروجہ نظام میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ دھندلے ہوا سیاست اور دیا دھار افراط و تفریط نے پائے، مثلاً کوئی شخص کار یا سرمایہ کار پورے ٹیکس دے اور ملکی قوانین کی پاسداری کرے، تو کوئی سسٹم اس کا مخالف بن جاتا۔ وہ ہر ایماندار اور قانون مند ماہری کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا۔

اس دورہ نظام کے باعث ہی ملکی ترقی و خوشحالی کے عناصر ایسے کئی تھے۔ مگر ان کے دل زبردستی رکھتے جو دیگر ممالک میں محض چند ماہ میں مکمل ہو جاتے۔ اسی لیے پاکستانی سرمایہ کار مجبوراً بیرونی ممالک جا کر سرمایہ دہے بنانے لگے۔ غیر ملکی سرمایہ کار بھی بدولت ہو کر دوسرے ممالک کا رخ کرنے لگے جہاں انھیں انھوں ہاتھ لایا جاتا۔ انھیں پرکشش تعلیمات و مراعات دی جاتیں۔ پوری سرکاری مشینری ان کے منصوبے عمل کرنے پر جرت جاتی کہ یوں مواقع روزگار جنم لیتے ہیں۔

ارض پاک میں عموماً وہی صنعت کار اور سرمایہ کار پھلتے پھوٹتے اور باعث تکریم پھرتے جو ملکی قوانین پر عمل نہ کریں، بجلی، گیس و ٹیکس چوری کر کے کاروبار کو فروغ دیں، پیسہ کمانے کے لیے انسانی جان کی بھی پروا نہ کریں، رشوت کے پیسے لگا کر اپنی ملائیں منظور کروائیں اور پیسہ باہر لے جائیں۔

جو سرکاری افسر اپنے فرائض دیا شدہ ساری سے انجام دے اور رپورٹ پر فیصلے کرے، اسے "کھٹلے لائن" لگا دیا جاتا۔ اس کی واحد ذمہ داری وزیراعظم یا وزیراعلیٰ کو خوش کرنا اور بلا چوں و چراما کامات بھالانا ہوتا۔ بلدیہ سے لے کر صوبائی و قومی اسمبلیوں اور عدالت کے جہاز با ارکان اپنی اصل دے داریاں نبھانے کے بجائے چند سیاسی غیر مستحیدہ اور نااہل افراد کے غیر تعمیری اور منفی اشارے کی تکمیل میں محو رہتے۔

ایک رپورٹ کی رو سے اعلیٰ ماحمت عدالتوں میں "اٹھارہ لاکھ" سے زائد مقدمات زیر التواء ہیں۔ اس افسوس ناک صورت حال سے وہاں ہے کہ ہمارا عدالتی نظام بھی مظلوم کو فوری انصاف نہیں دے پاتا۔ اس کو بھی "اور بالنگ" کی ضرورت تھی۔

یہ تھے وہ دیگر گول حالات جب چیف جسٹس متحرک ہوئے تاکہ ملکی نظام سے چلتی خرابیاں دور ہو سکیں۔ عمدہ انتظام (گڈ گورنس) کی اعلیٰ، سیاست و حکومت میں تبدیلی کی پیش کیے جانے اور طاقتور کرپٹ

شخصیات کو کلہرے میں لانے کے لیے انھوں نے دلیرانہ فیصلے کیے تو کرپٹ نظام کی محافظ قوتیں ان کی مخالفت کرنے لگیں مگر مظلوم عوام نے سپریم کورٹ کی مساعی جلیلہ کو سراہا اور اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ اس نازک صورت حال میں عمل احتساب کو تقویت پہنچانے کی خاطر سیکورٹی ادارے عدالت عالیہ کے پیشی بان بن گئے۔ باجوبہ ڈاکٹر ان نے بھی عمل احتساب اور عدلیہ مخالف قوتوں کو سخت الفاظ میں پیغام دیا کہ ان کے دن گئے جا چکے۔

اواخر مارچ میں قوم کو یہ خوش کن خبر ملی کہ وزیراعظم اور چیف جسٹس کی طویل ملاقات ہوئی۔ وزیراعظم نے یقین دلایا کہ عدلیہ کو تمام تر وسائل مہیا کیے جائیں تاکہ فوری انصاف عوام کی دلیلیز تک پہنچ سکے۔ چیف جسٹس نے بھی اعادہ کیا کہ احتساب کا عمل پوری قوت سے جاری رہے گا۔

ہماری تجویز ہے کہ احتساب کا عمل بھرپور اور کامل طور پر مکمل کرنے کے لیے تمام حکومتی ادارے مل جل کر کام کریں اور ایک دوسرے سے قریبی رابطہ رکھیں۔ یوں جس طرح سیکورٹی فورسز نے دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا، وہ بھی اپنے اندر پھیلی کرپشن، اقربا پروری، سرخ فیتہ اور شرم کی خرابیاں مٹا مٹ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔



حبیب مسیح بن مرینی
پڑھائیے، سیکھئے اور لطف اٹھائیے

کچھ اپنی زبان میں

شخاف انتخابات کا سہانا خواب..... پرامن انتقال اقتدار یقینی بنانا ہوگا

قومی سپینار

ریاستی اداروں کے مابین ہم آہنگی کا فروغ..... پانچا کے زیر اہتمام ایک فکر انگیز سپینار

دین دنیا

راز دار رسول..... فاتح ہمدان کہلانے والے عظیم صحابی کی ایمان افروز داستان

ایماندار تاجر..... کھوئی راہ روشن کر دینے والے سبق آموز اسلامی واقعات

اعلشافات

مبئی حملے بھارت نے کروائے..... اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تحقیق

بین الاقوامی معلومات

شاہ سے گداتک..... کوئی عہدہ نہ ہونے کے باوجود وہ لیپیدا کا دوسرا اثر ترین انسان تھا

فکاہی مزاح

پکاٹی گھی کھیر..... ایک نوجوان کے خوابوں کا محل جب دھڑام سے گر پڑا

حجامت قبل از گرفتاری..... کچھ مزاحیں ایسی بھی ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے

اللہ کے بعد اس سے ڈریئے..... جو لوگ اسے تعظیم نہ دیں، ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا

خصوصی تبصرہ

جو صورت نظر آئی..... خاکوں کی ایک دلنشین اور بامقصد کتاب

معاشرتی کردار/ خاکہ

الطاف حسن قریشی

الطاف حسن قریشی

أسامہ عبدالقادر

پروفیسر خالد پرویز

عاصم محمود

عافیہ مقبول جہانگیر

آمنہ اقبال

ڈاکٹر ایس ایم عین قریشی

سلمان بٹ

عاصم محمود



صادق بشیر

شہاد احمد دہلوی

انور مقصود

بیگم عامر ملک

حکیم سید مجاہد محمود برکاتی

رضیہ بٹ

ذکیہ علی بیگ

ڈاکٹر ہامیر

رانا محمد شاہد

محمد خلیل چودھری

شاکر لطیف

رافعہ عظیم

دانیہ صدیقی

ڈاکٹر خلیل مبین

دوست پلیمبر..... زندگی بھر مشکلات سے نبرد آزما رہنے والے مزدور کا قصہ

ادب کا چھلاوہ..... ممتاز مزاح نگاری دلچسپ و سبق آموز یادیں

مکلفہ

جالب بنام انور مقصود..... عالم بالا سے پاکستانی قوم کے نام چشم کشا خط

طب و صحت

میرے جوڑ..... قدرتی غذاؤں کے ذریعے موڈی بیماری سے نجات ممکن

ان گھٹانے کی قدرتی دوا..... انسان کو تندرست رکھنے والا ہرفن مولا مسالا

اردو ادب

البسوس منزل..... امریکا کی بلند وبالا عمارت میں جب دو پاکستانی پھنس گئے

روسیات

اٹالوی ہمارے بھائی ہیں..... ہم وطنوں اور اٹلی کے باسیوں میں حیرت انگیز مماثلت کا تذکرہ

میں میں دیسی کھانے..... ایک ممتاز اداکارہ نے جب کینیڈا میں دیسی کھانے کھائے

واو کی کاغان کا بلند ترین مقام جہاں آپ بار بار جانا چاہیں گے

ایات

انی دنیا کی ماہر تعمیرات..... اس ننھی مخلوق کی بنائی بستیاں اتفاق کی عمدہ مثال ہیں

انمانے/کہانیاں

نسل کو ایک قیمتی درس دیتی پرانے لوگوں کی دلنشین کھانا

گھر کون سا؟..... ایک سے دوسرے گھر سفر و سفر رہنے والی لڑکی کا جرا

پہنے کی چٹنی..... اولاد کے لیے خود کو سرتا پابند لینے والی ماں کا نعم البدل کوئی نہیں

اولاد کا قرض ہے کہ وہ والدین کے لیے ٹھنڈی چھاؤں بنیں

شفاف انتخابات کا سہانا خواب

موجودہ قومی اسمبلی کی آئینی مدت ۳۱ مئی ۲۰۱۸ء کو ختم ہو رہی ہے اور اس کے بعد نگران حکومت کا دور شروع ہوگا۔ یہ امر اٹنی کا باعث ہے کہ جمہوریت کا تسلسل قائم ہے اور پُر امن انتقال اقتدار کا مرحلہ قریب آن پہنچا ہے۔ اہم اداروں کی طرف سے یقین دہانی کروائی جا رہی ہے کہ بروقت اور شفاف انتخابات کے لیے فُل پروف اقدامات کیے جائیں گے اور جمہوری عمل میں کوئی رخسہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔ دستور کے مطابق آزادانہ دیانت دارانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کرانے کی ذمہ داری پاکستان الیکشن کمیشن پر عائد ہوتی ہے جو اب انتظامی اور مالی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہے اور وہ نودائے قواعد و ضوابط وضع کر سکتا ہے۔ ماضی میں فوج اور عدلیہ جمہوری عمل کو پٹری سے اتارنے کا باعث بنتی رہی ہیں، مگر اس بار ان کے سربراہوں کی طرف سے جو اعلانات آرہے ہیں، وہ بڑے حوصلہ افزا اور ايقان افروز ہیں۔ فاضل چیف جسٹس جناب میاں ثاقب نثار کا یہ ارشاد امیدوں کے چراغ روشن کر گیا ہے کہ ضرورت پڑنے پر بیورو کریٹس کے ہٹا دے بھی کر دیے جائیں گے کہ وہ انتخابات پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اسی طرح ہمارے سپہ سالار جنرل قمر جاوید باجوہ کی یہ تلقین دہانی مزوۃ بہار سے کسی طرح کم نہیں کہ انتخابات پوری طرح شفاف ہوں گے۔

ان بیانات سے عوام نے شفاف انتخابات کا سہانا خواب دیکھنا شروع کر دیا ہے، مگر ان کے ذہنوں میں بعض واقعات اور اقدامات سے دوسرے بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ مردم شماری بڑی تاخیر سے سپریم کورٹ کے حکم پر کروائی گئی اور ایک آئینی ترمیم کے ذریعے عبوری نتائج کی بنیاد پر حلقہ بندیوں کے لیے جواز پیدا کیا گیا۔ ان عبوری نتائج کے مطابق پنجاب کی نشستیں کم ہو گئیں جبکہ بلوچستان، خیبر پختونخواہ اور اسلام آباد کی نشستیں زیادہ ہو گئیں۔ ہمارے قابل قدر الیکشن کمیشن نے مردم شماری کے نتائج کے مطابق رد و بدل کرنے کے بجائے پورا نقشہ ہی تبدیل کر ڈالا۔ پہلے ملکی حلقہ بندی پشاور سے شروع ہوتی تھی جبکہ مجوزہ حلقہ بندیوں کا آغاز چترال اور اخٹام سبیلہ پر ہوا۔ اس کے نتیجے میں حلقہ بندیوں کی پوری بساط الٹ پلٹ ہو گئی۔ اخباری اطلاعات کی رُو سے خیبر پختونخواہ کے وزیر اعلیٰ جناب پرویز خٹک کا حلقہ سب سے چھوٹا اور بنوں کا حلقہ سب سے بڑا بن گیا ہے۔ تمام سیاسی جماعتیں شکوہ سنج ہیں کہ نئی حلقہ بندی انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتی اور اس سے گھبر مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اصل تشویش کی بات یہ ہے کہ پارلیمانی کمیٹی اور الیکشن کمیشن ایک دوسرے کے مد مقابل آن کھڑے ہوئے ہیں اور ایک بے یقینی کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ یہ مرحلہ اگر خوش اسلوبی اور دور بینی سے طے نہ کیا گیا تو انتخابات کی شفافیت پر حرف آنے کا جو بہت بڑے تنازع کو جنم دے سکتا ہے۔

میری نماز کا وقت ہو گیا..... اس سے پہلے کہ کوئی آپ کی نماز ادا کرے

حیدر انجم

اقبالیات

علامہ اقبال واقعات کے آئینے میں..... شاعر مشرق کی شخصیت عیاں کرتی تحریر

ڈاکٹر جاوید اقبال

شکارت

زخمی شیر کے تعاقب میں..... موت دے پاؤں آرہی تھی اور بندوق میں گولی ایک ہی باقی تھی

صبا عمران

غیر ملکی ادب

لپ گور..... مستقبل سنوارنے کا حسین سپنا بوڑھے کسان کی جان لے بیٹھا

عروج فاطمہ

چوتھی اولاد..... تنہائی اور بے رُخی کا شکار ایک بوڑھی خاتون کی دلدوز داستان

ڈاکٹر سیدہ سلمیٰ حسین

انوکھا جھانسا..... قانون کی نگاہوں میں دھول جھونکنے والے کانیاں کا ماجرا

انجم فاروق ساحلی

بارگزار..... ایک خوش مزاج خاتون کا قصہ جو اچانک غصیلی بن گئی تھی

ابوالفتح ہمایوں

لسانیات

رنگ رنگ کہاوتیں..... دلچسپ واقعات جنہوں نے کہا توں کو جنم دیا

پروفیسر سید حبیب ظفر انوار

غیر ملکی شخصیت

”اچھے دن کا اختتام“..... وہ گیت جس نے ایک مقررہ خاتون کو کروڑ پتی بنادیا

ذیل کاریگی

آپ بیتی

میرے بچپن کے دن..... معصومیت اور خوشیوں بھرے دنوں کی پُر لطف یادیں

تحسین گل

معاشرت

بیک فرائی ڈے..... معاشرے کے بدلتے رجحانات کی عکاسی کرتی تحریر

ہاجرہ رضا

مستقل سلسلے

شاعری..... ۱۷۰ تبصرہ کتب..... ۲۱۳ چمن خیال..... ۲۱۷



ریاستی اداروں کے مابین ہم آہنگی کا فروغ



پائس کے زیر اہتمام ایک کنگریسیمنار الطاف حسن قریشی کے قلم سے

پس منظر

۱۳ مئی ۲۰۱۳ء کے انتخابات ہماری تاریخ میں اس لحاظ سے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں کہ پہلی بار ایک سیاسی جماعت نے دوسری سیاسی جماعت کو پُر امن طریقے سے اقتدار منتقل کیا، لیکن ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ پاکستان تحریک انصاف کے چیئر مین عمران خان نے انتخابات میں منظم دھاندلی کا الزام لگایا، چار ماہ سے زائد دار الحکومت اسلام آباد کا گھیراؤ کیے رکھا جس کے سبب حکومتی مشینری مفلوج رہی۔ اس دوران تحریک انصاف کے صدر مخدوم جاوید ہاشمی نے اپنی قیادت سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے یہ الزام لگایا کہ وہ حکومت کے خاتمے کے لیے غیر سیاسی عناصر سے ساز باز کر رہی ہے۔ خوش قسمتی سے تمام سیاسی جماعتیں پارلیمنٹ کی پشت پر کھڑی رہیں۔ جوڈیشل کمیشن کی طرف سے بھی یہ فیصلہ آیا کہ تحقیقات میں کسی منظم دھاندلی کا ثبوت نہیں ملا۔ اس پر عمران خان کا ڈراما فلاپ ہو گیا، مگر سیاسی چپقلش جاری ہے جسے سوشل میڈیا آج بھی ہوادے رہا ہے۔

گہری تشویش کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے مابین بد اعتمادی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو زمین بوس کر دینے کے لیے جو حربے اور زبان استعمال کر رہی ہیں ان کی موجودگی میں نگران حکومتوں پر اتفاقی رائے بظاہر مشکل دکھائی دیتا ہے۔ اگر حکومت اور اپوزیشن نگران حکومتوں پر اتفاق کرنے میں ناکام رہتی ہیں، تو دونوں طرف سے تین تین نام الیکشن کمیشن کو بھیجنا ایک آئینی ذمہ داری ہوگی۔ بد اعتمادی کی اس زہرناک فضا میں سیاسی قائدین الیکشن کمیشن کا فیصلہ ماننے سے بھی انکار کر سکتے ہیں اور ایک تنازع کھڑا ہو سکتا ہے جسے حل کرنے کے لیے سپریم کورٹ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ ایک ایسے ماحول میں جب عدالت عظمیٰ کے فیصلے بھی شدید اختلاف کی زد میں آ رہے ہیں، تو نگران حکومت کے بارے میں جو فیصلہ سنایا جائے گا، اس پر بحث و تکرار شروع ہو سکتی ہے جبکہ انتخابی عمل دو ماہ کے اندر اندر مکمل کرنا ہوگا۔ سیاسی جماعتیں اگر بروقت انتخابات میں سنجیدہ ہیں، تو انہیں دانش مندی سے حقائق کا سامنا کرنا اور بنیادی معاملات میں اتفاق رائے پیدا کرنا ہوگا۔ اس عظیم کام کے لیے غیر معمولی تدبیر اور تحمل درکار ہوگا جو انہوں کی قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے حکمران جماعت کو آل پارٹیز کانفرنس کا اہتمام کرنا اور غیر معمولی بردباری کا ثبوت دینا ہوگا۔

بلوچستان اسمبلی میں پچھلے دنوں جو واقعات پیش آئے وہ سینیٹ کے انتخابات پر بھی اثر انداز ہوئے، انہوں نے عام انتخابات کے بارے میں طرح طرح کی ہدگمانیوں کو ہوا دی ہے۔ آنا نانا ایک وزیر اعلیٰ تبدیل کر دیا گیا اور سیاسی طور پر ایک غیر معروف شخص سینیٹ کا چیئر مین منتخب کر لیا گیا جسے قائم مقام صدر مملکت کے فرائض بھی سنبھالنا ہوتے ہیں۔ ان واقعات نے اس تاثر کو گہرا کیا کہ غیر سیاسی طاقتیں پس پردہ متحرک ہیں جو اپنی پسند کے مطابق واقعات کی تشکیل چاہتی ہیں۔ احتساب کے نام پر انتخابات سے چند ماہ پہلے سیاسی شخصیتوں کی جو اکھاڑ بچھاڑ کی جا رہی ہے، اس نے شفاف انتخابات پر بڑے بڑے سوال کھڑے کر دیے ہیں۔ سیاسی تجزیہ نگار برملا کہہ رہے ہیں کہ جو سیاسی جماعت عوام کے اندر مقبول ہے، اسے شکست سے دوچار کرنے کے انظمامات کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف ووٹ کے تقدس کی تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے اور دوسری طرف سیاست دانوں کی کردار کشی زوروں پر ہے۔ ان حالات میں شفاف اور بروقت انتخابات کا انعقاد جو کبھی ایک سہانا خواب لگتا تھا، اب ایک ڈراؤنے خواب کی شکل اختیار کرنا جا رہا ہے۔ ہماری قومی قیادت پر لازم آتا ہے کہ وہ خطرے کی گنگنی محسوس کرتے ہوئے بالغ نظری اور خود اعتمادی سے کام لے اور پُر امن انتقال اقتدار کو یقینی بنانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ ہم تاریخ کے ایک نازک دوراے پر کھڑے ہیں۔ صحیح قدم اٹھا کر جمہوری اداروں کو ایک ناقابل تسخیر طاقت میں تبدیل کر سکتے اور ان کی تنگ نائے میں محصور ہو کر پاکستان کو نہایت کڑی آزمائش سے دوچار کر سکتے ہیں۔

الطاف حسن قریشی

۲۰۱۶ء میں عالمی سطح پر پانامہ آف شور کمپنیوں کا غلغلہ بلند ہوا جس میں سینکڑوں پاکستانیوں کے نام سامنے آئے۔ غلطی سے فہرست میں نواز شریف کا نام بھی شامل تھا جس پر رپورٹ کے مرتبین نے معافی مانگی، لیکن عمران خان اور ان کے سیاسی ہم نواؤں نے عدالت عظمیٰ میں وزیراعظم کو نااہل قرار دینے کے لیے رٹ دائر کر دی۔ فاضل رجسٹرار نے اسے 'فضول' قرار دے کر واپس کر دیا۔ اس پر خان صاحب نے ۲ نومبر ۲۰۱۶ء سے اسلام آباد لاک ڈاؤن کرنے کا اعلان کر دیا۔ پاکستان کو خوفناک بحران سے بچانے کے لیے فاضل چیف جسٹس انور ظہیر جمالی نے رٹ کی سماعت کے لیے یکم نومبر ۲۰۱۶ء کی تاریخ مقرر کر دی۔ ابتدائی سماعت میں انہوں نے عندیہ دیا کہ معاملہ لندن کے فلیٹس تک محدود رہے گا۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد معاملات پھیلنے لگے اور معروف طریقے سے ہٹ کر جے آئی ٹی کی تشکیل ہوئی جس میں فوج کی خفیہ ایجنسیوں کے نمائندے بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ اس پر قانونی اور سیاسی حلقوں کی طرف سے شکوک و شبہات کا اظہار ہونے لگا اور جب عدالتی فیصلہ پانامہ کے بجائے اقامہ کی بنیاد پر سنایا گیا، تو پاکستان کے اندر شدید رد عمل دیکھنے میں آیا۔ عالمی جراند نے بھی اس فیصلے کو متنازع قرار دیا۔ نواز شریف نااہل قرار دیے جانے پر منصب سے علیحدہ تو ہو گئے، مگر عوام کے اندر ووٹ کے تقدس کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے اور ان کا بیانیہ مقبول ہوتا گیا۔ عدالت عظمیٰ نے ایک اور فیصلے کے ذریعے انہیں پارٹی کی صدارت کے لیے بھی نااہل قرار دے دیا اور سیاست دانوں کے لیے نامناسب 'القاب'



بھی استعمال کیے۔ اس کے علاوہ فاضل چیف جسٹس میاں ثاقب نثار اہم عہدوں پر تقرریوں کی باز پرس بھی کرنے لگے اور بعض اصحاب فارغ بھی کر دیے گئے۔ انھوں نے ہسپتالوں کا معائنہ بھی شروع کر دیا، میڈیکل کالجوں کی ہوش ربا فیسوں کے معاملات بھی اٹھائے اور صاف پانی کا بنیادی مسئلہ بھی اٹھایا۔ اس پر معتدل مزاج وزیراعظم شاہد خاقان عباسی نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انتظامیہ مفلوج کی جا رہی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ آئندہ پارلیمنٹ کو قانون سازی سے پہلے کسی دوسرے ادارے سے اجازت لینا ہوگی۔ سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے تحت عین اس وقت جب سینیٹ کے انتخابات ہونے والے تھے، نواز شریف کے نامزد کردہ امیدوار کا عدم قرار دے دیے گئے جس سے یہ تاثر قائم ہوا کہ مسلم لیگ نون کو سینیٹ کے انتخابات سے باہر رکھنے کا پروگرام طے پا چکا ہے۔ اس سے قبل بلوچستان میں اچانک مسلم لیگ نون کی حکومت ختم کر دی گئی۔ ان واقعات سے اداروں کے مابین شدید محاذ آرائی کا تاثر گہرا ہوا۔

سیمینار کی روداد

اس بڑھتی ہوئی بحرانی کیفیت میں پاناما کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی میں سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف ماہر قانون اور سیاسی دانش ور جناب ایس ایم ظفر نے فرمائی۔ یونیورسٹی کے اساتذہ، بلند قامت تجزیہ نگاروں، سول سوسائٹی کے دانش مند نمائندوں اور سیاسی جماعتوں سے وابستہ شخصیتوں نے آزادانہ اظہار خیال کیا۔ ہمارے نامور اہل دانش جناب سجاد میر نے نظامت کے فرائض ادا کیے۔ پاناما کے مرکزی سیکرٹری جناب کامران الطاف نے قرآنی آیات کی تلاوت کی۔

الطاف حسن قریشی، سیکرٹری جنرل پاناما

قریشی صاحب نے صورت حال کی سنگینی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری تاریخ میں جب کبھی ریاستی اداروں میں محاذ آرائی نے زور پکڑا، پوری قوم کو ہولناک نتائج برداشت کرنا پڑے۔ اس پس منظر میں ہم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہر قیمت پر تصادم کا ماحول جلد سے جلد ختم کیا جائے۔ انتہائی تکلیف



وہ بات یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف جو زبان استعمال کی جا رہی ہے، اس میں غصے، تضحیک اور اشتعال انگیزی کے پہلو غالب آتے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں مناسب ہو گا کہ سیاسی جماعتیں فوج اور عدلیہ کے ذریعے اقتدار میں آنے کی خواہش رکھنے اور اپنے تنازعات عدالتوں میں لے جانے سے مکمل طور پر اجتناب کریں۔ انھوں نے تجویز دی کہ پندرہ بیس قد آور شخصیتوں پر مشتمل ایک کونسل آف ایڈلرز (بزرگوں کی کونسل) تشکیل دی جائے جو اداروں کے اہم افراد سے ملاقات کر کے سیاسی درجہ حرارت کم کرنے کے ساتھ



الطاف حسن قریشی

ساتھ گریڈ نیشنل ڈائلاگ کے لیے راہ ہموار کرے۔ ایک میثاقی مفاہمت پر دستخط کیے جائیں کہ ہر قیمت پر دستور اور قانون کی پاسداری کی جائے گی اور عدالتی فیصلوں میں تمام قانونی ضابطوں کا پورا پورا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ دوران سماعت عزت نفس کو ٹھیس پہنچانے والے ریمارکس سے مکمل اجتناب کیا جائے گا۔ عدالت عظمیٰ تنازعات حل کرنے کا ایک نہایت مقتدر ادارہ ہے جس کا احترام ہم سب پر واجب ہے۔ فوج بھی ہمارا نہایت قابل فخر ادارہ ہے اور پارلیمان عوامی امنگوں کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے ایک بالادست قوت ہے۔ سیاست دانوں کو بھی اپنے رویوں میں تبدیلی لانا ہوگی اور اپنی جماعتوں میں جمہوری ثقافت کو فروغ دینا ہوگا۔

قریشی صاحب نے کہا کہ میں اس نشست میں بوجھل دل سے آیا ہوں کہ ہمارے ادارے اور ہماری سیاسی جماعتیں آپس میں دست و گریباں رہنے سے ریاست کو ضعف پہنچا رہے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کی دشمن طاقتیں ہمارے گرد گھیرائیگ کرتی جا رہی ہیں۔ عدلیہ، فوج اور سیاسی حکمرانوں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، اس لیے ہمیں اسے کریدنے کے بجائے ایسے اقدامات کی نشان دہی کرنی چاہیے جو غیر یقینی صورت حال کے خاتمے اور اداروں کے مابین ہم آہنگی کی نشوونما میں مددگار ثابت ہوں۔ نفرت کی آگ میں قومیں بھسم ہو جاتی ہیں جبکہ باہمی احترام اور مکالمے سے اختلافات کے پہاڑ بھی مسخر کیے جاسکتے ہیں۔ پانٹا کے اوّلین مقاصد میں ایک مہذب، روادار اور ہم آہنگ معاشرے کی تعمیر شامل ہے۔ میں پوری توقع رکھتا ہوں کہ آپ کی تجاویز اور سفارشات اداروں میں بڑھتی ہوئی

آویزش کی تحلیل اور اعتماد کے رشتے مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کریں گی۔ پاکستان کی ریاست صاحب میں گھری ہوئی ہے جو اس بات کی متقاضی ہے کہ تمام ادارے اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ فرائض منصبی ادا کریں۔ اس مقصد کے لیے قد آور شخصیتوں پر مشتمل کونسل کا قیام ایک مفید قدم ثابت ہوگا۔



پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد خان

پنجاب یونیورسٹی، شعبہ سیاسیات کے سابق چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد خان کا تاثر یہ تھا کہ بظاہر حالات پریشان کن ہیں، مگر میں ان سے ہرگز مایوس نہیں، کیونکہ ہم ارتقا کے مراحل سے گزر رہے ہیں جو ہمیں بہتری کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں بھی چیف جسٹس محمد منیر کے فیصلے سے ایک ہولناک آئینی اور قانونی بحران پیدا ہوا تھا

اور سینکڑوں قانون منسوخ ہو جانے سے افراتفری پھیل گئی تھی، لیکن ہم اس ناگفتہ بہ صورت حال سے باہر نکل آنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس میں بھی وفاقی عدالت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ حکومت نے وفاقی عدالت میں ریفرنس بھیجا کہ اس بحران سے نکلنے کا راستہ کیا ہے۔ اس نے فیصلہ دیا کہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی تشکیل دی جائے جو منسوخ شدہ قوانین کو بحال کرنے کی مجاز ہوگی اور دستور بھی منظور کرے گی، چنانچہ گورنر جنرل کی منشا کے خلاف ایک دستور ساز اسمبلی صوبائی اسمبلیوں نے منتخب کی اور بحران تحلیل ہوتا گیا۔ آج بھی عدالت عظمیٰ کو تدبیر، تحمل اور فراخ دلی سے کام لینا ہوگا اور ہمیں پوری توقع ہے کہ وقتی آزمائشوں پر قابو پا لیا جائے گا۔ جناب نواز شریف یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ قوم کو اس امر کا حتمی فیصلہ کرنا ہوگا کہ حکمرانی کا حق عوام کو حاصل ہے یا چند جرنیلوں اور جج صاحبان کو۔ یہ کلیدی بیانیہ قرارداد مقاصد میں طے ہو چکا ہے کہ ریاست کے اختیارات (State Authority) استعمال کرنے کے مجاز صرف عوام کے منتخب نمائندے ہیں۔ نواز شریف کی سوچ کا دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ہمارے پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات بہتر ہونے چاہئیں تاکہ ہمارا خطہ معاشی طور پر ترقی کرے اور عوام کا معیار زندگی بلند ہو۔ وہ مذاکرات کے ذریعے تنازعات حل کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نظریات پر قوم کو سنجیدگی سے غور



پروفیسر شبیر احمد خاں

پنجاب یونیورسٹی شعبہ سیاسیات کے استاد پروفیسر شبیر احمد خاں نے انکشاف کیا کہ ۲۵ فروری ۲۰۱۶ء کی صبح نیویارک ٹائمز میں خبر شائع ہوئی کہ جسٹس کلیرنس تھامس نے دس سال میں پہلی بار زبان کھولی ہے۔ دراصل جج صاحبان خود نہیں بولتے، ان کے فیصلے بولتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں عدالتوں میں تقریریں ہوتی ہیں اور طرح طرح کے ریمارکس دیے جاتے ہیں جن سے بدگمانیاں پھیلتی ہیں۔ پارلیمان ہی بالادست ادارہ ہے جس کا احترام سب پر لازم ہے۔ وہ

اس نکتے پر زور دے رہے تھے کہ بلاشبہ اداروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مگر ان کی تشکیل، استحکام اور اعلیٰ کارکردگی میں اصل کردار افراد ادا کرتے ہیں۔ ان کی اہمیت کو تسلیم کیے بغیر اداروں میں روح نہیں پھونکی جاسکتی۔ پاکستان کو اس وقت داخلی اور خارجی چیلنجوں کا سامنا ہے۔ امریکہ اور اس کے حواری ہمارے لیے مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ پیرس میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ایک انتہائی تکلیف دہ صورت حال کی غمازی کرتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے ریاستی اداروں پر لازم آتا ہے کہ وہ آئینی حدود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور دشمن کی سازش کو پھینکے کا کوئی موقع نہ دیں۔ ہماری عدالتوں کو بھی بڑے بڑے مسائل درپیش ہیں۔ زیر التوا مقدمات کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ عدالت عظمیٰ کو اس اہم چیلنج پر غیر معمولی توجہ دینا ہوگی۔ اسی طرح ہماری فوج دہشت گردی پر قابو پانے کے لیے بے مثال قربانیاں دے رہی ہے۔ عوام ان کی پشت پر کھڑے ہیں۔ ان اداروں کو بھی اپنی آئینی حدود میں رہنا اور ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔

جناب رؤف طاہر

سیاسی تجزیہ نگار رؤف طاہر نے جناب ایاز میر کے کالم کا حوالہ دیا کہ عدلیہ کے پیچھے فوج کھڑی ہے۔ ہمارے چیف جسٹس جو ڈیڑھ لاکھ دھلا کے سپہ سالار ہیں اور وہ میرے بھی سپہ سالار ہیں، ہم ان سے پوری توقع رکھتے ہیں کہ وہ فیصلوں میں تاخیر کے خلاف جہاد کریں گے



کرنا اور روشن مستقبل کے لیے ایک لانچ عمل ترتیب دینا ہوگا۔ ہمارے اداروں میں جس قدر ہم آہنگی ہوگی، ہم اسی قدر اعتماد کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھتے جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ تمام اسٹیک ہولڈرز جلدی اس حقیقت کا ادراک اور شعور حاصل کر لیں گے۔

جناب احسان وانیکس



اے این پی کے مرکزی راہنما اور قانون دان جناب احسان وانیکس نے پروفیسر صاحب کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۵۳ء میں جو حادثہ پیش آیا تھا، اس کی قوم کو بڑی قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ اسی حادثے کے بعد مارشل لا نازل ہوئے اور ملک دولخت ہو گیا۔ اس اندوہناک تجربے کی روشنی میں ہماری عدلیہ کو غیر معمولی طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بیشتر قانون دانوں کی نظر میں باقاعدہ

ٹرائل کے بغیر وزیراعظم کو نااہل قرار دینا، عوام کے مقدس ووٹ کی توہین کے مترادف ہے۔ اسی طرح دستور کے دفاع اور تحفظ کا حلف اٹھانا اور دستور توڑنے والوں کو آئینی جواز فراہم کرنا، ایک ایسی غلط روایت ہے جس نے جمہوریت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہمارے ہاں چند جج صاحبان مسائل پیدا کرتے آئے ہیں۔ ریاست کی مضبوطی کے لیے یہ روش تبدیل کرنا ہوگی اور قرارداد مقاصد میں جو اصول طے پا گیا ہے کہ سیاست کی اتھارٹی استعمال کرنے کا حق صرف عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہے، اس پر سختی طور پر کاربند رہنا ہوگا۔ سیاسی جماعتیں عوام کے اندر سیاسی شعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں منظم کرتی ہیں۔ ایک سیاسی جماعت ہی نے پاکستان کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا اور بیشتر پارٹیوں نے جمہوریت کے لیے بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔ انھیں ہر وقت ملامت کرتے رہنا جمہوری عمل کو سبوتاژ کرنا ہے۔ ہم سب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ عدالت عظمیٰ تنازعات طے کرانے کا سب سے مؤثر ادارہ ہے، اس لیے ہم اس کا بے حد احترام کرتے ہیں، مگر اس نے ازخود نوٹس کا دائرہ بہت وسیع کر لیا ہے جس میں اپیل کا حق ہی نہیں۔ یہ امر انسانی بنیادی حقوق کے منافی ہے۔ پارلیمنٹ ایک بالادست ادارہ ہے جو عوام کی حاکمیت کے اصول پر قائم ہے۔ وہ وزیراعظم کا انتخاب کرتا ہے جس کا احترام تمام اداروں پر لازم ہے۔

رکھنا ہوگا کہ اس کی عزت اس کے غیر جانب دارانہ فیصلوں ہی سے قائم رہ سکتی ہے۔ عوام کے ووٹ کے احترام ہی سے جمہوری معاشرہ ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔



ڈاکٹر حسین احمد پراچہ

معروف کالم نگار ڈاکٹر حسین احمد پراچہ کا چچا ٹٹلا بیان تھا کہ تاریخ میں پہلی بار حکمرانوں کا احتساب ہو رہا ہے جس کا سول سوسائٹی کو ساتھ دینا چاہیے۔ بعض لوگ واویلا کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ عدالتوں میں تو بین آئیز سلوک ہو رہا ہے، انھیں کچھ معلوم نہیں کہ شہریوں کے ساتھ دفتروں، کچہریوں اور عدالتوں میں کس قدر ذلت آمیز رویہ

اختیار کیا جاتا ہے۔ عدالتوں کے خلاف نفرت پھیلانا ملکی مفاد کے خلاف ہے۔ سابق وزیر اعظم کی صاحبزادی فرماتی ہیں کہ People, not courts, pass verdict یعنی عدالتوں کے بجائے عوام فیصلے کرتے ہیں۔ ہم اس سے نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ ہر آئین کا ایک بنیادی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ ہمارے آئین کا بنیادی ڈھانچہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی کی جاسکتی ہے نہ بنیادی انسانی حقوق سے انحراف کی گنجائش ہے۔ ہمیں قانون کی بالادستی کا ساتھ دینا اور معاشرے میں توازن قائم رکھنا ہوگا۔ ہماری اسلامی تاریخ میں احتساب کی نہایت روشن مثالیں موجود ہیں جن کے مطابق حکمرانوں کو مواخذے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے میڈیا کو بھی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ بعض ٹی وی چینلز ایک ہیجان انگیز ماحول پیدا کرنے اور اداروں کے درمیان محاذ آرائی کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ ہم عدالتی فیصلوں کے سقم پر کوئی بات کر سکتے ہیں، مگر جج صاحبان کو ہدف تنقید نہیں بنا سکتے۔ ہمیں برداشت، رواداری اور بردباری کا کلچر اختیار کرنا ہوگا۔

محترمہ بشری رحمن

ہماری قابل قدر ادیب محترمہ بشری رحمن جو پنجاب اسمبلی اور قومی اسمبلی میں نمائندگی کا تجربہ رکھتی ہیں، انھوں نے مشورہ دیا کہ غیر جانب دار اہل قلم اور اہل دانش یکجا بیٹھ کر ایک ایسا لائحہ عمل ترتیب دیں جس



اور قانون اور آئین کے جملہ تقاضوں کا خیال رکھیں گے۔ اسی طرح ملکی سیکورٹی کی حدود بھی پوری واضح ہونی چاہئیں۔ آج سے چالیس برس پہلے ہمیں قومی سیکورٹی کے اداروں نے بتایا تھا کہ افغانستان سے روس کی بے دخلی ملکی سلامتی کے لیے حدود درجہ ناگزیر ہے۔ اب کہا جا رہا ہے کہ ہم نے چالیس برس پہلے جو بویا تھا، اسی کی فصل کاٹ رہے ہیں۔ اس طرح کی تقریروں سے میں کفیوز ہو رہا ہوں۔ بیانات دینے سے پہلے ہمارے سیاسی اور عسکری قائدین کو تاریخ سے اپنا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا۔ ہمارا سیاسی، قانونی اور آئینی نظام اداروں کے ستونوں پر قائم ہے اور انھیں مضبوط، ہم آہنگ اور ہم قدم ہونا چاہیے۔ نواز شریف صاحب کو ٹرائل کے بغیر نااہل قرار دینے سے بہت سارے سوالات اور تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کو دوراندیشی اور اعلیٰ ظرفی سے حل کیا جاسکتا ہے۔ نواز شریف کا بیانیہ عوام کے اندر مقبول ہو رہا ہے اور ایک نئی صورت حال جنم لے رہی ہے۔ اسے تاریخ کے تناظر میں سمجھنا اور عوام کے جذبات کا احترام کرنے سے ریاست مضبوط ہوگی۔

جناب وجاہت مسعود



معروف دانش ور جناب وجاہت مسعود کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ انھیں اپنے آزاد وطن میں فیصلہ سازی میں اپنا کردار ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کا احساس تھا کہ مئی ۲۰۱۳ء میں عوام نے جو فیصلہ دیا، بعض طاقتوں نے اسے قبول نہیں کیا اور محاذ آرائی کے یہ سارے مظاہر اسی کے شاخسانے ہیں۔ میں نواز شریف کا ووٹر نہیں اور نہ ہو سکتا ہوں، لیکن اس اصول پر یقین رکھتا ہوں کہ عوام جیسے اپنا وزیر اعظم بنائیں، اس کا ہر ادارہ احترام کرے اور جمہوریت کا تسلسل

قائم رکھے۔ جمہوریت ایک ایسا سیاسی بندوبست ہے جس میں اختلاف رائے کی بڑی اہمیت ہے کہ اس سے مکالمے کا عمل جاری رہتا ہے۔ آزادی اظہار بہت بڑی نعمت ہے جس کی ضمانت ہمارے دستور میں دی گئی ہے۔ ہم یہاں بیٹھ کر جو گفتگو کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کی بات بڑے تحمل سے سن رہے ہیں، اس سے ذہن چلا پاتا ہے اور جمہوری ثقافت کو فروغ ملتا ہے۔ میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنی عدلیہ کے کردار سے مطمئن نہیں۔ اسے ہر مرحلے میں غیر جانب داری سے فیصلے کرنا اور اس بات کا خیال



جناب محمد مہدی

مسلم لیگ نون کے میڈیا کوآرڈینیٹر جناب محمد مہدی نے میثاق جمہوریت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہماری سیاسی جماعتوں کو کسی غیر آئینی اور غیر سیاسی اقدام کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ سینئر صحافیوں پر مشتمل ایک ٹیم ترتیب دی جائے جو اداروں کے سربراہوں سے مشاورت کے بعد باہمی احترام کو فروغ دینے کی تدابیر کو عملی جامہ پہنانے میں مددگار ثابت ہو۔ ایک بات جو ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے وہ یہ کہ سیاسی مقدمات ایک خاص قسم کے جج

صاحبان سنتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے مقدمات کی سماعت ماضی میں خاص مزاج کے حامل جج صاحبان کیا کرتے تھے۔ پوری قوم پر عدلیہ کا احترام واجب ہے کہ وہ تنازعات حل کرنے کا سب سے معتبر ادارہ ہے۔ عدلیہ کو بھی قانونی تقاضوں اور اعلیٰ روایات کا پابند رہنا چاہیے۔ ہماری ریاست کو بڑے بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے جو قومی اداروں میں باہمی احترام اور ہم آہنگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ پیرس میں ہماری کارکردگی بڑی مایوس کن رہی۔ ایک طرف بھارت ننگی دھمکیاں دے رہا ہے اور دوسری طرف امریکہ افغانستان میں اپنی ناکامی کا انتقام پاکستان سے لینا چاہتا ہے۔ ان حالات میں ریاستی اداروں کو داخلی استحکام اور علاقائی امن کے قیام کی فکر ہونی چاہیے۔ سیاسی، عسکری اور عدالتی قیادتوں پر لازم آتا ہے کہ وہ عوام کے اندر یک جہتی کو فروغ دیں اور تنازعات کو ہوا دینے سے مکمل طور پر اجتناب کریں۔ ہمارے میڈیا پر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تشخ کی کیفیت پیدا کرنے کے بجائے قومی شعور اور بقاءے باہمی کے جذبوں کی آبیاری میں حیات افروز کردار ادا کرے۔

جناب عارف میاں

صحافت سے وابستہ جناب عارف میاں نے اپنی گفتگو کا آغاز ۱۹۵۳ء کے حادثے سے کیا جب گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی تحلیل کی تھی۔ سندھ چیف کورٹ کے چیف جسٹس کی سربراہی میں فل پنچ نے اس اقدام کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے دستور ساز اسمبلی بحال کر دی تھی۔ ہمیں ان جج صاحبان کی عظمت کو سلام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نام تمام عدالتوں اور بار کونسلوں میں آویزاں کرنے

سے عوام کی بہتری کے راستے کشادہ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تمام ادارے اپنے احترام اور وقار سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب عدالتوں پر بھی اعتبار کم ہو گیا ہے جبکہ عوام اپنے لیڈروں پر اعتماد نہیں کر رہے، کیونکہ وہ فرعون بن گئے ہیں۔ انھوں نے عوام کو دیا ہی کیا ہے؟ ان کا استحصال کیا ہے اور اپنے مفادات کو ترجیح دی ہے۔ دستور کو قومی زندگی میں نصاب کی حیثیت حاصل ہے اور ہم اسی سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ مجھے اس بات پر بہت دکھ محسوس ہوا جب پارلیمنٹ سے اٹھا رہیں ترمیم منظور ہوئی جس سے وفاق کو بہت ضعف پہنچا ہے۔ ہمیں ماضی میں رہنے کے بجائے قریشی صاحب کی اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ محاذ آرائی ختم کرنے کے لیے تجاویز دی جائیں۔ میری تجویز ہے کہ اہل قلم اور اہل دانش میں سے غیر جانب دار شخصیتوں کا انتخاب کر کے انھیں ایک قابل عمل لائحہ عمل ترتیب دینے کا مشن سونپا جائے۔ مجھے امید ہے کہ مشاورت کے ذریعے ایک روڈ میپ تیار ہو جائے گا جو ریاستی اداروں کے مابین ہم آہنگی کو پروان چڑھائے گا اور میڈیا کے ذریعے بے یقینی کی فضا تحلیل کی جاسکے گی۔

ڈاکٹر امجد عباس لکسی

پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر امجد عباس لکسی اس نقطہ نظر کے علم بردار تھے کہ پارلیمنٹ ایک بالادست ادارہ ہے اور اس میں تمام تنازعات کا حل کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، مگر سیاست دان اسے ایک بالادست قوت بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے پر وار کرنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے بجائے ہر سطح پر اپنے آپ کو منظم کرتے ہوئے کارکنوں کو فیصلوں میں شامل کرنا ہوگا۔ سیاسی تنازعات پارلیمنٹ میں طے کیے جاسکتے ہیں، اس



لیے انھیں عدالتوں میں لے جانے سے پوری طرح اجتناب کیا جائے۔ تمام ادارے آئینی حدود میں اپنے فرائض منصبی بحال کرتے رہیں، تو تصادم پیدا نہیں ہوگا۔ دکھ یہ ہے کہ اختلاف کی زبان میں شائستگی کے بجائے گراوٹ اور دشنام طرازی در آئی ہے جو قوم کے مزاج پر اثر انداز ہونے کے علاوہ کشیدگی کو تقویت پہنچانے کا باعث بن رہی ہے۔ گریڈ نیشنل ڈائلاگ کا اہتمام وقت کی سب سے بڑی ضرورت محسوس ہوتا ہے۔

چاہئیں۔ انھوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر کی سربراہی میں بیج نے جو فیصلہ دیا اور اس میں گورنر جنرل کے اقدام کو آئینی جواز فراہم کیا گیا۔ اس فیصلے کے خلاف سیاسی جماعتوں اور وکلاء برادری نے کوئی مزاحمتی مہم نہیں چلائی۔ اگر اس وقت عوامی طاقت کا مظاہرہ ہوتا، تو عدالتوں کو ماورائے آئین اقدامات کو قانونی جواز فراہم کرنے کا ہرگز حوصلہ نہ ہوتا۔ دراصل عوامی شعور اور عوامی طاقت اداروں کو راہ راست پر رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا مجھے یقین ہے کہ ہمارے ادارے تاریخ سے سبق سیکھتے ہوئے محاذ آرائی کی روش ترک کر دیں گے اور اپنی آئینی حدود میں رہنے کو ترجیح دیں گے۔



جسٹس (ر) جناب فقیر محمد کھوکھر

سابق جسٹس جناب فقیر محمد کھوکھر نے وضاحت سے بتایا کہ آئین میں صوبوں اور اداروں کے مابین تنازعات حل کرنے کے ادارے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر قومی مشترکہ مفادات کونسل میں صوبے مرکز سے اپنے تنازعات طے کر سکتے ہیں۔ اسی طرح قومی اقتصادی کونسل میں تعاون سے ہدف حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ کابینہ سیکورٹی کمیٹی بھی ایک ایسا ادارہ ہے جس میں سیاسی اور عسکری قائدین کے مابین پیدا ہونے والے کشکوک و شبہات پر بامقصد گفتگو ہو سکتی ہے۔ سینیٹ چیئرمین میاں رضا ربانی نے فوج اور

عدلیہ کے ساتھ ڈائلاگ کا سلسلہ شروع کیا تھا جسے ایک اچھی روایت کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ میثاق جمہوریت میں سیاسی قائدین نے ایک شق رکھی تھی کہ پی سی او پر حلف اٹھانے والا جج چیف جسٹس مقرر نہیں کیا جائے گا، مگر اس پر عمل نہیں ہوا اور جسٹس افتخار محمد چودھری، جنہوں نے دو بار پی سی او پر حلف اٹھایا تھا، چیف جسٹس کے منصب پر فائز رہے۔ دراصل اداروں کے مابین کشمکش کا آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا تھا جب گورنر جنرل ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی تھی اور جسٹس محمد منیر نے ٹیکنیکل گراؤنڈ پر گورنر جنرل کے



اقدام کو آئینی جواز فراہم کیا تھا۔ اس زمانے میں جو کابینہ تشکیل دی گئی، اس میں کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خاں وزیر دفاع بنادیے گئے۔ انھیں سیاست دانوں کے حالات قریب سے دیکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس وقت سے اداروں کے مابین عدم توازن اور اعتماد کا فقدان دیکھنے میں آ رہا ہے۔ بیشتر ماہرین قانون کی نظر میں عدالت عظمیٰ کے بعض جج صاحبان اپنی آئینی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پارلیمان اور عدلیہ ایک دوسرے کے مد مقابل آن کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک تشویش ناک صورت حال ہے جس پر دانش مندانہ کوششوں کو بروئے کار لانے کی اشد ضرورت ہے۔

جناب جاوید نواز



سول سوسائٹی کے نمائندے جناب جاوید نواز نے نیشنل ڈائلاگ پر زور دیا۔ حیرت یہ کہ عدلیہ نے فیصلے دینے کے ساتھ ساتھ تحقیقات کا بار بھی خود اٹھالیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی تعداد کم کرنے کے لیے ترکی کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے کہ پانچ فی صد سے کم ووٹ لینے والی جماعتیں نمائندگی سے محروم ہو جاتی ہیں، سینیٹ کے انتخابات براہ راست ہونے چاہئیں اور محاذ آرائی پر قابو پانے کے لیے سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ تمام اداروں

کو اخلاقی اور آئینی حدود میں رہنا ہوگا۔ انھوں نے مزید مشورہ دیا کہ ہر نوع کے صوابدیدی اختیارات ختم کر دیے جائیں اور قانون کے سامنے تمام شہری برابر ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ الطاف حسن قریشی صاحب کی تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے جلد کونسل آف ایڈمنسٹریٹو تشکیل دی جائے کہ حالات میں بہتری لانے کا وقت کم رہ گیا ہے جبکہ محاذ آرائی میں شدت آتی جا رہی ہے۔ حالات کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اختلاف کا اظہار آئینی حدود میں کیا جائے اور کسی میں عقل کل بن جانے کا خط پید نہ ہونے دیا جائے۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر بلند قامت اور غیر جانب دار شخصیتوں کی تلاش کا کٹھن کام فوری طور پر شروع کر دینا چاہیے۔

جناب ایس ایم ظفر

صدر مجلس جناب ایس ایم ظفر نے پوری بحث سمیٹتے ہوئے کہا کہ تمام مقررین محاذ آرائی اور تصادم ختم

”آپ کی زکوٰۃ نے بدل دیا مقدر“

کاروان علم فاؤنڈیشن کے مالی تعاون سے کم وسیلہ یتیم اور معذور مگر باصلاحیت طلباء و طالبات اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اپنے خاندان کا سہارا بن رہے ہیں اور قومی ترقی کے دھارے میں شامل ہو رہے ہیں

5,786 طلباء و طالبات کو -/139,683,855 روپے کے وظائف جاری کئے جا چکے ہیں

355

تاجنا، پولیو زدہ اور حادثے کی وجہ سے معذور طلباء کو مالی اعانت فراہم کی گئی۔

986

یتیم طلباء و طالبات کو پیشہ وارانہ اعلیٰ تعلیم کے لئے مالی اعانت فراہم کی گئی۔

سکارشپ حاصل کرنے والے طلباء و طالبات کی تعداد اور شعبہ جات

ایم بی بی ایس	1377	ایم اے	140	بی کام آئرز	161	ایم ایس بی	15	ایف ایس سی	529
بی ڈی ایس	52	ایم کام	41	بی ایس آئرز	777	بی اے آئرز	48	ایف اے	95
فریوٹرانی	49	ایم بی اے	58	بی بی اے	64	بی اے	74	بی کام	56
ڈی وی ایم	123	ایم بی اے	05	ایس سی اے	19	سی ایس ایس	01	ڈی کام	05
ڈی فارسی	108	ایم فل	20	سی اے	04	بی ٹیک	24	آئی بی ایس	17
ایم ایس سی	144	بی ایس بی ایچ	1443	ایم ایس بی ایچ	42	ایم ایس بی ایچ	164	میٹرک	131

زیر کفالت اور زیر غور طلباء کی مالی اعانت کے لئے 3 کروڑ روپے درکار ہیں

زکوٰۃ و عطیات دیجئے علم و ہنر سے آراستہ روشن اور باوقار پاکستان کے لئے!

کاروان علم فاؤنڈیشن

کمرے عیادت کی وصولی کے لئے روپہ
لاہور: مہدی رضا
0305-4133173
اسلام آباد: محمد اظہار چوہدری
0321-5587250

میزان بینک سمن آباد، لاہور پاکستان
0240 0100882859 اکاؤنٹ نمبر
بنک آف پنجاب سمن آباد، لاہور پاکستان
0110 002 000424 0003 اکاؤنٹ نمبر
بنک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان
0247 002 000827 0003 اکاؤنٹ نمبر

Meezan Bank
The Bank of Punjab
BOP
THE BANK OF PUNJAB

معلومات و رہنمائی کے لئے رابطہ کیجئے

67- کشمیر بلاک حفیظ تائب روڈ نزد جیم سٹور علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔

فون: 0321-8461122, 0345-8461122, 0333-8461122



کرنے کی ضرورت پر متفق ہیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حادثات ایک روز میں وقوع پزیر نہیں ہوتے۔ ۱۹۵۴ء کا حادثہ اس لیے پیش آیا کہ ہمارے سیاست دان سات برسوں تک دستور نافذ نہیں کر سکے تھے۔

۱۹۷۳ء کا دستور نہایت جید سیاست دانوں نے منظور کیا اور میں بھی اس کا ڈرافٹ تیار کرنے میں شامل تھا۔ آئین کی تشریح کا اختیار عدالت عظمیٰ کو اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کے پاس بندوق ہے نہ دولت کی فراوانی۔ جناب نواز شریف کے خلاف جو فیصلہ آیا وہ کمزور دلیل پر دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں سب سے قابل اعتماد کسوٹی اچھی حکمرانی ہے۔

عوام کو صاف پانی، اچھی خوراک اور آسودہ زندگی میسر نہ ہو تو پھر کسی نہ کسی طرف سے مداخلت کا امکان رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حالات پہلے سے بہتر ہوں گے کہ عوام کے شعور میں پختگی آ رہی ہے اور سوشل میڈیا نے آزادی اظہار کو نئی سمت عطا کی ہے۔

اُن کی رائے میں عدلیہ نے زیادہ تر فیصلے جمہوریت کے حق میں دیے۔ اس نے فوجی حکمرانوں کو انتخابات کرانے پر مجبور کیا جن کے ذریعے عوام کو اپنے فیصلے کرنے کا موقع ملا۔ آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ عام انتخابات پوری طرح شفاف ہوں اور اپنے وقت پر ہو جائیں۔ عدلیہ اور فوج نے یقین دلایا ہے کہ وہ شفاف انتخابات کو یقینی بنانے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ میں عدلیہ کو مشورہ دینا چاہوں گا کہ وہ اپنے فیصلوں میں اشعار کے بجائے قانونی زبان استعمال کرے اور سیاست دانوں کے خلاف غیر معیاری الفاظ کے استعمال سے اجتناب برتنا جائے۔ پارلیمان اور عدلیہ کے درمیان محاذ آرائی کوئی اچھا شگون نہیں۔ یہ امر قابل ستائش ہے کہ عسکری قیادت نے بار بار یہ عندیہ دیا ہے کہ وہ جمہوریت کو مستحکم دیکھنا چاہتی ہے۔ اس تناظر میں عوام کے منتخب نمائندوں پر واجب آتا ہے کہ وہ پارلیمان کو ایک طاقت ور ادارہ بنائیں، اس کی کارروائی میں پوری توجہ اور بڑی باقاعدگی سے حصہ لیں اور مکالمے کے ذریعے قومی اور علاقائی مسائل کا حل تلاش کریں۔ قومی قیادت کے سنجیدہ رویوں اور دانش مندانہ اقدامات سے اداروں کے مابین تصادم کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتا ہے۔ ہمیں اپنے رویوں سے رواداری اور برداشت کی ثقافت کو پروان چڑھانا اور باہمی احترام کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔

VEGETABLE OIL
100%
PURE

لعلت
بناسپتی

واقعی ایک نعمت ہے



www.salva.com.pk

اپریل 2018ء

27 اردو ڈائجسٹ

A
Public Service
Message



RETINA

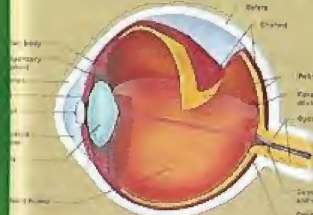
یا پردہ بصریت: حشر ابیاں علاج

آنکھ میں پردہ بصریت کی وہی حیثیت ہے جو کمپیوٹر میں سکرین پر ایک ویڈیو کارڈ RAM کی ہوتی ہے: اس کے بغیر نظر آنا ناممکن ہے۔ یہ آنکھ کی اندرونی سطح پر ایک تیشہ کی طرح تجڑا ہوتا ہے۔ تیشہ کی سطح پر کسی بھی شے کا عکس چھٹی کو پردہ بصریت کہتے ہیں۔

پردہ بصریت کی خرابی کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟

1۔ پردہ بصریت کی دو پرتیں ہوتی ہیں جن کے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجانے سے ان کے درمیان پانی بھر جاتا ہے۔ یہ پردہ بصریت میں سورج میں چھٹ جانے کے باعث ہوتا ہے۔ 2۔ پردہ بصریت میں موجود خون کی تالیاں خراب ہونے سے خون کے اجزاء رتس رتس پیدا کر دیتے ہیں جس سے بینائی کم ہوجاتی ہے۔ 3۔ پردہ بصریت کی سطح پر ایک Macula کے متاثر ہونے سے بالکل صاف تصویر کی نظر نہیں آتی ہے، چیزیں ٹھیک نظر آنے لگتی ہیں، علاوہ ازیں پردہ بصریت کی صورت میں چیزوں کی پہچان مشکل ہوجاتی ہے۔ 4۔ خون کی تالیاں کے حشر اب ہونے سے پردہ کو خوراک نہیں ملتی خاص طور پر اس کی آکسیجن کی ضرورت پوری نہیں ہو پاتی جس سے پردہ کے اوپر اور دیگر رتس کے اندر جھلیاں بنی شروع ہوجاتی ہیں، جو نظر کو متاثر کرتی ہیں۔ ان جھلیوں سے وقتاً فوقتاً خون کی کوئی نالی پھٹ جاتی ہے جس سے بعض اوقات پردہ کے اوپر خون کی تہ جم جاتی ہے اور بڑا وقت و ٹھیکر کا پورا خانہ خون سے بھر جاتا ہے۔ یہ جھلیاں آپسٹ آپسٹ پردہ کے بعض حصوں کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیتی ہیں بعض اوقات پردہ کا کوئی حصہ پھٹ بھی جاتا ہے جس سے پردہ اکھڑ جاتا ہے۔

پردہ بصریت کی خرابیوں کا علاج کرنے کیلئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ انہیں کاؤر فیل میں کیا گیا ہے:



1۔ مختلف قسم کی دوائیں جو نظروں کی شکل میں بھی استعمال کی جاتی ہیں اور کھانسی بھی جاتی ہیں۔ 2۔ بعض ادویہ آنکھ کی شکل میں دی جاتی ہیں۔ یہ ٹیکہ آنکھ کے کئی پردوں کے نیچے بھی لگائے جاتے ہیں اور بعض ٹیکے آنکھ کے اندر تک بھی دوئی پہنچاتے ہیں۔ 3۔ لیزر شعاعیں جس پردہ کے علاج کا ٹیکہ لگایا اور مفید نہ رہے ہیں۔

بعض ایسے ایسے ایسٹن بھی کئے جاتے ہیں جن کی مدد سے پردہ کو بیل کر دیا جاتا ہے اور پھر باہر سے ایک پینٹا جیزر Silicon band آنکھ کے گرد لپیٹ دی جاتی ہے جس سے پردہ دوبارہ نہیں اکھڑتا۔ ایک اور بہت ہی اہم طریقہ علاج ویڈیو کی آپریشن Vitrectomy Operation ہے جس میں آنکھ کے اندر سے مٹائی کر کے مختلف جھلیاں اور خون وغیرہ اٹال دیا جاتا ہے اور جہاں ضروری ہوتا ہے اسے لیزر لگا دی جاتی ہے۔

AMERICAN ACADEMY
OF OPHTHALMOLOGY
The Eye M.D. Association
MEMBER

لیڈر پورڈو بالٹیمور میں قائم شدہ
ایم ڈی ڈراسیف کھوکھر
www.dr.asifkhokhar.com
0333-4102268 Email: drasifkhokhar@hotmail.com

ایم ڈی ڈراسیف کھوکھر (ایم ڈی ایم ایس) (ایم ایس) (ایم ایس) (ایم ایس)
Vitreoretinal, phaco, laser,
ایم ڈی ڈراسیف کھوکھر (ایم ڈی ایم ایس) (ایم ایس) (ایم ایس) (ایم ایس)

ڈاکٹر آصف کھوکھر

اپریل 2018ء

26 اردو ڈائجسٹ

رواں سال ماہ نومبر میں ان حملوں کو انجام پائے دس برس بیت جائیں گے۔ بھارتی حکمرانوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حملے پاکستانی دہشت گردوں نے انجام دیے تھے۔ چنانچہ پچھلے دس سال سے بھارتی حکومت کی سرٹوڈر کوشش ہے کہ ممبئی حملوں کا سہارا لے کر اقوام متحدہ پاکستان کو ”دہشت گرد ملک“ قرار دے ڈالے تاکہ وہ عالمی سطح پر تنہا ہو سکے۔

اردو میں اپنی نوعیت کے پہلے سچائے آشکارا کرتی تحقیق

اس گمراہ کن پلان کی حیرت انگیز اور مختصر العقول داستان جو پاکستان، پاک فوج اور لشکر طیبہ کو عالمی سطح پر بدنام کرنے کے لیے بھارتی جرنیلوں، راہروں اور آئی بی نے مل کر بنایا اور دنیا والوں کی نظروں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہے

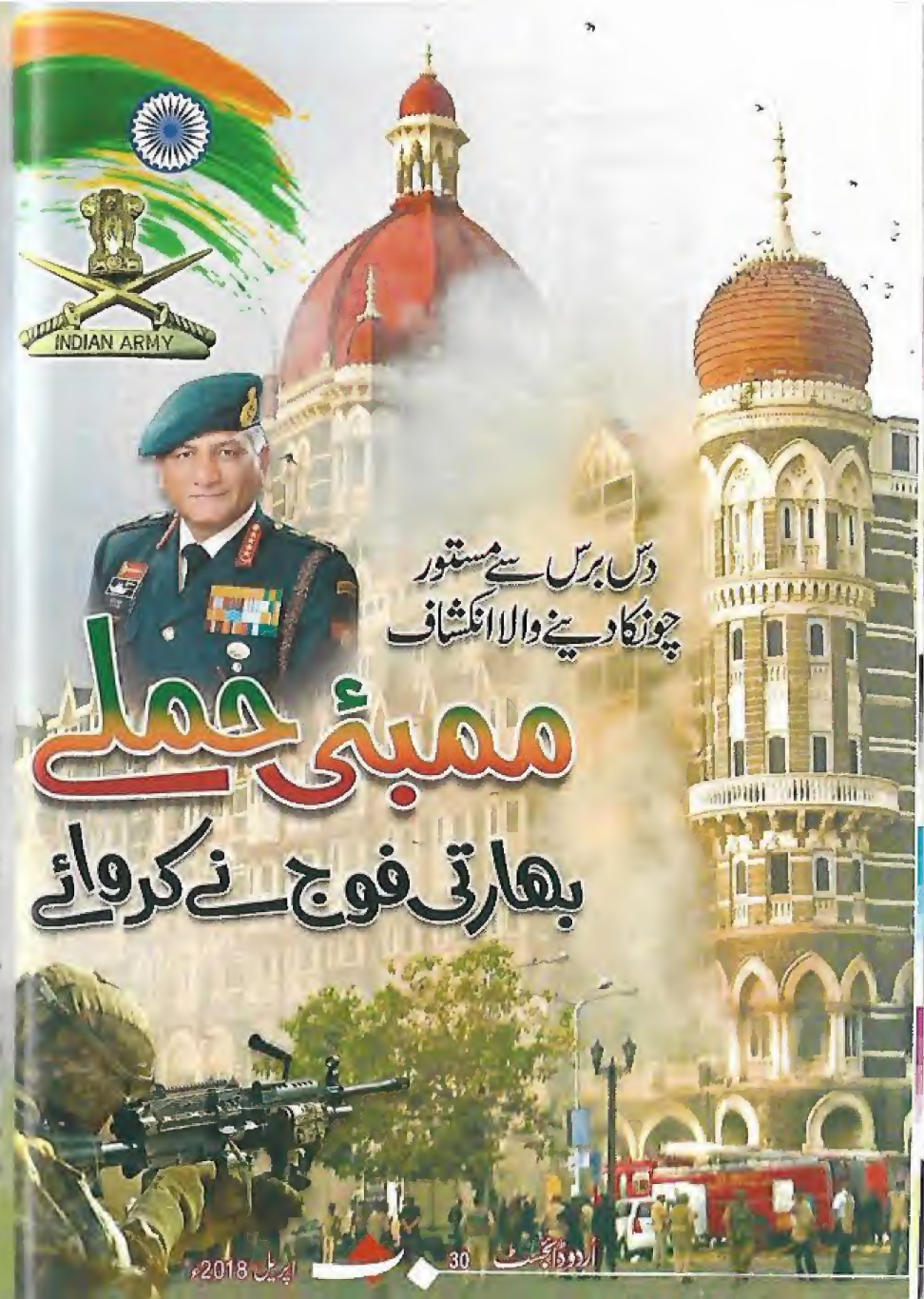
دہشت گرد ملک کی حیثیت قرار دے کر بھارتی حکمران پاکستان کی معیشت کو بھرپور نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں بھارت اور امریکا نے متواتر کوششوں کے بعد پاکستان کو فنانسئل ایکشن ٹاسک فورس کی ”گرے لسٹ“ میں شامل کروا کر ہری دم لیا۔ دونوں قوتوں کو اس لیے بھی کامیابی نصیب ہوئی کیونکہ بقول ان کے، حکومت پاکستان ممبئی حملے انجام دینے والی تنظیم لشکر طیبہ المعروف یہ جماعت الدعوہ کے خلاف کارروائی کرنے سے گریز کرتی ہے۔

امریکا اور بھارت کے زبردست دباؤ کی وجہ سے چین، ترکی اور سعودی عرب بھی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ بعد ازاں حکومت پاکستان نے جماعت الدعوہ کے تحت چلنے والے تعلیمی ادارے، اسپتال اور دیگر سماجی مراکز اپنے قبضے میں لے لیے۔ یوں وہ دنیا والوں پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ پاکستان

۲۶ نومبر ۲۰۰۸ء کی بات ہے، انیتا ادھا یا شام کو ممبئی کے ساحل پر شام کو حسب معمول چہل قدمی کر رہی تھی۔ وہ اٹار آبادی بھارت کے اس سب سے بڑے شہر میں کولابہ نامی علاقے کی باسی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ گھر کے کام کاج سے فراغت کے بعد وہ بغرض تفریح اس ساحل پر چلی آتی جو آبادی سے کچھ دور ہونے کی وجہ سے عموماً ویران ہی ہوتا۔ وہ چہل قدمی کر کے ٹھکن دور کر لیتی۔ اس شام انیتا نے اچانک دیکھا کہ ایک کشتی ساحل پر

آن لگی۔ اس پر چھ آدمی سوار تھے۔ ان کے ساتھ بیگ تھے اور پشاورے (بیگ پیک بھی)۔ انیتا نے تجسس کے مارے ان سے مرادھی زبان میں پوچھا ”تم کون ہو؟“ ایک انجینی نے مرادھی ہی میں جواب دیا ”تم اپنے کام سے کام رکھو۔“ وہ لوگ پھر مرادھی ہی میں باتیں کرتے آبادی کی جانب بڑھ گئے۔

یہ واقعہ انتہائی چالاکی و عیاری سے بنائے گئے اس دعوے کا ابتدائی حصہ ہے جو بعد میں ”ممبئی حملوں“ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس عیارانہ پلان کی اہمیت کا اندازہ یوں لگائیے کہ ان حملوں کو ”بھارت کا نائن الیون“ کہا جاتا ہے۔ اس طرح امریکا کے نائن الیون نے دنیا بھر میں سنسنی پھیلا دی تھی، اسی طرح ممبئی حملے بھی انتہائی چیمانی ثابت ہوئے اور انھوں نے تین دن تک پوری دنیا میں ہرجان پھیلائے رکھا۔



دس برس سے مستور
چونکا دینے والا انکشاف

ممبئی حملے بھارتی فوج نے کروائے

سابق آئی جی مہاراشٹر، ایس ایم اشرف

دھڑلے سے اپنے ہی ہم وطنوں کو گولیاں مارتے رہے تاکہ اس خونیں منصوبے کی شدت زیادہ سے زیادہ بڑھائی جاسکے۔



ہینت کر کرے

یہ کارندے انتہائی تجربے کار اور لڑائی بھڑائی میں طاق تھے۔ ممکن ہے کہ ان میں بھارتی فوج کے کمانڈر بھی شامل ہوں۔ جنوبی ممبئی میں قتل عام کرنے والے ان بھارتی دہشت گردوں کی تعداد کے متعلق قطعیت سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم ان کی تعداد دس سے خاصی زیادہ تھی۔ یہ یقینی ہے کہ ۲۶ نومبر کی رات بیس سے تیس دہشت گرد ممبئی میں خون کی ہولی کھیلنے رہے اور اس خوفناک قتل کا ذمہ منصوبے کے عین مطابق پاکستانیوں کے سر منڈھ دیا گیا۔

ممبئی حملوں کے منصوبے کو ممبئی پولیس کے نچلے افسروں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ ظاہر ہے، اگر انھیں بھی منصوبے میں شامل کر لیا جاتا، تو نام نہاد حملہ آور پاکستانیوں سے مقابلہ کون کرتا؟ اس گمراہ کن منصوبے کی کامیابی یقینی بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ عام لوگوں اور سپاہیوں کا مارے جاننا ضروری تھا۔ چنانچہ اپنے مفادات پورے کرنے کی خاطر جرنیل ٹولے نے ہم وطنوں کا قتل عام بھی منظور کر لیا۔ ان کا فلسفہ یہی ہو گا کہ زیادہ پائے کی خاطر کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ یا یہ کہ گیبوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

کے بعد راکر ایجنٹوں نے ہندو پنڈتوں اور سکھوں پر کئی حملے کیے اور انھیں جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ راکر ایما پر ہی بھارتی میڈیا نے ان حملوں کا ذمہ دار مجاہدین کو ٹھہرایا۔ ان حملوں کی وجہ سے آخر کار تحریک آزادی کشمیر میں شامل مختلف تنظیموں کے مابین پھوٹ پڑ گئی۔ مزید برآں شہریوں پر حملوں کی وجہ سے یہ کشمیری مجاہدین پر ”دہشت گرد“ ہونے کا ٹھپا بھی لگ گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کمزور کرنے کو را اپنی زبردست کامیابی قرار دیتی ہے۔

الین ڈیوڈسن سے قبل ایک سابق بھارتی پولیس افسر، سید محمد اشرف بھی اپنی کتاب ”ہینت کر کرے“ کو کس نے قتل کیا؟ میں یہ لکھ چکے کہ ممبئی حملوں میں بھارتی حکمران طبقہ ملوث تھا۔ وہ بھارتی خفیہ ایجنسی، اینٹی جنس ہیورو یا آئی بی کو ان حملوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ سید محمد اشرف مہاراشٹر ریاست کے آئی جی پولیس رہ چکے جس کا صدر مقام ممبئی ہے۔ لہذا ان کے دعوے وزن رکھتے ہیں۔ جرنیل محقق، الین ڈیوڈسن اور ایس ایم اشرف نے اپنی کتب میں ممبئی حملوں کو بھارتی حکومت کا ”کارنامہ“ ثابت کرنے کے لیے جو شواہد، دلائل اور نکات دیے ہیں، وہ بھی میرے زیر مطالعہ رہے۔ مزید برآں بھارتی و پاکستانی پرنٹ میڈیا میں چھپے بیسوں مضامین بھی آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔

یہ سبھی نتیجہ نکالتے ہیں کہ ممبئی حملے بھارتی فوج کے ایک جرنیل ٹولے نے کروائے۔ اس ٹولے کو را اور آئی بی کے علاوہ انتہا پسند ہندو تنظیموں مثلاً آریس ایس (راشٹر پیوغم سیوک سنگھ) اور شیو سینا کے کارکنوں کی بھی مدد حاصل تھی۔ اس خفیہ آپریشن میں ممبئی پولیس کے بعض اعلیٰ افسر اور شاید چھوٹا راجن گینگ کے کارندے بھی شامل تھے۔

بھارتی فوج، را اور آئی بی جیسی خفیہ ایجنسیوں کی شمولیت کے باعث یہ ممکن ہو سکا کہ ان کے کارندوں نے ساتھ گھنٹوں تک جنوبی ممبئی میں قیامت مچائے رکھی اور

بھارتی فوج نے حملے کیوں کروائے؟ سوال یہ ہے کہ ممبئی حملوں کے ذریعے بھارتی جرنیل اور بھارتی خفیہ ایجنسیاں کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھیں؟ یہ

جب ان حملوں کی اطلاع وادی کشمیر تک پہنچی، تو وہاں پھر مسلمان غاصب ہندوؤں کے خلاف مظاہرے کرنے لگے۔ ماہ اگست میں سری نگر میں پانچ لاکھ کشمیری مسلمانوں نے



ہینت کر کرے بلٹ پروف ڈیٹیکٹ پہنچتے ہوئے

مظاہرہ کیا۔ یہ کشمیر کی تاریخ کا سب سے بڑا احتجاجی مظاہرہ مانا جاتا ہے۔ حکومت نے تشدد و ظلم کا روایتی حربہ اختیار کرتے ہوئے مظاہرے ختم کرنا چاہے، تو بھارتی فوج اور مظاہرین کے مابین جھڑپیں ہونے لگیں۔ بھارتی سیکورٹی اداروں کی فائرنگ سے تقریباً ایک سو کشمیری شہید اور کئی سونخمی ہوئے۔ ان جھڑپوں کی خبریں بھارتی، پاکستانی اور عالمی میڈیا نے شہ سرخیوں میں دیں۔

۲۰۰۸ء تک مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کا جوش و ولولہ خاصی حد تک سرد ہو چکا تھا۔ امریکی واقعہ نائن الیون کے بعد تقریباً سبھی ممالک میں آزادی پسندوں کو ”دہشت

جاننے کی خاطر آپ کو ۲۰۰۸ء میں پلٹنا ہو گا جب چار پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں ایسے دو بڑے واقعات ظہور پذیر ہوئے جنہوں نے بھارتی فوج اور اس کے جرنیلوں کو بلا کر رکھ دیا۔ پہلے واقعے کا آغاز ۲۶ مئی کو ہوا۔ اس دن مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے ۹۹/۱ ایکڑ زمین بھارتی حکومت کو دے ڈالی تاکہ وہ امرنا تھ یا ترا کو آئے ہندو یاتریوں کے لیے سرائیں اور ہوٹل وغیرہ تعمیر کر سکے۔ اس معاہدے کے خلاف جلدی وادی کشمیر میں مسلمان زبردست مظاہرے کرنے لگے۔

چنانچہ یکم جولائی کو ریاستی حکومت نے معاہدہ منسوخ کر دیا۔ اب اس منسوخی کے خلاف جموں میں ہندو مظاہرے شروع ہو گئے۔ مظاہرین نے مسلمانوں پر حملے بھی کیے۔



لیفٹیننٹ کرنل پروت

بھارتی میڈیا نے حادثے کے فوراً بعد یہ اعلان کیا کہنا شروع کر دیا کہ یہ دہشت گرد حملہ لشکر طیبہ نے کروایا۔ وجہ یہ گھڑی گئی کہ وہ بھجوانا ایکسپریس بند کروانا چاہتی ہے، لیکن بھارت کے بی ایک پولیس افسر کی گفتگو سے یہ سچ سامنے آ گیا کہ ریل میں ہندو دہشت گردوں نے آگ لگائی تھی اور جن کی سرپرستی اور مدد فوجی افسر کر رہے تھے۔

منصوبہ بنتا ہے

کر کرے کی چھان بین سے رفتہ رفتہ عیاں ہوا، کہ ہندو دہشت گردی کے اس نیٹ ورک سے کئی جرنیل نامی گرامی سیاستدان اور اعلیٰ سرکاری افسر وابستہ ہیں۔ اسی لیے پورے بھارت میں نہایت منظم طریقے سے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف وسیع پیمانے پر سازشیں جاری تھیں۔ ان بم دھماکوں کے الزام میں سینکڑوں مسلم نوجوان اور مرد گرفتار کر لیے گئے جنہیں عقوبت خانوں میں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ساتھ ساتھ یہ پروپیگنڈا بھی ہوا کہ اسلام اور دہشت گردی لازم و ملزوم ہیں۔ یوں باقاعدہ منصوبہ بندی سے بھارت کے ہندو عوام میں مسلمان ہم وطنوں کے خلاف شدید نفرت و عداوت پیدا کی گئی۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ آج بھارت میں معمولی

افیرہ اس کی بڑی جماعتیں ہیں۔ لی جے پی سنگھ پر یوار کا سیاسی روپ ہے جو ۲۰۱۴ء سے بھارت میں حکومت کر رہا ہے۔

ہندو دہشت گردوں کے اس نیٹ ورک کے قیام کا صرف ایک مقصد تھا۔... یہ کہ مسلمانوں کے مذہبی و عوامی مقامات پر بم دھماکے کیے جائیں اور ان کا ذمے دار اسلامی تنظیموں کو ٹھہرایا جائے۔ چنانچہ نیٹ ورک سے منسلک ہندو دہشت گردوں نے کم از کم چودہ بم دھماکے کیے جن میں پرنا بم دھماکا (۲۰۰۳ء)، جالنا بم دھماکا (۲۰۰۴ء)، پرنا بم دھماکا (۲۰۰۵ء)، ممبئی ٹرین دھماکا (۲۰۰۶ء)، مایاگاؤں دھماکا (۲۰۰۶ء)، منڈ دھماکا (۲۰۰۶ء)، حیدر آباد بم دھماکا (۲۰۰۷ء)، اجیر شریف درگاہ بم دھماکا (۲۰۰۷ء)، یو پی کی عدالتوں میں دھماکے (۲۰۰۷ء)، جے پور دھماکا (۲۰۰۸ء)، دہلی بم دھماکا (۲۰۰۸ء) اور مایاگاؤں دھماکا (۲۰۰۸ء) شامل ہیں۔

اہم ترین انکشاف یہ ہوا کہ بھارتی فوج کے حاضر فوجی افسر مثلاً لیفٹیننٹ کرنل پروت اور میجر پادھانے نہ صرف ہندو دہشت گردوں کو بم اور اسلحہ چلانے کی تربیت فراہم کرتے بلکہ انہیں سرکاری ڈپو سے اسلحہ بھی مہیا کیا جاتا۔ ظاہر ہے، وہ یہ کام بھارتی فوج کے جرنیلوں کی آشیر باد سے کر رہے تھے۔ فوج میں ”چین آف کمانڈ“ کے باعث اعلیٰ افسروں کی اجازت کے بغیر ماتحت معمولی سا کام بھی نہیں کر سکتے۔ اب ہیمنت کر کرے ان فوجی افسروں تک پہنچنے کی بھی تگ و دو کرنے لگے۔

تحقیق و گفتگو سے کر کرے ایک نہایت اہم انکشاف سامنے لانے میں کامیاب رہے۔ انہیں معلوم ہوا کہ لیفٹیننٹ کرنل پروت نے آرمی ڈپو سے ۶۰ کلو آر ڈی ایکس (دھماکہ خیز اور آتش گیر مادہ) چرایا یا اسے دیا گیا۔ یہ آر ڈی ایکس پھر فروری ۲۰۰۷ء میں سمجھوتا ایکسپریس میں آگ لگانے میں استعمال ہوا۔ اسی حادثے میں ۶۸ مرد، عورتیں اور بچے مارے گئے تھے جن میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔

بہادر پولیس افسر، ہیمنت کر کرے اس فورس کا سربراہ تھا۔ اس کا رتبہ آئی جی پولیس کے برابر تھا۔ اس کے دو نائب، وجے سالسکر اور اشوک کامتے بھی اپنے اصول اور قانون پسندی کی وجہ سے پوری پولیس فورس مشہور تھے۔

اب ان تین افسروں کی زیر قیادت اپنی ٹیراسکو ڈ کے جاسوس مایاگاؤں بم دھماکوں کی تحقیقات کرنے لگے۔ تحقیق سے انکشاف ہوا کہ ایک بم جس موٹر سائیکل میں رکھا گیا تھا، وہ ایک سدھوی، پر گیا تھا کرسنگھ کی ملکیت تھا۔ یہ مشہور انتہا پسند ہندو تنظیم، وشوا ہندو پریشد کی لیڈر تھی۔ چنانچہ وسط اکتوبر ۲۰۰۸ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔

پر گیا تھا کرے شروع ہونے والی گفتگو کے بعد دہشت گردی کے اس وسیع و عریض نیٹ ورک کی پرتیں کھلتی چلی گئیں، جو ۲۰۰۲ء سے کام کر رہا تھا۔ پر گیا کے قبضے سے دو لیپ ٹاپ برآمد ہوئے جن سے اہم معلومات ملیں۔ معلوم ہوا کہ بھارت میں تمام انتہا پسند ہندو تنظیموں کے کارکن ولیدر اس نیٹ ورک سے منسلک تھے۔ یہ تنظیمیں اصطلاح میں ”سنگھ پر یوار“ کہلاتی ہیں۔ آرائس، بجرنگ دل، وشوا ہندو پریشد



پر گیا تھا کر

گرد، قرار دے دیا گیا تھا۔ اس نظریے کا اطلاق کشمیری مجاہدین پر بھی ہوا۔ چنانچہ کشمیری نوجوان جہادی تنظیموں میں شمولیت سے کترانے لگے۔ لیکن امرنا تھا ایتراکوئی گئی زمین کے تنازع نے وادی کشمیر میں تحریک آزادی کی بجھتی شمع روشن کر دی۔ ایک بار پھر کشمیری نوجوان پتھروں اور غلیلوں سے ٹیکوں کا مقابلہ کرنے لگے۔

بھارتی جرنیلوں کے نزدیک سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ وادی میں کشمیری نوجوانوں کی جہادی تنظیمیں پھر فعال ہو سکتی تھیں۔ ان میں سرفہرست لشکر طیبہ سے وابستہ تنظیمیں تھیں جن کے مجاہدین انتہا پسند ولیدر اور گوریل جنگ میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ بھارتی جرنیلوں کو یہ خبریں ملنے لگی تھیں کہ وادی میں یہ تنظیمیں پھر فعال ہو رہی ہیں۔ گویا لشکر طیبہ کا خوف ایک بار پھر ڈراؤنا خواب بن کر انہیں چمٹ گیا۔ انہیں یاد آنے لگا کہ ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۹ء لشکر طیبہ اور اس سے وابستہ کشمیری تنظیموں نے وادی میں بھارتی فوج کو تنگی کا ناچ چھائے رکھا تھا۔ وہاں لاکھوں فوجی تعینات کرنے پڑے جن کا روزانہ خرچ کروڑوں روپے تھا۔ چنانچہ ان کے سامنے یہ اہم مسئلہ آن کھڑا ہوا کہ وادی کشمیر میں لشکر طیبہ اور دیگر جہادی تنظیموں کے پھیلاؤ کو کس طرح روکا جائے؟

مسلمانان بھارت کے خلاف بہت بڑی سازش جب وادی کشمیر میں عوام تحریک آزادی اور جہادی جانب مائل ہو رہے تھے ۲۹ ستمبر کو ہزاروں میل دور واقع ریاست مہاراشٹر کے شہر، مایاگاؤں میں دوسرے اہم معاملے نے جنم لیا۔ ہوا یہ کہ وہاں آباد مسلمان نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے کہ دو بم دھماکے ہو گئے۔ ان دھماکوں کی وجہ سے سات مسلمان شہید جبکہ سینکڑوں زخمی ہو گئے۔

اس وقت مہاراشٹر میں دہشت گردی کے واقعات کی چھان بین کرنے کی خاطر ایک خصوصی پولیس فورس ”میشنی ٹیرسٹ اسکواڈ“ تشکیل دیا جا چکا تھا۔ ایک دیانتدار اور

باتوں پر ہندو جمع ہو کر مسلمانوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنا ڈالتے ہیں... ایسا خوفناک تشدد جس کی ویڈیو دیکھ کر روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

لیکن اکتوبر اور نومبر ۲۰۰۸ء میں ایک اصول پسند ہندو پولیس افسر، بیہمت کر کرے نے انتہا پسند ہندوؤں کے دہشت گردانہ ٹیٹ ورک کا پردہ چاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب بھی یہ پردہ ہٹا، دنیا والوں کو طم ہو جاتا کہ بھارتی فوج کے جرنیل، نامور سیاسی لیڈر اور اعلیٰ سرکاری افسر اپنے مذموم مقاصد کی خاطر بے گناہ مسلمانوں اور دین اسلام کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ یوں بھارتی حکمران طبقے کا ایک بااثر اور طاقتور ٹولہ دنیا کے سامنے نکلا ہو جاتا۔ اس ٹولے میں جنرل وی کے سنگھ شامل ہو سکتا ہے جو بھارتی فوج کا چیف آف آرمی اسٹاف رہا ہے۔ آج کل بی جے پی نے اسے وزیر مملکت بنا رکھا ہے۔

جوں جوں بیہمت کر کرے کی چھان بین آگے بڑھی اس ٹولے میں کھلی مچ گئی۔ ظاہر ہے، اگر پوری دنیا کو یہ بات پتا چل جاتی کہ انتہا پسند ہندو مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا ایسا ٹیٹ ورک چلا رہے ہیں جس میں بھارتی فوج کے جرنیل، مشہور سیاست دان اور اعلیٰ سرکاری افسر شامل ہیں، تو بھارت کی جگہ ہنسی ہوتی۔ یہی نہیں، مغربی میڈیا نے اسلام اور مسلمانوں کا دہشت گردی سے جو لازم و ملزوم کا ناتا جوڑ رکھا تھا، وہ بھی کمزور پڑ جاتا اور دہشت گردی کے ساتھ ہندو مت اور ہندوؤں کا بھی نام لیا جانے لگتا۔

اس کے بعد اعلیٰ سطح پر بھارتی جرنیلوں پر یہ دباؤ بھی پڑ سکتا تھا کہ وہ مقبوضہ کشمیر سے اپنے لاکھوں فوجی واپس بلوا لیں۔ نیز اقوام متحدہ میں یہ مطالبہ سامنے آ جاتا کہ مقبوضہ کشمیر میں راستے شماری کروائی جائے تاکہ کشمیری عوام اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر سکیں۔

غرض مقبوضہ کشمیر کی صورت حال کے بعد اب بیہمت کر کرے کی چھان بین نے بھارتی حکمران طبقے میں شامل

اسلام اور پاکستان دشمن طاقتور و بااثر ٹولے کو بڑی مشکل و مصیبت میں ڈال دیا۔ اب ضروری ہو گیا کہ کر کرے کی چھان بین کسی بھی طرح روکی جائے اور اگر وہ قانون کی راہ ترک نہیں کرتا تو اسے اپنی راہ سے ہٹا دیا جائے۔

بھارتی اخبارات کی بعض رپورٹیں گواہ ہیں کہ اس طاقتور ہندو ٹولے نے شروع میں بیہمت کر کرے کو پُرکشش ترغیبات دیں تاکہ وہ دہشت گردی کے ٹیٹ ورک کو بے نقاب نہ کریں۔ جب کر کرے نے مادی ترغیبات ٹھکرا دیں تو حکمران ٹولے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اب وہ کر کرے اور ان کے ساتھیوں کو راہ سے ہٹانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

مسئلہ یہ تھا کہ بیہمت کر کرے معمولی شخصیت نہیں تھے۔ وہ ایک ایماندار پولیس افسر کی حیثیت سے بھارت بھر میں مشہور تھے۔ پھر ہندو دہشت گردوں کا ٹیٹ ورک طشت از پام کرنے پر وہ مسلمانان بھارت کے ہیرو بن گئے تھے۔ وہ انھیں اپنا میچا سمجھنے لگے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ ان کی لفتیش نے ثابت کر دیا کہ جن ہم دھماکوں کے بعد بھی سومسلمان نوجوان ”دہشت گرد“ قرار دے کر پکڑے گئے تھے، وہ انتہا پسند ہندوؤں نے انجام دیے تھے۔

اس صورت حال میں جرنیلوں، سیاست دانوں اور سرکاری افسروں پر مشتمل طاقتور ٹولہ بیہمت کر کرے کو قتل کروا دیتا، تو بھارتی عوام نے انہی پر شک کرنا تھا۔ چونکہ حکومت کا گٹر بیس کے قبضے میں تھی لہذا سیکور و لبرل کانگریسی وزرا و سیاست داں بدلتے حالات سے فائدہ اٹھاتے اور زیادہ طاقتور اور اثر رسوخ والے ہو جاتے۔ چنانچہ کر کرے کو قتل کی خاطر ایسے پلان کی ضرورت تھی جس سے سانپ مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔

اسی سوچ نے آخر کار ممبئی حملوں کے شاطرانہ اور خوفناک پلان کو جنم دے ڈالا۔ یہ منصوبہ سرعت سے بنایا گیا کیونکہ وقت کم تھا۔ بیہمت کر کرے نے ناسک عدالت میں پہلا

قدمہ دائر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب یہ بات منظر عام پر آئی، تو انتہا پسند ہندو لیڈر لٹھ لے کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ ایڈوائی، نریندر مودی اور دیگر قوم پرست لیڈروں نے کر کرے کو ”دیش دروجی“ (غدار) قرار دیا۔ شیوسینا کے سربراہ، ہال ٹھا کرے نے جماعت کے رسالے میں لکھا:

”غدار کر کرے نے جہیہ کر لیا ہے کہ وہ بھارت کو پوری دنیا میں بدنام کر کے چھوڑے گا۔ ہم اس پر تھوکتے ہیں، تھوکتے ہیں، اب وقت آ گیا ہے کہ ہندو مت اور ہندو قوم کی حفاظت کے لیے خود کش اسکاؤتیار کیے جائیں۔ صرف انہی کے ذریعے ہندو جاتی کا تحفظ ممکن ہے۔“

۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کو دی اینڈین ایکسپریس میں تب بھارتی سپاہی جماعت، کانگریس کے جنرل سیکرٹری، ڈوگے سنگھ کا ایک بیان شائع ہوا۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ ممبئی حملہ شروع ہونے سے دو گھنٹے قبل کر کرے نے انھیں فون کر کے بتایا تھا کہ ان کو قتل کی دھمکیاں مل رہی ہیں اور یہ کہ ان کی زندگی کو شدید خطرات لاحق ہو چکے۔ اسی طرح بھارتی میڈیا میں یہ خبریں بھی آ چکیں کہ نامعلوم افراد نے ممبئی حملوں سے دو دن قبل مختلف اخباری دفاتر میں فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ عنقریب بیہمت کر کرے کو نشانہ عبرت بنا کر قتل کر دیا جائے گا۔

غرض کر کرے نے کسی دباؤ کے آگے سر نہ جھکا یا، تو اس کا سر قلم کرنے کا فیصلہ ہو گیا، لیکن ان کے قتل کا یہ پلان اس طریقے سے وضع ہوا کہ ایک تیرے کئی شکار کیلئے جائیں۔ مگر یہ منصوبہ کافی پھرتی سے راتوں رات بنایا گیا، اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی پلان میں خاصے جھول رہ گئے اور خاص طور پر بیہمت کر کرے کا قتل نہایت پُر اسرار واقعہ بن گیا۔ اس واقعے نے بھی بظاہر غلطی سے پاک خفیہ منصوبے یا فالز فلیک ایکٹ کو شکوک بنادیا۔

پاکستان کو ملوث کرنے کا اعلیٰ منصوبہ... بھارتی فوج کی ملٹری ایجنسی، را اور آئی بی کے کرتا

دھرتاؤں نے گمراہ کن منصوبہ یہ بنایا کہ بیہمت کر کرے کے قتل میں لشکر طیبہ اور پاک فوج کی مشہور زمانہ خفیہ ایجنسی، آئی بی کو ملوث کر دیا جائے۔ اس طرح خود بخود پاکستان کی بھی عالمی سطح پر بدنامی ہو جاتی۔ دنیا والوں کے سامنے منصوبے کا خاکہ کچھ یوں پیش کیا گیا:

مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں ۲۳ سے ۲۶ فدا بین کو گوریل جنگ لڑنے کی تربیت دی گئی۔ یہ تربیت پاک فوج کے سابق و حاضر افسروں اور لشکر طیبہ سے منسلک گوریلوں کی زیر قیادت انجام پائی۔ بعد ازاں ۱۰ فدا بین منتخب ہوئے جنہیں زیادہ سخت عسکری تربیت سے گزارا گیا۔

مقررہ وقت پاک بحر یہ کہ کسی جہاز نے انھیں ممبئی کے قریب سمندر میں بھارتی مچھیروں کی ایک کشتی تک اتار دیا۔ انھوں نے مچھیروں کو قتل کر کے ان کے ٹرالر پر قبضہ کر لیا۔ جب ممبئی کا ساحل قریب آیا، تو وہ ریل سے کئی کشتی پر بیٹھ کر وہاں تک پہنچ گئے۔

ساحل پر اتر کر وہ دو فدا بین کی صورت پانچ کھڑکیوں میں بٹ گئے۔ انھوں نے پھر دو فائینو سٹار ہوٹلوں، ریلوے



داؤد گیلانی المعروف ڈیوڈ ہیڈلے

اسٹیشن، یہودی سینٹر اور ایک کیفے میں شہریوں اور سپاہیوں کو نشانہ بنایا۔ ان کے حملوں میں ۱۶۶ افراد مارے گئے جبکہ چھ سو سے زائد زخمی ہوئے۔ مقتولین میں ۱۳ بھارت، ۶ امریکا، ۴ اسرائیلی، ۳ جرمنی اور دو کوینیڈا اور آسٹریلیا سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ دہشت گرد وسطی گھنٹوں تک قتل غارت کرتے رہے۔ ان میں سے نو آخر کار مارے گئے مگر کشتائی طور پر ایک دہشت گرد، اجمل قصاب زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ اکتوبر ۲۰۰۹ء میں امریکی خفیہ ایجنسی ایف بی آئی نے شکاگو میں ایک پاکستانی نژاد امریکی، سید داؤد گیلانی المعروف ڈیوڈ کوک لین ہیلڈے کو گرفتار کیا۔ ڈیوڈ پر الزام لگایا گیا کہ اس نے امریکی یہودی کے مبینہ میں جاکر پاکستانی دہشت گردوں کے لیے ٹارگٹوں کی تصاویر چھپتی تھیں اور ڈیوڈ کوک لین اتاریں۔

اجمل قصاب پر مقدمہ چلا اور نومبر ۲۰۱۲ء میں اسے مجرم بنا کر چھانسی دے دی گئی۔ ڈیوڈ کوک لین پر امریکی عدالت میں مقدمہ چلا۔ جنوری ۲۰۱۲ء میں ممبئی حملوں میں حصہ لینے پر اسے پینتیس سال کے لیے جیل بھجوا دیا گیا۔

ممبئی حملوں کے بارے میں بھارت کا سرکاری ورژن یا بیان انہی دو ”مجرموں“ کے اعترافات و بیانات پر مبنی ہے۔

جب ممبئی حملے انجام پائے، تو حکومت پاکستان اور جماعت الدعوة نے ان سے اظہارِ اِعتاقی کیا۔ بعد ازاں عالمی دباؤ کے باعث پیپلز پارٹی کی حکومت نے سات پاکستانی گرفتار کر لیے۔ ان پر ”شک“ تھا کہ انھوں نے ممبئی حملے انجام دینے میں حصہ لیا ہے۔ ساتوں پاکستانیوں پر عدالتوں میں مقدمے چلے مگر پولیس انھیں مجرم ثابت نہیں کر سکی۔

جرمن محقق نے اپنی کتاب تحریر کرتے ہوئے تحقیق کی بنیاد بجا طور پر ایک قانونی نکتے ”کوئی بونو“ (Cui Bono) پر رکھی۔ لاطینی زبان کی اس اصطلاح کے معنی ہیں: فائدہ کسے ہوا؟ گویا دورانِ تحقیق ایسے ڈیوڈ اس کھوج میں رہا کہ ممبئی

حملے انجام پانے سے فائدہ کسے ملا۔ اسی نکتے نے افشا کیا کہ ممبئی حملے دراصل بھارتی حکمران طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک طاقتور گروہ کی ایسی زبردست سازش تھی جس کے ذریعے بیک وقت کئی مقاصد حاصل کر لیے گئے۔ ان مقاصد کا تذکرہ درج ذیل ہے:

☆ عوام والوں کی توجہ مقبوضہ کشمیر سے ہٹ جائے جہاں کشمیری وسیع پیمانے پر بھارت کے خلاف احتجاجی مظاہرے کر رہے تھے اور تحریک آزادی کشمیر کے تین مردہ میں نئی جان پڑ رہی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ممبئی حملے ہوتے ہی نہ صرف مقبوضہ کشمیر کے احتجاجی مظاہرے پس منظر میں چلے گئے بلکہ غاصب و ظالم بھارتی حکومت کو معصوم اور ستم رسیدہ سمجھا جانے لگا جو مسلم دہشت گردوں کے نشانے پر تھی۔

☆ ایشیائی ٹیرسٹ اسکواڈ کے تینوں اصول پرست افسر، بہتت کر کرے، سانسکر اور اشوک کا متے صفحہ ہستی سے مٹ جائیں تاکہ ہندو دہشت گردوں کا وہ نیٹ ورک طشت از بام نہ ہو سکے جس کی سرپرستی بھارتی فوج کے جرنیل، اعلیٰ سرکاری افسر اور مشہور سیاستدان کر رہے تھے۔

☆ اسلام کو بحیثیت مذہب بدنام کیا جاسکے اور دکھایا جائے کہ مسلمان جنگجو، جھگڑالو اور پس ماندہ ہیں۔ مغربی میڈیا پہلے ہی یہ پروپیگنڈا کر رہا تھا۔

☆ نام نہاد دہشت گردی کا ہوا دکھا کر بھارتی عوام کو خوفزدہ کیا جائے تاکہ مسلمانوں خصوصاً کشمیری عوام کو شکینے میں کس لینے والے سخت اور ظالمانہ قوانین وضع کیے جاسکیں۔

☆ بھارت مغربی دنیا یعنی امریکا و برطانیہ کے قریب ہو جائے۔ چنانچہ آج بھارت امریکی و اسرائیلی اسلحے کا بہت بڑا خریدار بن چکا۔

☆ بھارتی افواج کے جنگی بجٹ میں اضافہ ہو سکے۔ ۲۰۰۸ء سے ہر سال بھارتی فوج کے بجٹ میں خمیر العقول اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی نہیں، پولیس اور دیگر سیکورٹی اداروں کو

پہلے سے کہیں زیادہ رقم ملتی ہے۔
کستانی میڈیا میں چھپے خدائر

دوسری طرف ممبئی حملوں سے پاکستان، پاک افواج اور جماعت الدعوة تینوں کو زبردست نقصان پہنچا۔ بھارت اور ہندی دنیا میں پاکستان کو دہشت گردی کروانے والا ملک سمجھا جانے لگا۔ یہ ٹھپا ابھی تک وطن عزیز پر سے اتر نہیں سکا۔ پاک فوج کو بھی دہشت گردی کروانے والی فورس سمجھا گیا۔ جماعت الدعوة کا تو نام و نشان مٹ چکا اور اس کی ساری مافی و فلاحی سرگرمیاں ختم کر دی گئیں۔ غرض ان حملوں سے پاکستان کو ایک بھی ایسا فائدہ نہیں ہوا ہے بیان کیا جاسکے۔

فرض کر لیجئے کہ یہ ممبئی حملے لشکر طیبہ نے پاک فوج کے مافی افسروں کی مدد سے انجام دیے۔ سوال یہ ہے کہ انہیں یہ عمل کروانے سے کیا حاصل ہوا؟ کیا یہ پاکستانی بھارتی عوام پر بے دریغ فائرنگ کروا کر بھارت میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے؟ مگر اس عمل سے تو بھارتی عوام پاکستان کے شدید مخالف ہو جائے اور ایسا ہی ہوا۔ مزید برآں اس دہشت گردی سے مقبوضہ کشمیر میں جاری تحریک آزادی کو بھی نقصان پہنچا کہ وہ بھارتی عوام کی حمایت سے محروم ہو جاتی۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ جب بھی پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں بہتری آئے تو جہادی تنظیمیں بھارت میں دہشت گردی کا بڑا واقعہ انجام دے ڈالتی ہیں۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ تعلقات دوبارہ خراب ہو جائیں۔ لیکن نومبر ۲۰۰۸ء تک پاک بھارت کشیدہ ہو چکے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ امریکا پاکستان سے نانا توڑ کر بھارت کی سمت جھٹکنے لگا تھا۔ اسی نے ٹھیل کے باعث تینوں ممالک کے تعلقات تناؤ کا شکار تھے۔

اگر لشکر طیبہ کے فدا بین ریاست گجرات میں زبردست مودی حکومت کو نشانہ بناتے، تو حملے کرنے کا مقصد سمجھ میں آتا ہے لیکن ممبئی میں ہوٹلوں حتیٰ کہ غریبوں کے ایک اسپتال کو نشانہ ہونا کرنام نہاد پاکستانی دہشت گرد کس قسم کے مفاد حاصل کرنا

چاہتے تھے؟ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔

ایس ایم اشرف، ایس ڈیوٹس اور بھارت کے دیگر غیر جانبدار صحافیوں نے اپنی تحقیقات میں ممبئی حملوں کی بابت بھارتی حکومت کی سرکاری داستان پر کئی اعتراضات اٹھائے ہیں۔ بھارتی میڈیا یہ اعتراضات پوشیدہ رکھنے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے، ان کے عام ہونے سے بھارتی طاقتور ٹولے کے گمراہ کن منصوبے کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ اسی لیے بھارتی میڈیا نے دونوں محققوں کی کتب کا بلیک آؤٹ کر رکھا ہے۔ کسی بھی مشہور اخبار یا ویب سائٹ میں ان کتب کا تذکرہ موجود نہیں۔

حیرت انگیز اور چشم کشا بات یہ کہ پچھلے دس برس کے دوران پاکستان کے کسی بھی اخبار یا رسالے میں کوئی ایسا تفصیلی مضمون شائع نہیں ہوا جس میں ممبئی حملوں کی بھارتی سرکاری داستان میں ملنے والے جھول اور غلط آٹھکارا کیے گئے ہوں۔ یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ پاکستانی میڈیا میں بھی بھارتی حکمرانوں اور خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹ موجود ہیں۔ ان ایجنسیوں کی سعی ہوتی ہے کہ وہ پاکستان کو تو کسی بھی طرح بدنام کرتے پھریں جبکہ بھارت گنگا میں ڈھلی مملکت قرار دیا جائے۔ یہی وہ ایجنٹ ہیں جنہوں نے ۲۰۰۸ء میں یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ اجمل قصاب نامی دہشت گرد پاکستان سے تعلق رکھتا ہے۔ حالانکہ یہ امر تصویر کا صرف ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ آگے بیان ہوگا۔

یہی وجہ ہے، پاکستان میں آج بھی ایک بڑا طبقہ یہی سمجھتا ہے کہ ممبئی حملے آئی ایس آئی نے لشکر طیبہ کی وساطت سے کروائے۔ حالانکہ ان حملوں کا ایک بڑا مقصد دنیا بھر میں پاک افواج کو بدنام کرنا تھا۔ اس مضمون میں راقم نامور دانشور اور محققوں کے اٹھائے گئے اعتراضات تفصیل سے پیش کر رہا ہے تاکہ دردہ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکے اور کم از کم اہل وطن کو علم ہو کہ دس سال قبل ایک طاقتور بھارتی حکمران ٹولے نے پاکستان کے خلاف نہایت عیاری و مکاری



اجمل قصاب دوران مقدمہ

اجمل قصاب را کے قبضے میں تھا کہ ممبئی حملے انجام دینے کا پلان بن گیا۔ منصوبے کے مطابق فیصلہ ہوا کہ اس بدھو اور جاہل پاکستانی نوجوان کو قربانی کا بکرا بنادیا جائے۔ چنانچہ اس کے قد کاٹھ اور صورت شکل سے ملتے جلتے ہندو نوجوان کو بذریعہ پلاسٹک سرجری اور میک اپ اجمل قصاب کی صورت دی گئی۔ اسی نقلی اجمل قصاب نے ممبئی ریلوے اسٹیشن میں شہریوں پر بے دریغ گولیاں چلائیں۔ یہی نقلی اجمل قصاب اپنے ساتھی، ابواسامیل کی معیت میں سی ٹی وی کیمروں کی ویڈیو میں بھی آ گیا۔ یہ بھی پلان کا حصہ تھا تا کہ دونوں پاکستانی دہشت گردوں کی ویڈیو بن جائے اور ایک ٹھوس ثبوت دنیا والوں کو دکھایا جاسکے۔

جب تہمت مت کر کے اپنے ساتھیوں سمیت مارے گئے تو یہ نقلی اجمل قصاب غائب کر دیا گیا جبکہ اصلی اجمل قصاب

اصلی سے نقلی اجمل قصاب تک

بھارت کے سرکاری بیان کی رو سے ممبئی حملوں کے مرتکب نو پاکستانی دہشت گردوں کو بھارتی فوج اور پولیس سے مقابلے کرتے ہوئے مارے گئے مگر کرشماتی طور پر ایک دہشت گرد، محمد اجمل امیر قصاب زندہ پکڑ لیا گیا۔ اجمل قصاب کے واقعہ نان الیون میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اجمل کا بیان ہی ہے جس کے ذریعے بھارتی حکومت نے ممبئی حملوں کے متعلق اپنا سرکاری خاکہ یا بیان تیار کیا، اگر اجمل ہی مشکوک شخصیت قرار پا جائے تو بھارتی حکومت کی سرکاری داستان کی دھڑن تختہ ہو جاتا ہے۔ ایس ایم اشرف کی کتاب نے کچھ ایسا ہی کیا۔

ایس ایم اشرف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مصدقہ ذرائع کے مطابق را کے ایجنٹوں نے ممبئی حملوں سے قبل نیپال سے اجمل قصاب کو گرفتار کیا اور پھر اسے بھارت لا کر کسی نامعلوم مقام پر قید کر دیا۔ یہ انکشاف ممبئی حملوں کی ساری قلعی کھول دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ محمد اجمل نیپال میں کیا کر رہا تھا؟ یہ پاکستانی نوجوان فرید کوٹ نامی ایک قصبے کا رہنشی تھا۔ اس کا باپ نہایت غریب تھا۔ وہ گلیوں میں گھوم پھر کر کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرتا تھا۔ غربت کے باعث اکثر اجمل اور باپ کا جھگڑا رہتا۔ جھگڑے کے بعد اجمل گھر سے بھاگ جاتا اور کئی دن بعد ہی واپس آتا۔

ایک دن اجمل گھر سے ایسا بھاگا کہ پھر پاپٹ کر نہیں آیا۔ یہ یقینی ہے کہ اس دوران پاکستان میں چھپے را کے ایجنٹ اسے پرکشش ملازمت دلوانے کا جھانسا دے کر نیپال لے گئے یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ منہ مانگا معاوضہ دے کر ایک پاکستانی نوجوان کو را کا ایجنٹ بنانے میں کامیاب رہے۔ وہ پھر نیپال کے راستے اسے بھارت لے گئے تا کہ اسے جاسوسی کی تربیت دے سکیں۔

آزادی کا آغاز ہوا، تو تب دونوں تنظیمیں کشمیری مجاہدین کی ہر ممکن مدد کرنے لگیں، لیکن امریکا میں واقعہ نان الیون کے بعد القاعدہ اور لشکر طیبہ کی را میں جدا ہو گئیں۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ حافظ محمد سعید اور ان کے رفقاء اسلامی جنگی قوانین کی رو سے نہتے غیر مسلم شہریوں کو نشانہ بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کی توجہ کا مرکز مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھاتی بھارتی فوج و پولیس تھی۔

اس لیے یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ لشکر طیبہ سے وابستہ جنگجوؤں نے ممبئی پہنچ کر ہولموں، ریلوے اسٹیشن، اسپتال اور سڑکوں پر اندھا دھند، وحشیانہ طریقے سے گولیاں چلائیں اور نہتے شہری مار ڈالے۔ یہ کام انتہا پسند ہندو دہشت گرد ہی کر سکتے تھے جنہیں اپنے گمراہ کن پلان کو کامیاب بنانے کی خاطر زیادہ سے زیادہ شہری قتل کرنے تھے۔

سے گھناؤنا کھیل کھیلا تھا۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ عیار چاکلیہ کے حقیقی پیروکار ہیں۔

مزید آگے بڑھنے سے قبل چند حقائق سامنے لانے ضروری ہیں۔ بیسویں صدی میں مصر اور فلسطین میں علماء کے ایسے طبقے نے جنم لیا جنہوں نے نہتے غیر مسلم شہریوں پر حملے جائز قرار دیے۔ تاہم یہ ایک متنازع معاملہ رہا کیونکہ سنت نبوی ﷺ اور اسلامی جنگی قوانین کی رو سے نہتے غیر مسلم شہریوں پر حملے ناجائز ہیں۔ بہر حال القاعدہ اور اس سے وابستہ بعض تنظیمیں غیر مسلم شہریوں کو نشانہ بنانے لگیں۔ اس عمل سے بہر حال دنیا کے مغرب ہی نہیں عالم اسلام میں بھی انھیں تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔

افغان جہاد کے دوران لشکر طیبہ اور القاعدہ کے مابین ربط ضبط تھا۔ جب ۱۹۸۸ء کو مقبوضہ کشمیر میں تحریک



اجمل اور اسامیل، سی ٹی وی کیمرے کے تصویر

کی پولیس گرفتاری دکھادی گئی۔ یوں ممبئی حملے اپنے مقاصد خاصی حد تک حاصل کرنے میں کامیاب رہے اور انتہا پسند ہندو ٹولے کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی خاطر اجمل قصاب کی شکل میں قربانی کا کبرا بھی مل گیا۔ اجمل کی قربانی

اوائل میں ممبئی کے ایک مسلمان وکیل، عباس کاظمی اجمل قصاب کے وکیل بنے تھے۔ وہ بتاتے ہیں ”مجھے کبھی اجمل کے ساتھ تنہائی میں بات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جب بھی میں اجمل سے ملاقات کرتا تو تین چار سپاہی



کاما اسپتال

پھر پاک فوج اور لشکر طیبہ کو جی بھر کر معطون کیا گیا۔ یہ ضروری تھا کہ اجمل قصاب کو کسی سے تنہائی میں ملے نہ دیا جائے ورنہ وہ سچائی اُگل سکتا تھا۔ را کے ایجنٹوں نے اجمل پر تشدد کر کے اورڈ راہو کا کرا سے بے ضرر بنادیا تھا۔ پھر بھی ممبئی حملے انجام دینے والے طاقتور ٹولے کو خطرہ تھا کہ اجمل قصاب کسی بھی وقت سچ بول سکتا ہے۔ اسی لیے اجمل پر مقدمہ نہایت خفیہ انداز میں چلایا گیا۔ بس اجمل کا بیان ہی سب کے سامنے آیا جو دراصل طاقتور ٹولے نے تیار کیا تھا۔ یہ بیان سراسر جھوٹ اور دھوکے پر مبنی ہے۔

ہمارے ساتھ ہوتے۔ ایک بار اجمل نے مجھے کہا، میں بالکل بے قصور ہوں۔ مجھے چھنایا گیا ہے مگر یہ جیل بھی ان کی ہے، یہ جج بھی ان کا ہے، سرکاری وکیل بھی ان کا ہے اور میرا وکیل بھی ان کا ہے۔ میں یہاں بالکل تنہا ہوں۔“ جب عباس کاظمی نے عدالت پر زور دیا کہ انھیں اجمل سے تنہائی میں ملنے کی اجازت دی جائے، تو انھیں تبدیل کر دیا گیا۔ اب ایک ہندو کو اجمل کا وکیل بنایا گیا۔ اس کے بعد عدالت نے اپنی کارروائی صرف بیس دن میں نہایت تیزی سے مکمل کرتے ہوئے اجمل کو سزائے موت سنا دی۔

اس امر سے افشا ہے کہ بھارتی جج بھی فوج و خفیہ ایجنسیوں کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ یوں انھوں نے قانون و انصاف کا خون کر دیا۔

اجمل پر چلنے والے مقدمے کی کارروائی اب تک خفیہ ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ دوران مقدمہ کس قسم کے انکشاف سامنے آئے۔ بس بھارتی حکومت اجمل قصاب کی زبان سے پاکستان اور دنیا والوں کو جو کچھ بتاتی رہی، اُسے ہی ”سچ“ قرار دیا گیا۔ بھارت نے حتیٰ کہ پاکستان کے تقشیش کاروں کو بھی اجمل قصاب سے ملے نہیں دیا۔۔۔ یہ سچائی آشکارا کرتی ہے کہ بھارتی فوج کو تقشیش تھا اگر اجمل قصاب کو دنیا والوں کے سامنے لایا گیا، تو بھارت کے گمراہ کن منصوبے کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

بھارت نے نو مقتول دہشت گردوں کے نام تو اجمل قصاب کی وساطت سے پیش کر دیے مگر یہ نہیں بتا سکا کہ وہ پاکستان کے کن شہروں یا قصبوں میں بستے تھے۔ ان نو دہشت گردوں کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہوا اور کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں دفن ہیں۔ گویا یہ نو مقتول انتہائی پر اسرار ہستیاں ہیں جن کی حقیقت کے بارے میں صرف بھارتی حکمران طبقے کا ایک گروہ ہی جانتا ہے۔ اسی طرح جب اجمل قصاب کو پھانسی دی گئی، تو اس کی لاش بھی خفیہ طریقے سے نامعلوم مقام پر دفن دی گئی۔ چونکہ یہ سارا گمراہ کن منصوبہ تھا لہذا یہ ممکن ہے کہ اجمل قصاب اب بھی زندہ اور بھارتی فوج کی کسی کال کوٹھڑی میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار رہا ہو۔

دہشت گردوں کی تعداد بھی محل نظر ہے۔ ۲۷ نومبر ۲۰۰۸ء کو ممبئی کے بعض مقامی اخبارات نے یہ خبریں شائع کی تھیں کہ مختلف مقامات پر کل ۱۶ سے ۲۰ دہشت گرد دیکھے گئے ہیں۔ بھارتی حکومت کے مطابق اجمل نے بھی گرفتاری کے بعد پہلے بیان میں دعویٰ کیا تھا کہ ممبئی پر ۱۶ دہشت گردین نے حملہ کیا ہے لیکن پھر ان کی تعداد گھٹتے گھٹتے دس تک رہ گئی۔

لیفٹیننٹ کرنل (ر) محمد حبیب کی گمشدگی یاد رہے، نیپال روایتی طور پر بھارت کی کٹھ پتلی مملکت رہی ہے۔ اس ملک میں بھی بھارتی خفیہ اداروں کا شکہ چلتا رہا ہے۔ اجمل قصاب کے اغوا سے ملتا جلتا ڈراما حال ہی میں را کے ایجنٹوں نے بڑی عیاری سے کھیلایا۔ ہوا یہ کہ را کے ایجنٹ اپریل ۲۰۱۷ء میں پاک فوج کے ریٹائرڈ افسر، لیفٹیننٹ کرنل محمد حبیب ظاہر کو پُرکشش ملازمت کا جھانسا دے کر نیپال لے گئے۔ وہاں انھیں اغوا کر لیا گیا اور اب تک کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ خیال ہے کہ مستقبل میں را انھیں اپنے کسی عیارانہ اور مذموم منصوبے میں استعمال کر سکتی ہے۔



انیتا ادھائے جس نے دہشت گردوں کو دیکھا

یہ دستاویز ۱۵ جنوری ۲۰۰۹ء کو حکومت پاکستان کے بھی حوالے کی گئی۔ یہ مبینی حملوں سے متعلق واحد بھارتی سرکاری دستاویز ہے جسے منظر عام پر لایا گیا۔

اس دستاویز کی رو سے دس پاکستانی دہشت گرد بڑی کشتی میں سوار ہو کر ممبئی کے ساحل پر اترے۔ سوال یہ ہے کہ کشتی بھینا عمیر العقول طور پر نہایت مضبوط ربڑ سے بنی تھی تبھی اس نے نہ صرف دس آدمیوں کا بوجھ سہارا لیا بلکہ وزنی اسلحہ بھی کشتی میں لاوا گیا تھا۔ شاید یہ خصوصی کشتی تیار کرنے کی خاطر پاکستانیوں نے انتہائی مضبوط بڑا ایجاد کر لیا ہوگا۔

(۲)

دستاویز میں درج ہے کہ کشتی کے بڑکارنگ چمکدار پیلا تھا۔ پکنہ بھی کان کھڑے کرتا ہے۔ چمکدار زرد رنگ دوری سے دیکھا جاتا ہے۔ گواہ دہشت گردوں نے سمندری پانی سے ملتے جلتے رنگ کار بڑ منتخب نہیں کیا بلکہ چمکدار پیلے رنگ کی کشتی میں سوار ہوئے۔ تا کہ انھیں دوری سے دیکھا جاسکے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ سمندری سرحدوں کی حفاظت و چوکیداری پر مامور بھارتی بحریہ سمیت کوئی بھی بھارتی سیکورٹی ایجنسی پاکستان جیسے دشمن ملک کی سمت سے آتی اس چمکدار زرد رنگ والی کشتی کو دریافت نہ کر سکی۔ یہ سیکورٹی ایجنسیاں جدید ترین آلات رکھتی ہیں اور پانیوں پر نظر رکھنے والی کشتیاں، بحری جہاز، تیلی کا پٹر اور ہوائی جہاز بھی! کیا اس کوتاہی کو بھارتی سیکورٹی اداروں کی ناکامی قرار دے کر نظر انداز کرنا ناممکن ہے؟

(۳)

ہم شروع میں بھارتی خاتون انیتا ادھایا (Anita Uddaiya) کا ذکر کر چکے جس نے ساحل پر کشتی سے اترتے ”دہشت گرد“ دیکھے تھے۔ اس کی رو سے کشتی میں چھ لوگ سوار تھے اور انھوں نے مرٹھی میں گفتگو کی تھی۔ انیتا کے مطابق وہ دیکھنے میں بھی ہندو لگتے تھے کہ انھوں نے ہاتھوں میں گہرے

سودے کو تیار کرتے ہوئے بھارتی منصوبہ سازوں سے کس قسم کی غلطیاں ہوئیں اور کیسے بھول رہ گئے۔ ممبئی حملے اہم دینے والے بھی بھارتی دہشت گرد ”کامی کازی“ (Komikazi) تھے، یعنی انھوں نے ملک و قوم کی خاطر یہ مشن انجام دیا اور اپنی زندگیاں بھی داؤ پر لگا دیں۔ ممکن ہے کہ حملہ آوروں کو یہ باور بھی کروایا گیا ہو کہ تہمت کر کرے اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے ہندو مت خطرے میں ہے۔ فاضل حملہ آوروں کی اچھی طرح برین واشنگ کر کے انھیں خود کش حملے کے لیے تیار کیا گیا۔

اس خود ساختہ حملے کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ممبئی پولیس کو بے خبر رکھا جائے۔ اسی لیے عام لوگوں نے بھی پولیس اور ”پاکستانی دہشت گردوں“ کے درمیان مقابلہ ہوتے دیکھے مگر آج بھی کوئی نہیں جانتا کہ ان مقابلوں میں کتنے حملہ آور مرے اور ان کی لاشیں کہاں گئیں۔ صرف کرشماتی طور پر اجمل زندہ پکڑا گیا جس کی زبانی پاکستان کو ہتنام کرنے کی ساری جھوٹی اور بگس داستان سامنے لائی گئی۔

(۱)

بھارتی سرکاری بیان کے مطابق اجمل قصاب اور ابو اسماعیل نے ممبئی کے شیواجی ریلوے اسٹیشن پر حملہ کیا۔ یہ ممبئی کے بڑے اور مرکزی ریلوے اسٹیشنوں میں سے ایک ہے۔ وہ پھر اسٹیشن سے نکل کر کاما اسپتال کی جانب گئے۔ وہاں ان کا دوبارہ پولیس پارٹیوں سے مقابلہ ہوا۔ حیران کن طور پر انہوں نے صرف محفوظ رہے بلکہ انھوں نے تین پولیس افسر مار ڈالے۔ اجمل اور اسماعیل نے پھر ایک کار چھین اور اس کے آریعے گیر گام چوپائی نامی جگہ پہنچے۔ وہاں ان کا پولیس پارٹی سے ایک بار پھر مقابلہ ہوا اور اس بار اسماعیل مارا گیا جبکہ اجمل کو پولیس زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب رہی۔

بھارت کے سیکورٹی و تحقیقی اداروں نے ممبئی حملوں کی تفصیل ۶۹ صفحات پر مشتمل ایک دستاویز میں بیان کی ہے۔

کی تفصیل بہت کم ملتی ہے۔ حتیٰ کہ ممبئی مقدمے کے دوران گواہوں کے بیانات سے بھی چند ہی حقائق سامنے آئے۔ مثال کے طور پر یہ کہ بھارتی اخبارات کی رو سے اجمل نے گرفتاری کے بعد پہلے بیان میں انکشاف کیا: تاج محل ہوٹل میں حملہ کرنے والے دہشت گرد اسے میریٹ ہوٹل (اسلام آباد) کی طرح بم دھماکوں سے اڑانا چاہتے ہیں مگر بعد ازاں ان پاکستانی دہشت گردوں کے قبضے سے صرف ۸ کلوآرڈی ایکس برآمد ہوا۔ (یہ بات اس لیے سامنے آئی کہ مواد کی برآمدگی کے وقت صحافی بھی موجود تھے)، جبکہ میریٹ ہوٹل اسلام آباد کو نشانہ بناتے ہوئے ۶۰۰ کلوآرڈی ایکس استعمال کیا گیا تھا۔

گمراہ کن منصوبے کے بھول اور غلط آئیے اب دیکھتے ہیں کہ ممبئی حملوں کے گمراہ کن

لیفٹیننٹ کرنل محمد حبیب جانی بھپانی شخصیت تھے۔ اس لیے ان کا اغوا میڈیا کی نظریں آگیا مگر اجمل قصاب ایک عام سا پاکستانی نوجوان اور گھر چھوڑ کر بھاگنے والا جھگڑا تھا۔ اس کے لیے کس نے فکر مند ہونا تھا؟ اس لیے نیپال میں اجمل کا اغوا کسی کے نوٹس میں نہیں آیا۔

بھارتی حکومت کے مطابق پاکستانی دہشت گردوں نے کیفے لیو ہولڈ، تاج محل ہوٹل، او برائے ٹرائڈینٹ ہوٹل، نریمان ہاؤس، چترپتی شیواجی مہاراج نامی ریلوے اسٹیشن اور کاما اسپتال کو اپنا نشانہ بنایا۔ یہ سبھی جنوبی ممبئی کے علاقے میں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دوسری جگہوں پر بھی دہشت گردوں اور پولیس کے مابین مقابلہ ہونے لگا۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، بھارتی سیکورٹی اداروں نے اجمل کی زبانی ممبئی حملوں کی کہانی بیان کی ہے۔ گواہ حملوں کا پلان

فوج، راء اور آئی بی کے اعلیٰ دماغوں نے ہی بنایا لیکن مجرم کتنا ہی بوشیارو عیار ہو، جرم کا نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ ممبئی حملوں کے دوران بھی ایسا ہی ہوا۔ ان اعلیٰ دماغوں سے بھی منصوبے میں کچھ بھول رہ گئے۔ ایس ایم اشرف، الین ڈیوڈس اور دیگر محقق بھی بھول دیکھ کر ممبئی حملوں کو بھارتیوں کا اپنا ”کارنامہ“ قرار دیتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ اجمل قصاب کے بیان کا بیشتر حصہ ان سرگرمیوں پر مشتمل ہے جو اس نے بحیثیت دہشت گرد انجام دیں۔ اسی لیے جن جگہوں پر دیگر دہشت گردوں نے حملہ کیا، وہاں پیش آئے واقعات



اجمل قصاب ریلوے اسٹیشن میں

گردوں کی ساری کارروائی ریکارڈ کر لی ہے، لیکن اگلے دن پولیس نے میڈیا کو بتایا کہ مین لائن ٹرمینس میں لگے ۱۶ سی سی ٹی وی کیمرے کام نہیں کر رہے تھے۔ یہ نہایت عجیب اور پر اسرار بات ہے کہ اس رات سبھی ۱۶ کیمرے ناکارہ ہو گئے۔ اسی لیے مین لائن ٹرمینس پر اچھل اور اسماعیل نے کس قسم کی سرگرمیاں انجام دیں، ان کی بابت کچھ علم نہیں۔ شاید وہ ویڈیوز سامنے آنے سے یہ رائے افشا ہو سکتا تھا کہ مین لائن ٹرمینس پر بھی دو ہندو دہشت گرد فائرنگ کر رہے تھے۔

عجیب تر بات یہ کہ تب ریلوے پولیس کا سربراہ کے پی رگھوونشی (K P Raghuvanshi) نامی پولیس افسر تھا۔ یہ افسر کھلم کھلا انتہا پسند ہندو تنظیموں سے تعلقات رکھتا اور مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتا تھا۔ یہ اور بھی زیادہ حیران کن بات ہے کہ یہ مہتمم کر کر کے بعد اسی رگھوونشی کو مہاراشٹر کے ایشیائی ٹیراسکواڈ کا سربراہ بنا دیا گیا۔

یہ یقینی ہے کہ کے پی رگھوونشی نے سی سی ٹی وی کیمروں کی ریکارڈنگ ضائع کر دی۔ جب وہ ایشیائی ٹیراسکواڈ کا سربراہ



کے پی رگھوونشی جو کوڑے کے بعد ایشیائی ٹیراسکواڈ کا سربراہ بنا

(کیر وے) رنگ کے مینڈ پہن رکھے تھے۔ یاد رہے، کیر وے انتہا پسند ہندو تنظیموں کا پسندیدہ مذہبی رنگ ہے۔ ایس ایم اشرف نے اپنی کتاب میں انکشاف کیا ہے کہ انیتا خود گواہی دینے ممبئی پولیس کے پاس گئی تھی۔ پولیس نے اس کا بیان ریکارڈ کر لیا۔ لیکن جب ملٹری انٹیلی جنس اور رائٹابھما کے بیان پہنچا، تو ہلچل مچ گئی۔ وجہ یہ کہ انیتا نے صاف بتایا تھا کہ پاکستانی دہشت گرد بڑی روانی سے مرٹھی بول رہے تھے۔ کوئی پاکستانی سمجھنے میں پانچ چھ سال لگتا، اسی وجہ ایسی روانی سے یہ مشکل زبان بولنا سیکھ سکتے تھے۔

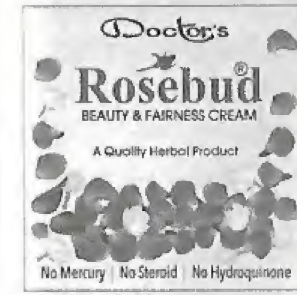
نوج اور راکھ کے باؤ پر پولیس نے انیتا پر زور دیا کہ وہ اپنا بیان بدل دے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ جب پولیس نے دیکھا کہ وہ اصول پرست عورت اپنا بیان بدلنے پر آمادہ نہیں، تو اسے دھمکی دی گئی کہ پولیس کو گمراہ کرنے کے الزام میں اس پر مقدمہ دائر کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد انیتا کو فردہ ہو کر منظر عام سے غائب ہو گئی۔

(۴)

بھارتی پولیس کا کہنا ہے، تمام پاکستانی دہشت گردوں کے پاس سے جعلی بھارتی شناختی کارڈ برآمد ہوئے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ بقول بھارتی پولیس کے اچھل تھاب نے بتایا، ان پر تصاویر اور نام اصلی ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں؟ گو یا بھارتی اداروں کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ حملہ آوروں کی باآسانی شناخت کر سکیں۔

(۵)

ایس ایم اشرف اور الینس ڈیوڈسن نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ ممبئی ریلوے اسٹیشن کے دو بنیادی حصے ہیں: مین لائن ٹرمینس اور سب ایرین ٹرمینس۔ جب اچھل اور اسماعیل ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئے تو رات گئے بھارتی ٹی وی نیٹ ورکس نے اپنے رپورٹروں کی وساطت سے بتایا کہ مین لائن ٹرمینس پر لگے سی سی ٹی وی کیمروں نے دہشت



اکٹی، کیل، مہاسے، چھانچا، جھریاں اور سیاہ ہلکے دور کرتی ہے۔ شوگر کے مریضوں کے پاؤں کی درد، جلن، اکڑاؤ مختلف انجینیا اور پوست پر پڑوسٹر کا شیمی علاج

Doctor's
Unpasteurized, Unfiltered & Living
Natural
APPLE CIDER VINEGAR
With the Mother
100% Natural
روزبڈ شیمپو

DOCTOR'S ROSEBUD CREAM

اپیل سائیز روڈنگر بادام ناریل اور گلاب سے بنا منظرہ شامپو بال گرنے بند خشکی سگری ختم ہال لے گئے اور مضبوط سگری جوؤں کا خاتمہ



آئیے ہم آپ کو اسمارٹ، صحت مند اور توانا بنائیں
موناپے میں جتنا افراد بڑی آسانی سے شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ صحت مند زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو قدرتی طریقہ علاج سے مثلاً ڈاکٹر ز ٹانک، خوراک کنٹرول اور مناسب ورزش سے وزن کم، پیٹ چھوٹا، صحت مند، اسمارٹ، توانا، شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے امراض سے بغیر کسی سائیز ایلیکٹ کے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ کئی مریضوں کو دوای کی بھی ضرورت نہیں رہتی اور وہ دوبارہ آئیڈیل صحت مند زندگی گزارتے ہیں۔
اتوار کے علاوہ شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک اطلاع دے کر تشریف لاسکتے ہیں۔

برائے مشورہ: ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)
کلینک: P-62 مرغزار کا کوئی مٹان روڈ لاہور
0321-8823321, 0336-4167960
doctor health and beauty clinic
Doctor Rosebud Shampoo
برائے رابطہ: حافظہ مشعلی 0321-9785644
www.doctorsons.org
پاکستان بھرتے ڈسٹری بیوٹر درکار ہیں
رابطہ نمبر برائے کراچی، حیدرآباد۔ 0321-2075111

ڈاکٹر اصغر علی (ایم بی بی ایس)
”میں نے ڈاکٹر اصغر علی کی تیار کردہ مصنوعات خصوصاً شیمپو کو بہت مفید پایا ہے۔ اب میرا پورا خاندان یہ شیمپو استعمال کرتا ہے۔ میں اپنے حلقہ احباب میں بھی اس کا تعارف کرواتا اور انھیں استعمال کرنے کا کہتا ہوں۔ یہ شیمپو خواتین کے بالوں کی کئی بیماریوں کا علاج ہے۔“ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی (اردو ڈائجسٹ)

ڈاکٹر ز اپیل سائیز روڈنگر
وزن کم کرتا ہے۔ کو لیسٹرول کنٹرول کرتا ہے۔ جگر اور پیٹ کے بہت سارے امراض کا حل ہے۔ فالٹو چربی ختم کرتا اور اسمارٹ بناتا ہے۔ ڈاکٹر ز اپیل سائیز روڈنگر سو فیصد خالص Unpasteurised, unfiltered, living and the Mother ہے۔ جو پاکستان کے بہت سارے شہروں میں استعمال ہو رہا ہے اور لوگ مثبت رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ز روزبڈ کریم
ڈاکٹر ز روزبڈ کریم میں شامل گلاب، بادام، روغن، ناریل کا تیل، اپیل سائیز روڈنگر اور قیمتی جڑی بوٹیاں خشک اور سرد موسمی میں چہرے کی حفاظت کر کے چہرے کو گلاب کی طرح شاداب، تروتازہ، دلکش اور جاذب نظر بنا کر رنگ بھی گورا کرتی ہے۔

بنا، تو اس نے لیفٹیننٹ کرنل پروہت، میجر اپادھائے، سدھوی پر گیا سنگھ، اسیم آنند اور دیگر اہم انتہا پسند ہندو شخصیات کے خلاف ثبوت بھی ضائع کر دیے۔ یہ ثبوت ہیمنت کر کر کے نے مع ٹیم بڑی محنت و عرق ریزی سے جمع کیے تھے۔

ثبوتوں کی عدم موجودگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم دھاکوں کے سلسلے میں پکڑے گئے ملزموں کے مقدمات میں پولیس کا بیان کمزور پڑ گیا۔ چنانچہ آج لیفٹیننٹ کرنل پروہت ضمانت پر رہا ہو چکا۔ جبکہ مسلمانوں کے دیگر قاتل بھی جیلوں میں نہایت آرام و آسائش سے رہ رہے ہیں۔ اب تو خرید و رمودی جیسے مسلم دشمن کی قیادت میں انتہا پسند ہندو اقتدار میں آچکے۔ لہذا ان کی بھرپور کوشش ہے کہ کسی بھی طرح مقدمات کو کمزور ترین بنا کر ہندو قوم کے تمام ”ہیرو“ رہا کر لیے جائیں۔

(۶)

بھارتی سرکاری بیان کے مطابق اجمل اور اسماعیل رات ۹:۲۰ پر ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئے اور فائرنگ کرنے لگے مگر ایک چشم دید گواہ، بھارت پبلیشنگ ٹرانسٹیکٹا سنا تا ہے۔ اس کی یہ کہانی بھارتی اخبارات میں شائع ہو چکی۔ وہ اسٹیشن میں ”ری فریش فوڈ پلازا“ میں بطور شیف (Chef) کام کرتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ فائرنگ ۹:۵۵ پر شروع ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ بھارتی حکومت نے سرکاری دستاویز میں فائرنگ شروع کرنے کا وقت ۳۵ منٹ پیچھے کیوں کر دیا؟ کیا اس طرح کوئی فائدہ اٹھانا مقصود تھا؟ اسٹیشن پر ادا ایم پالی (Om.Palli) موٹر مین کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ یعنی وہ آنے جانے والی ریلوں کے اوقات نوٹ کیا کرتا۔ اس نے ایک اخباری بیان میں بتایا کہ اس نے آخری گولی چلنے کی آواز ۱۰:۳۲ پر سنی تھی اور پھر اسٹیشن پر خاموشی چھا گئی۔

(۷)

چشم دید گواہوں کے مطابق اجمل اور اسماعیل نے ۹:۵۵ پر بین الاقوامی ٹرمینس میں فائرنگ کا آغاز کیا، لیکن گواہوں کی رو ہی سے اسی وقت سب اربن ٹرمینس پر بھی فائرنگ ہونے لگی تھی۔ بھارتی دستاویز کے مطابق ریلوے اسٹیشن پر دو دہشت گردوں نے حملہ کیا، مگر گواہوں کے بیان کی روشنی میں عیاں ہے کہ ریلوے اسٹیشن پر دو سے زیادہ شاید چار دہشت گرد موجود تھے۔ یہ زائد دہشت گرد کون تھے؟ کہاں سے آئے اور کدھر چلے گئے؟ بھارتی حکومت نے سرکاری دستاویز میں ان کا کوئی ذکر کیوں نہیں کیا؟ اس کا مطلب ہے کسی سی ٹی وی کیمروں کی ریکارڈنگ اس لیے بھی تلف کی گئی تاکہ اسٹیشن پر دو سے زائد دہشت گرد رو یافت نہ ہو سکیں۔

(۸)

بھارتی حکومت کے مطابق سب اربن ٹرمینس پر لگے سی سی ٹی وی کیمرے کام کر رہے تھے۔ انہی میں سے ایک کیمرے کی ویڈیو بھارتی حکومت نے دنیا والوں کے سامنے پیش کی۔ اس ویڈیو میں اجمل اور اسماعیل ریلوے اسٹیشن میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، مگر اس ویڈیو میں تاریخ اور وقت موجود نہیں جو اسے نہایت مشکوک بنا ڈالتے ہیں۔

یہ ویڈیو واحد ٹھوس ثبوت ہے کہ اجمل ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا، مگر ویڈیو پر تاریخ اور وقت کی عدم موجودگی ثبوت کو کمزور بنا دیتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ رام منی مائوں سے قبل یا بعد میں اجمل کو ریلوے اسٹیشن نے لگی اور اسے گھماتی پھراتی رہی۔ ویڈیو کی رو سے سب اربن ٹرمینس بالکل خالی ہے اور وہاں ایک بھی ڈی سی جنس نظر نہیں آتا۔

بھارتی اخبارات کے مطابق اجمل نے اپنے مسلمان وکیل کو بتایا تھا کہ درج بالا ویڈیو میں وہ موجود نہیں بلکہ اس کا بہروپ بھر کر کوئی اور اسٹیشن پر گھوم رہا ہے۔ اس ویڈیو کی تصاویر کے علاوہ نیٹ پر اجمل کی ایسی تصاویر بھی موجود ہیں

جن میں اس کی سامنے سے شکل دکھائی دیتی ہے۔ اگر ویڈیو والے اجمل اور ان تصویروں والے اجمل کا موازنہ کیا جائے، تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ دونوں کی شکل و صورت مختلف ہے۔ گویا ریلوے اسٹیشن پر نہتے شہریوں کو اندھا دھند گولیاں مارتا دہشت گرد پاکستانی اجمل نہیں بلکہ کوئی ہندو نوجوان تھا، مگر بھارتی سیکورٹی اداروں نے جس اجمل کو عدالت میں اور صحافیوں کے سامنے پیش کیا، وہ نیپال سے آوا

(۹)

بھارتی حکومت کی پیش کردہ ویڈیو میں اجمل اور اسماعیل فلائیں میں زرد رنگ کے بیٹھ پینڈ دکھائی دیتے ہیں۔ بتایا جا چکا کہ یہ زرد رنگ انتہا پسند ہندو تنظیموں کی پسندیدہ مذہبی علامت ہے۔ وہ اسی رنگ کے جھنڈے بناتے اور پکڑیاں، لباس وغیرہ مذہبی رسومات میں پہنتے ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ اپنی شناخت پوشیدہ اور انتہا پسند ہندوؤں کو بدنام کرنے کی خاطر اجمل اور اسماعیل نے زرد رنگ کے بیٹھ پہنے، مگر انھیں اپنا مسلم شخص چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ممبئی میں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ اسی لیے کرتے پاجامے اور شلوار میں لباس مسلمان وہاں اکثر دکھائی دیتے ہیں۔

یہ عین ممکن ہے کہ گمراہ کن منصوبے یا فالز فلیگ حملے میں جن بھارتی خود کش حملہ آوروں نے ریلوے اسٹیشن پر دھاوا بولا وہ کسی مستند ہندو انتہا پسند تنظیم سے تعلق رکھتے ہوں۔ انھوں نے اپنا جوش و جذبہ بڑھانے کی خاطر اپنی مذہبی علامت، گیر وے رنگ کے بیٹھ کاپیوں پر چڑھا لیے۔ تب ان کے ”ہینڈ لروں“ کو یہ خیال نہیں رہا کہ بعد میں یہ زرد رنگ کے بیٹھ مغالطہ اور خرابی پیدا کر سکتے ہیں۔

(۱۰)

بھارتی سرکاری بیان کے بموجب تمام دس دہشت گرد

بذریعہ سمپلائٹ فون اور وائس اور انٹرنیٹ پر ڈنکو کول (VOIP) کے ذریعے کراچی میں قائم کنٹرول روم سے رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ بھارتی حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہاں حافظ محمد سعید اور لشکر طیبہ کے دیگر لیڈر موجود تھے۔ بھارت نے دہشت گردوں اور کنٹرول روم میں بیٹھے ”ہینڈ لروں“ کی بات چیت کا ریکارڈ بھی پاکستان کے حوالے کر رکھا ہے۔

لیکن اب تو عام شخص بھی رقم خرچ کر کے ایسے آلات خرید سکتا ہے جن کی مدد سے کسی بھی آواز کو تبدیل یا تخلیق کرنا اور اسے من پسند ہیئت دینا ممکن ہے۔ بھارتی فوج کو تو پھر امریکا اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں کی مدد حاصل ہے جو جاسوسی کے ایسے ایسے جدید ترین اور حیرت انگیز آلات رکھتی ہیں جن کی بابت عام لوگ جانتے تک نہیں۔

بہر حال بات چیت کے اس ریکارڈ کی رو سے پاکستان میں بیٹھے منصوبہ سازوں نے ممبئی میں گھومتے پھرتے اپنے فدا بین کو ہدایت دی کہ مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ نہیں بنانا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اجمل اور اسماعیل نے اس ہدایت کو نظر انداز کر دیا۔

ان کی بے دریغ فائرنگ سے ریلوے اسٹیشن پر ۵۸ افراد ہلاک ہوئے۔ ان میں سے ”۲۲“ مسلمان تھے۔ اکثر مسلمانوں نے اسلامی لباس زیب تن کر رکھے تھے اور دوری سے پتا چل جاتا کہ وہ مسلمان ہیں۔ مقتولین میں دلی اللہ نامی مسلمان کے چھ اہل خانہ شامل تھے۔

حقائق سے عیاں ہے کہ اجمل اور اسماعیل نے دانستہ مسلمانوں کو نشانہ بنایا حالانکہ انھیں ایسا نہ کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ یہ سچائی آشکارا کرتی ہے کہ ریلوے اسٹیشن پر فائرنگ کرنے والے ہندو تھے جنہوں نے دانستہ مسلمانوں پر گولیاں برسائیں تاکہ ان کی اکثریت ماری جائے۔

(۱۱)

بھارت نے پاکستان کو جو دستاویز دی، اس میں درج

ہے کہ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر اجمل اور اسماعیل کاما اسپتال کی جانب چلے گئے۔ یہ اسپتال ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی واقع ہے۔ وہاں یکے بعد دیگرے دو پولیس پارٹیوں سے ان کا مقابلہ ہوا۔ بھارتی رپورٹ میں یہ بات گول کر دی گئی کہ دو دہشت گردوں نے کاما اسپتال کے اندر جا کر پہلی پولیس پارٹی سے مقابلہ کیا تھا۔ اس مقابلے کے عینی شاہدین موجود ہیں اور جس کی رپورٹ اگلے دن تمام بھارتی اخبارات میں بھی شائع ہوئی۔

اس رپورٹ کے مطابق دو دہشت گرد کاما اسپتال کے اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے وہاں کھڑے دو چوکیدار مار ڈالے۔ تیسرا چوکیدار سول کپڑوں میں لمبوس تھا۔ اس نے مراٹھی زبان میں ان کے ساتھ گفتگو کی اور کہا کہ اس کی مریضہ ماں اسپتال میں زیر علاج ہے لہذا اسے بخش دیا جائے۔ دہشت گردوں نے اُسے گولیاں نہیں ماریں۔

دہشت گردوں نے پھر عملے کے ایک آدمی سے پانی منگوا یا اور پھر اسے بھی گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ پھر لفٹ کے ذریعے اسپتال کی سب سے بالائی منزل پر چلے گئے جو خالی تھی۔ انھوں نے لفٹ میں، فہمی کویر غمال بنالیا۔ بیس بجیس منٹ بعد وہاں چھ تا آٹھ پولیس والوں پر مشتمل ایک پارٹی آ پہنچی۔ عملہ اسپتال میں شامل ایک شخص انھیں سیڑھیوں کے راستے اوپر لے گیا۔ ایک سپاہی نے اسٹیل کے ٹکڑے سے چھٹی منزل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد فہمی اندر سے برآمد ہوا اور اس نے پولیس پارٹی کو بتایا کہ اندر دہشت گرد موجود ہیں۔

اس کے بعد دہشت گردوں اور پولیس کے مابین گولیاں چلنے لگیں۔ یہ مقابلہ تیس چالیس منٹ جاری رہا۔ اس لڑائی میں پولیس پارٹی کا افسر، سدھانند دتے زخمی ہو گیا۔ حیران کن طور پر اس لڑائی کے بعد دونوں دہشت گرد سات آٹھ سپاہیوں کی موجودگی میں بھی اسپتال سے فرار ہونے میں

کامیاب ہو گئے۔ یہ امر راز ہی ہے کہ وہ کیونکر فرار ہوئے؟ اہم بات یہ کہ اگر وہ اجمل اور اسماعیل ہی تھے، تو روانی سے مراٹھی بول سکتے تھے۔ اسپتال میں ان سے گفتگو کرنے والے لوگ اس بات کے چشم دید گواہ ہیں۔

سوال یہ ہے کہ دونوں دہشت گرد اسپتال کی بالائی منزل میں کیا کرنے گئے تھے اور وہاں انھوں نے کیوں پوزیشن سنبھالی؟ کیا اس لیے کہ وہاں سے کاما اسپتال کی پچھلی گلی صاف دکھائی دیتی تھی جہاں عنقریب ممبئی پولیس کے تین فرض شاس پولیس افسر... کر کرے، سانسکر اور اشوک کاسنتے آنے والے تھے؟

دوسری اہم بات یہ کہ بھارتی دستاویز میں دونوں دہشت گردوں کی سرگرمیوں کا ذکر کیوں نہیں کیا جو کاما اسپتال کے اندر انجام پائیں؟ کیا اسی لیے کہ دونوں دہشت گرد مراٹھی زبان بول رہے تھے۔ جبکہ بھارتی حکومت شہرمد سے زور دے رہی تھی کہ یہ حملے پاکستانی دہشت گردوں نے کیے ہیں لہذا مراٹھی بولنے والے دہشت گردوں کا تذکرہ ان کے زور بیان کو متاثر کر دیتا۔ اسی لیے یہ واقعہ ہی اڑا دیا گیا کہ دو دہشت گرد کاما اسپتال کے اندر داخل ہوئے تھے۔

(۱۲)

عینی شاہدین کے مطابق ۱۰:۳۲ تک ریلوے اسٹیشن سے دہشت گرد جا چکے تھے۔ بھارتی سرکاری رپورٹ کے مطابق وہاں اجمل اور اسماعیل موجود تھے جو کاما اسپتال کی جانب چلے گئے۔ وہاں تک پہنچتے ہوئے بمشکل دس منٹ لگتے ہیں۔ گویا ۱۰:۵۰ تک دونوں دہشت گرد کاما اسپتال پہنچ چکے تھے۔

کاما ایک سرکاری اسپتال ہے۔ وہاں عام طور پر غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین اور بچوں کا علاج ہوتا ہے۔ یہ امر سمجھ سے باہر ہے کہ پاکستانی دہشت گردوں نے

فریبوں کے لیے مخصوص ایک علاج گاہ کو اپنا ٹارگٹ کیوں بنایا؟ یہی نہیں، وہ ایک گھنٹے تک وہاں موجود رہے اور اس دوران ان کا پولیس پارٹی سے مقابلہ بھی ہوا۔

ایک گھنٹے تک اسپتال میں دہشت گردوں کی موجودگی ایک چشم دید گواہ، ماروتی پھد (Maruti Phad) کے بیان سے عیاں ہے۔ وہ ممبئی حکومت کے میڈیکل ایجوکیشن سیکرٹری کا سرکاری ڈرائیور تھا۔ وہ کاما اسپتال کی پچھلی گلی کا رہائشی تھا جہاں سرکاری رپورٹ کے مطابق کر کرے وغیرہ کو گولیاں ماریں گئیں۔

۲۸ نومبر ۲۰۰۸ء کے دن ماروتی نے مشہور بھارتی ٹی وی، این ڈی ٹی وی (NDTV) کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا "رات ۱۱:۳۰ پر مجھے صاحب کی کال موصول ہوئی کہ کار لے کر ان کے گھر چلے آؤ۔ جب میں اپنی گلی سے نکل رہا تھا، تو وہاں فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک گولی میرے ہاتھ پر بھی لگی۔ میں نے تیزی سے کار روکی اور یوں دم سادھے پڑ گیا جیسے میرے چمک۔ اس ہوشیاری کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔" ماروتی نے بیان کے آخر میں بتایا "اس وقت کر کرے کی گاڑی میرے پیچھے تھی۔"

سوال یہ ہے کہ اگر کاما اسپتال میں چھپے اجمل اور اسماعیل تھے تو دونوں میں کیا پلٹ کیسے آئی؟ ریلوے اسٹیشن پر تو وہ ہماروں طرف اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے لیکن پھر فریبوں کے ایک اسپتال میں جا چھپے؟ اگر وہ مریموں کو یہ فرماں بنانا چاہتے تھے، تو انھوں نے بالائی خالی منزل میں جا کر پوزیشن کیوں سنبھالی؟ کیا وہ دانستہ پولیس پارٹی سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے؟ یا پھر کر کرے اور ان کے ساتھی اصل نشانہ تھے؟

(۱۳)

ڈی این اے (DNA) بھارت کا ممتاز میڈیا نیٹ ورک ہے۔ ۲ دسمبر ۲۰۰۸ء کو ڈی این اے نے ایک رپورٹ شائع کی۔ اس رپورٹ کے مطابق ایک اے ایس

آئی، درگوڑے (Durgude) سینٹ زیویر (Xavier) کالج کے باہر تعینات تھا۔ یہ کالج کاما اسپتال کی پچھلی گلی کے اس اختتام پر واقع ہے جہاں وہ مہاپالکار ڈوڈا می سڑک سے ملتی ہے۔ یہ بتاتے چلیں کہ کاما اسپتال کے پیچھے سے گزرنے والی گلی کا نام بدرالدین طیب جی مرگ ہے۔

رپورٹ کے مطابق اے ایس آئی درگوڑے نے دو نوجوانوں کو دیکھا جو صورت شکل سے طالب علم لگتے تھے۔ اس نے انھیں روکا اور بتایا کہ کاما اسپتال میں دہشت گردوں اور پولیس کے مابین مقابلہ جاری ہے لہذا وہ وہاں سے فوج کر ہو جائیں۔ جب دونوں نوجوان وہیں منڈلاتے رہے، تو اے ایس آئی نے زبردستی انھیں بھگانا چاہا۔ اس پر ایک نوجوان نے لباس میں چھپائی اے کے ۳۷ رائل نکالی اور درگوڑے کو گولیاں مار دیں۔ وہ وہیں چل بسا۔

سوال یہ ہے کہ اگر کاما اسپتال میں اجمل اور اسماعیل پولیس پارٹی سے مقابلے کر رہے تھے، تو یہ دونوں نوجوان دہشت گرد کون تھے؟ ظاہر ہے، وہ اس خود کش اسکوڈ کا حصہ تھے جس نے تہمت کر کرے اور ان کے ساتھیوں کو ہلاک کرنا تھا۔

(۱۴)

بھارت کے سرکاری بیان کی روشنی میں تہمت کر کرے اپنی ٹیم کے ساتھ ٹی پولیس افسر، سدھانند دتے کو دیکھنے اپنے دفتر سے کاما اسپتال کی جانب روانہ ہوئے۔

ممبئی حملوں کے بعد کانگریسی حکومت میں شامل اقلیتی امور کے وزیر، اے آر انطو نے یہ نقطہ اعتراض اٹھایا کہ کاما اسپتال میں دہشت گردوں نے مریموں کو یہ فرماں نہیں بنایا تھا۔ پھر ایشی ٹیر اسکوڈ کے سربراہ مع اپنی ٹیم کے کاما اسپتال کیوں گئے؟ انھیں تو تاج محل یا او برائے ہوٹل جانا چاہیے تھا جہاں دہشت گردوں اور پولیس کے مابین لڑائی جاری تھی۔ جبکہ سدھانند دتے کے زخمی ہونے کے بعد جلد

ہی دہشت گرد فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ نقطہ اعتراض واضح کرتا ہے کہ کسی شخصیت نے تہمت کر کر کے کو یہ پیغام دیا کہ وہ مع ٹیم کا ما اسپتال پہنچ جائیں۔ یہ کون شخصیت تھی جس کا پیغام کر کر کے کو تسلیم کرنا پڑا؟

(۱۵)

بھارتی سرکاری دستاویز کے مطابق اجمل نے اپنے بیان میں بتایا:

”جب ہم دونوں کا ما اسپتال سے باہر آئے، ہم نے ایک پولیس گاڑی دیکھی۔ ہم جلدی سے جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے جو قریب ہی تھیں۔ اس کے بعد ایک اور گاڑی گزری جو کچھ دور جا کر رک گئی۔ اس گاڑی سے ایک پولیس افسر نکلا اور ہم پر گولیاں چلانے لگا۔ اس کی ایک گولی میرے ہاتھ پر لگی اور میری اس کے ۳۴ رائل گر پڑی مگر اسماعیل نے اس پر اور کار میں بیٹھے دیگر لوگوں پر فائرنگ کر دی اور انھیں مار ڈالا۔ اسماعیل نے پھر لاشیں باہر نکالیں، مجھے گاڑی کے اندر بٹھایا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ پھر ایک جگہ گاڑی کا نائز پکچر ہو گیا۔ ہم نے گاڑی وہیں چھوڑی اور ایک دوسری کار پکڑ لی۔“

سرکاری بیان کے مطابق یہ دونوں دہشت گرد پھر گرام چوپائی نامی جگہ پہنچے۔ وہاں تیسری پولیس پارٹی سے ان کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں اسماعیل مارا گیا جبکہ اجمل زندہ پکڑا گیا۔ تہمت کر کر کے کی موت کا یہ پہلا نمونہ یا ورژن ہے جو اجمل قصاب کی زبانی بھارتی سرکاری بیان کا حصہ بنا۔

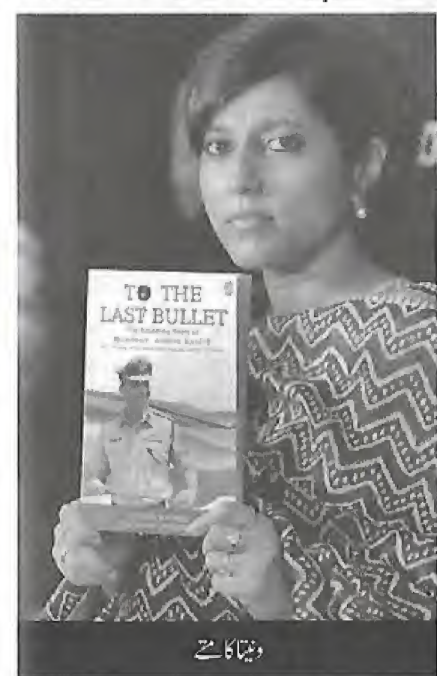
(۱۶)

دوسرا بیان ارؤن جدیو (Arun Jahdavi) نامی سپاہی کی طرف سے آیا۔ اس بیان کی رو سے تہمت کر کر کے کی گاڑی میں سائیکس اور اشوک کا متے کے علاوہ چار سپاہی بھی سوار تھے۔ ان میں سے صرف ایک سپاہی، ارؤن جدیو ہی زندہ

بچ سکا۔ اس ارؤن جدیو نے مختلف مواقع پر بھارتی میڈیا کو مختلف بیانات دیے اور یوں ممبئی حملوں کو شکوک بنا ڈالا۔ ارؤن جدیو نے پہلے بتایا کہ وہ رنجی سدھانندوے کو دیکھنے جا رہے تھے پھر ایک اور چھیل میں بیان دیا کہ ہم ایک سرخ رنگ کی کار تلاش کر رہے تھے، جس میں دہشت گرد سوار تھے۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس نے انھیں بتایا کہ دہشت گرد سرخ کار میں سوار ہیں؟

(۱۷)

ارؤن جدیو نے پہلے بیان میں کہا کہ گاڑی میں کر کر کے دوسری نشست پر سوار تھے۔ پھر دوسرے میں دعویٰ کیا کہ وہ کانٹے کے ساتھ نشستوں کی پہلی قطار میں بیٹھے تھے۔ اسی طرح ارؤن جدیو نے پہلے بتایا، شروع میں سائیکس ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے تھے۔ پھر انھوں نے گاڑی رکوائی اور



دنیا کا متے

ارؤن جدیو تک سیٹ میں بیٹھ گئے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ سائیکس ایک تجربے کار پولیس افسر تھے۔ کیا انھیں یہ زیب دیتا تھا کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر دہشت گردوں کو کھلی چھوٹ دے دیتے کہ آؤ اور آسانی سے مجھے گولیاں مار ڈالو؟

(۱۸)

ارؤن جدیو کے بیان کی رو سے دودھشت گرد بدرالدین طیب جی مرگ کی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ جب گاڑی وہاں پہنچی، تو وہ بائیں (Left) طرف سے اس پر فائرنگ کرنے لگے۔ اگرچہ بات درست ہے تو ارؤن کے دماغ میں بازو پر دو گولیاں کیسے لگیں۔ جبکہ اس گلی میں جھاڑیاں بھی صرف دائیں طرف آگی ہوئی ہیں۔ ان جھاڑیوں کے آگے خاردار جالی لگی ہے۔ اس جالی کو پھلانگ کر ہی جھاڑیوں میں چھپا جاسکتا ہے۔

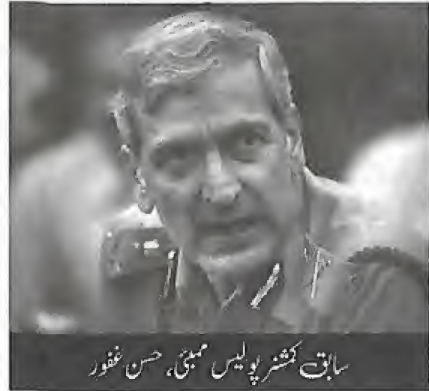
(۱۹)

مقتول ایڈیشنل پولیس کمشنر اشوک کا متے کی بیگم، دنیا کا متے (Vinita Kamta) وکیل ہیں۔ جب شوہر قتل ہو چکا، انھوں نے بعد ازاں یعنی شاہدین سے انٹرویو کیے۔ پھر وہ پولیس افسروں سے بھی ملنے میں کامیاب رہیں۔ اس تحقیق اور ہماک دوڑ کے بعد انھیں جو معلومات حاصل ہوئیں، اس کا اعلان یہ ہے:

اس وقت ایک مسلمان، حسن غفور ممبئی پولیس کے کمشنر تھے۔ جب حملوں کا آغاز ہوا، تو وہ تاج محل ہوٹل چلے گئے کہ وہاں جاری پولیس آپریشن کی قیادت کر سکیں۔ انھوں نے جانے سے پہلے پولیس کنٹرول روم جوائنٹ کمشنر پولیس (گرامم براچ) راکیش مریا (Rakesh Maria) کے سپرد کر دیا۔

دنیا کا متے کے سامنے اشوک کا متے اور حسن غفور کی کہانی ہوئی تھی۔ غفور نے انھیں تاج محل ہوٹل آنے کو کہا

تھا۔ لیکن پھر وہ کا ما اسپتال کیسے پہنچے؟ راکیش مریا نے دنیا کو بتایا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، لیکن جب دنیا نے پولیس کال لاگرتک رسائی پائی تو ج سامنے آ گیا۔ پولیس



سابقہ کمشنر پولیس ممبئی، حسن غفور

کال لاگرتک کے مطابق راکیش نے اشوک کو کا ما اسپتال کی طرف جانے کا کہا تھا۔ تب تک تہمت کر کر کے کا ما اسپتال کے پیچھے واقع گلی میں پہنچ چکے تھے۔ اس وقت اسپتال کے ایمر پولیس پارٹی اور دہشت گردوں کے مابین مقابلہ جاری تھا۔

۱۱:۲۴ پر کر کر کے نے پولیس کنٹرول روم فون کر کے کہا کہ کا ما اسپتال کے مرکزی دروازے پر ایک پولیس پارٹی بھجوائی جائے۔ یوں کر کر کے اسپتال کے گرد گھیراؤ لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے ۱۱:۲۸ پر دوبارہ فون کر کے کہا کہ پولیس پارٹی کا بھجوائی جائے۔ کا ما اسپتال سے دو تاج پانچ منٹ کی ڈرائیو پر تین پولیس اسٹیشن واقع ہیں مگر کہیں سے پولیس پارٹی کا ما اسپتال نہیں بھجوائی گئی۔

کک آنے کے بجائے پشاورے لیے دونو جوان سینٹ زبویہ کالج کے نکلے پر نمودار ہوئے جہاں بدرالدین طیب جی لین ختم ہوئی تھی۔ ۱۱:۳۵ پر انھوں نے وہاں کھڑے اسے ایس آئی درگڑے کو گولیاں مار کے ہلاک کر دیا۔ اسی دوران

مارو قی پھد وہاں سے گزرا تو انھوں نے اس کی گاڑی پر بھی فائرنگ کی۔ وہ شاید اسے کر کے کی گاڑی سمجھے۔

مارو قی پھد کا فلیٹ اسی لین کے وسط میں واقع ہے۔ اس عمارت کے دیگر فلیٹوں سے بھی کئی لوگ یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ ان لوگوں نے پولیس کنٹرول روم فون کیے مگر کوئی امداد نہ پہنچی۔ یعنی شاہدین کے مطابق دونوں دہشت گرد وہاں پندرہ منٹ تک آزادانہ گھومتے پھرتے رہے۔

رات بارہ بجے کر کے، کاسٹے اور سائلر ایک گاڑی میں بیٹھے۔ انھوں نے وہاں کھڑے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ گھوم کر کاما اسپتال کے مرکزی دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ تینوں افسر اسپتال میں پھرتے رشی پولیس والوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ تب تک علاقے کے رہائشی ہی نہیں آزاد میدان پولیس اسٹیشن کے دو کانٹیل بھی کنٹرول روم فون کر کے اطلاع دے چکے تھے کہ سینٹ زیویر کالج کے قریب دو مسلح دہشت گرد موجود ہیں۔ لیکن کنٹرول روم سے تینوں افسروں کو ان کی موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔

۱۲:۰۴ پر کالج کے نزدیک چھپے دہشت گردوں نے تینوں افسروں کی گاڑی پر گولیوں کی بارش کر دی۔ یعنی شاہدین کا کہنا ہے کہ گاڑی سے ایک پولیس افسر اتر کر دہشت گردوں پر فائرنگ کرنے لگا۔ ایک دہشت گرد کے ہاتھ میں گولی لگی اور اس سے گن چھوٹ گئی۔ اس دوران وہاں سے ایک پولیس گاڑی گزری جس کی جی جی بل بھڑکی تھی مگر وہ وہاں رکے بغیر آگے نکل گئی۔ اس میں سوار پولیس والوں نے دتو زخمی کر کے، کاسٹے اور سائلر کی مدد کی اور نہ ہی دہشت گردوں کو لالکارا۔

آخر ۱۲:۳۷ پر تینوں زخمی افسر ایک پولیس گاڑی میں اسپتال پہنچائے گئے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ مر چکے تھے۔ ۱۲:۵۶ پر حسن غفور نے کنٹرول روم فون کر کے پوچھا کہ کر کے اور کاسٹے کہاں ہیں؟ راکیش نے جواب دیا کہ وہ ان

کی بابت کچھ نہیں جانتا۔ حالانکہ پولیس کال لاگزشہادت دیتی ہیں کہ دونوں کاما اسپتال کے پچھوڑے موجود تھے۔

بھارتی حکومت نے رام پردھان نامی ایک کمیٹی بنائی تھی تاکہ وہ انٹیلی جنس کی ناکامی کا جائزہ لے سکے۔ ویتنا کاسٹے اس کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر درجن بالا حقائق پیش کرنا چاہتی تھیں مگر انھیں اجازت نہیں ملی۔ وہ روپیٹ کر خاموش ہو گئیں۔

ایک سابق پولیس افسر، وائی پی سنگھ (Y.P.Singh) کا کہنا ہے کہ رام پردھان کمیٹی نے ”وسل بلوئرز“ کو تو مجرم ٹھہرایا جبکہ اصل مجرم معاف کر دیے گئے۔ حسن غفور نے راکیش سمیت ان حرام پولیس افسروں کو معطل کر دیا تھا جنہوں نے کاما اسپتال کی طرف ملک نہیں بھجوائی تھی۔

لیکن رام پردھان کمیٹی نے حسن غفور کو اس بات پر تنقید کا نشانہ بنایا کہ وہ کنٹرول روم پچھوڑ کر تاج محل کی طرف چلے گئے؟ حالانکہ وہ ایسا کرنے کے مجاز تھے۔ بہر حال اس عمل کو کوتاہی قرار دے کر حسن غفور کو عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ کمیٹی نے راکیش سمیت کسی دوسرے پولیس افسر کو قصور وار نہیں ٹھہرایا۔ گویا کمیٹی نے حسن غفور کو قربانی کا بکرا بنا کر بقیہ پولیس افسر غلطی سے بری الزمہ قرار دے ڈالے۔

ویتنا کاسٹے کی تحقیق و تفتیش بتاتی ہے کہ جب کاما اسپتال میں دو دہشت گردوں اور پولیس پارٹی کے مابین مقابلہ جاری تھا، تو اسی دوران کر کے، کاسٹے اور سائلر کو کالج کے قریب نشانہ بنایا گیا۔ گویا ان تینوں پر حملہ کرنے والے دہشت گرد کوئی اور تھے۔

تفتیش یہ بھی عیاں کرتی ہے کہ گاڑی میں صرف وہ تین پولیس افسر ہی سوار تھے۔ گویا اردن حد یو کا یہ بیان غلط ہے کہ گاڑی میں اس سمیت چار سپاہی بھی سوار تھے۔ مزید برآں یہ کہ کر کے اور بدرالدین طیب جی لین میں رہائش پذیر لوگ مسلسل کنٹرول روم فون کر کے ملک مانگتے رہے مگر وہ

نہیں بھیجی گئی۔ ظاہر ہے، جب بھارتی فوج، را اور آئی بی نے کر کے اور ان کے دونوں ساتھیوں کو ہر قیمت پر قتل کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا، تو ملک کیوں روانہ کی جاتی؟

(۲۰) مہمنت کر کے جب اپنے دفتر سے نکلے تو وہ بلٹ ہروف جیکٹ پہن رہے تھے۔ اس بات کے کئی مینی شاہدین موجود ہیں۔ نیز اس موقع پر آئی بی این (IBN) نیٹ ورک کے کمرہ میں نے ویڈیو بھی بنائی تھی، مگر جب ان کی لاش اسپتال پہنچی، تو وہ جیکٹ غائب تھی۔ شروع میں پولیس نے بتایا کہ اسپتال کے ایک خاکروب نے جیکٹ پھینک دی مگر مقتول کی بیگم، کویتا کر کے کی تحقیق و تفتیش سے یہ خبر جھوٹی ثابت ہوئی۔

ایس ایم اشرف، الین ڈیوڈن اور دیگر محققوں کا کہنا ہے کہ سینٹ زیویر کالج کے باہر کھڑے دہشت گردوں کا تعلق ملٹری پولیس یا عام پولیس سے تھا۔ ان کی چلائی گئی ایک گولی کر کے کی بلٹ ہروف جیکٹ میں پھنس گئی جو کسی طور نہ نکل سکی۔ اسی لیے جیکٹ ہی کو غائب کر دیا گیا۔ وہ گولی اگر کر کے کے کسی ساتھی کو مل جاتی، تو گمراہ کن منصوبے کا راز فاش ہو جاتا۔

(۲۱) بھارتی حکومت کا بیان یہ ہے کہ کاما اسپتال سے نکل کر اچھل اور اسماعیل نے کر کے کو قتل کیا اور پھر ان کی گاڑی میں سوار ہو کر میٹر وچکشن پہنچ گئے۔ یہ چوک کاما اسپتال کے قریب ہی واقع ہے۔ وہاں ان کی گاڑی پتھر ہو گئی اور وہ دوسری کار پر سوار ہو کر گام چوپائی کی طرف چلے گئے۔

لیکن ۲۸ ستمبر ۲۰۰۸ء کی صبح بھارتی اخبارات میں بھی خبریں کچھ اور ہی کہانی بیان کرتی ہیں۔ ان کے مطابق میٹر وچکشن میں کار سواروں نے چاروں طرف فائرنگ کی تھی اور پھر فرار ہو گئے۔ خبروں سے بھی زیادہ پراسرار اور حیرت

انگیزہ ویڈیو ہے جو شہر بھارتی نیٹ ورک سی این این۔ آئی بی این (CNN-IBN) کے ایک رپورٹر نے میٹر وچکشن پر اتاری تھی۔

(۲۲) آئی بی این کی یہ ویڈیو مہمنت کر کے کے قتل کا تیسرا نمونہ سامنے لاتی ہے۔ یہ ویڈیو ۲۷ نومبر ۲۰۰۸ء کی رات دکھائی گئی تھی۔ ویڈیو کے آغاز میں رپورٹر بتاتا ہے کہ شروع میں پولیس نے میڈیا کو بتایا کہ کر کے تاج محل ہوٹل کے نزدیک مارے گئے ہیں۔ پھر پولیس اس خبر سے پیچھے ہٹ گئی۔ اگر یہ خبر غلط تھی، تو اسے میڈیا تک کیوں پہنچایا گیا؟ کیا یہ خبر اس لیے بدل گئی کیونکہ یعنی شاہدین نے کر کے کو نہیں کسی اور کو مرتے دیکھا تھا؟

اس ویڈیو میں آگے چل کر دکھایا جاتا ہے کہ گیسوے رنگ کا لباس پہنے دو نوجوان کر کے کو ایک گاڑی میں ڈال رہے ہیں۔ رپورٹر بتاتا ہے ”شاید کر کے پولیس والوں کی امداد دھند فائرنگ کا نشانہ بن گئے ہیں۔ رپورٹر کا یہ بھی کہنا ہے کہ دو کاروں... بیوٹا کانس اور ہونڈا اسٹی میں سوار لوگ بے دریغ فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ لوگ کون تھے؟

ویڈیو میں دیکھا جاسکتا ہے کہ گیسوے لباس میں لمبوس ایک نوجوان کے ہاتھ سے خون نکل رہا تھا۔ کیا وہی نوجوان تھا جس نے کر کے اور ان کے ساتھیوں سے مقابلہ کیا؟ مگر وہ اچھل تو نہیں تھا۔ یہ دونوں نوجوان کون تھے؟ کہاں سے آئے اور کہاں چلے گئے؟ اسی ویڈیو کی ایک خاص بات یہ ہے کہ کر کے کے چہرے اور بالائی جسم پر خون اور زخم کے نشان دکھائی نہیں دیتے بلکہ لگتا ہے کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں ہیں، مگر جب ان کی اٹھی لوگوں کو دکھائی گئی، تو کر کے کے چہرے پر تشدد کے واضح نشان تھے۔ جبکہ ان کا بالائی جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔

یہ عین ممکن ہے کہ انتہا پسند ہندوؤں نے کر کے کو اغوا

کر کے انھیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر نہایت اذیت ناک طریقے سے مارا دیا گیا۔ دراصل اس طرح طاقتور انتہا پسند ہندو ٹولہ سبھی سرکاری افسروں کو خیردار کرنا چاہتا تھا کہ آئندہ ان کے دہشت گردی والے نیٹ ورک کے خلاف کوئی افسر چھان بین کرنے کی ہمت نہ کرے ورنہ اس کا بھی کرکرے جیسا شہر ہوگا۔ یاد رہے، ہمت نہ کرے اور ان کے دو ساتھی ممبئی پولیس کے واحد اعلیٰ افسر تھے جنہوں نے دہشت گردوں سے دو ہندو مقابلہ کیا اور اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

(۲۳)

بھارتی حکومت کے مطابق گرگام چوپائی کے مقام پر اجمل اور اسماعیل کا مقابلہ ایک پولیس پارٹی سے ہوا۔ اس مقابلے میں اسماعیل مارا گیا جبکہ اجمل گرفتار ہو گیا۔ اس مقابلے کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ اخباری رپورٹوں کے مطابق گرگام چوپائی میں کھڑی پولیس پارٹی کے پاس صرف دو رائفلیں تھیں۔ بقیہ سپاہی لاشیں لے رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے نہ صرف اسماعیل کو مار ڈالا بلکہ اجمل کو زندہ پکڑنے میں بھی کامیاب رہے۔ حالانکہ یہ دونوں خطرناک دہشت گرد انتہائی تجربے کار پولیس افسروں کو قتل کر کے آرہے تھے۔ مگر گرگام چوپائی میں کھڑے سپاہیوں نے نہ بچانے کیا ”چنگاڑ“ دکھایا کہ دونوں دہشت گردوں کی سٹی گم ہو گئی اور وہ قانون کے جال میں پھنس گئے۔

(۲۴)

بھارتی سرکاری بیان کے مطابق کرکرے سے مقابلہ کرتے ہوئے اجمل کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ گرفتاری کے بعد جب اُسے صحافیوں کے سامنے لایا گیا، تو اس کے دونوں ہاتھ صحیح سلامت تھے۔ مگر میٹر و جنکشن میں اتاری گئی ویڈیو میں صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ ایک نامعلوم نوجوان کے ہاتھ سے خون بہ رہا ہے۔ کیا یہ وہی دہشت گرد ہے جس نے ساتھیوں کے ہمراہ کرکرے، کاٹنے اور اسلحہ کو مار ڈالا؟ اس نوجوان

کی اصلیت آج تک سر بہتہ راز میں ہے۔

(۲۵)

ایس ایم اشرف نے اپنی کتاب میں ایک اہم اور سنسنی خیز انکشاف یہ کیا ہے کہ ممبئی پولیس کے کنٹرول روم اور پولیس کمشنر، حسن غفور کی وائیلنس کیونٹیننگ کی ٹیپ عیاں کرتی ہے کہ گرگام چوپائی پر دو دہشت گردوں اور پولیس کے مابین واقعی مقابلہ ہوا۔ مگر اس مقابلے میں دونوں دہشت گرد مارے گئے تھے۔

یہ نہایت اہم انکشاف ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ، اجمل قصاب کو گرگام چوپائی سے نہیں پکڑا گیا کیونکہ اس مقابلے میں تو دونوں دہشت گرد مر گئے۔ اگلے روز کئی اخبارات میں بھی یہی خبر شائع ہوئی کہ گرگام چوپائی کے مقابلے میں دونوں دہشت گرد ہلاک ہو گئے۔

یہ سچائی پھر ثابت کرتی ہے کہ اجمل قصاب کا بہروپ بھر کر بھارتی فوج، کسی ایٹمی جنس ایجنسی یا شیوسینا کا کوئی جنگجو ریلوے اسٹیشن اور دیگر مقامات پر فائرنگ کرتا رہا۔ آپ اگر تصاویر میں ریلوے اسٹیشن پر موجود اجمل اور اسماعیل کو غور سے دیکھیں تو واضح طور پر وہ پاکستانی نہیں بلکہ بھارت کے چھٹے ہوئے بعد معاش دکھائی دیتے ہیں۔

(۲۶)

ممبئی پولیس نے اپنے شہر کے دو مسلمان شہری، جنیم انصاری اور صباح الدین شیخ کو بھی گرفتار کیا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے پاکستانی دہشت گردوں کی مدد کی ہے۔ وہ اس طرح کہ جنیم نے ہاتھ سے ممبئی کے اہم مقامات کے نقشے بنائے اور پھر انھیں صباح الدین کے حوالے کر دیا۔ صباح الدین انھیں نیپال لے گیا جہاں یہ نقشے لشکر طیبہ کے اہم لیڈر، ذکی الرحمن لکھوی کے حوالے کر دیے گئے۔

ممبئی کے نوجوان وکیل، شاہد عظیمی ان دونوں مسلمانوں کے وکیل تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے پولیس کے

ٹولہ گواہ، نور الدین پر جرح کی۔ جرح نے ثابت کر دیا کہ نور الدین کبھی نیپال نہیں گیا۔ اسی لیے وہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ صباح الدین نقشے ذکی الرحمن لکھوی کو دے رہا ہے۔ شاہد عظیمی نے یہ بھی دلیل بھی دی کہ جب انٹرنیٹ پر ممبئی کے بہترین نقشے موجود ہیں تو جنیم کو ہاتھ سے نقشے بنانے کی کیا دہشت تھی؟

پولیس کے مطابق جنیم کے بنائے گئے نقشے ابواسمعیل کی جیب سے برآمد ہوئے تھے۔ شاہد عظیمی اخباری رپورٹوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہا کہ جب اسماعیل مرا، تو اس کا جسم خون میں لت پت تھا۔ شاہد عظیمی نے پھر سوال کیا ”یہ کیسے ممکن ہے کہ پولیس نے اسماعیل کی جیب سے نقشے برآمد کر لیے اور ان پر خون کا ایک قطرہ تک موجود نہیں؟“

شاہد عظیمی کے دلائل اتنے قوی تھے کہ تین مئی ۲۰۱۰ء کو عدالت نے جنیم انصاری اور صباح الدین، دونوں کو رہا کر دیا۔ اس دوران شاہد عظیمی پر افشا ہو چکا تھا کہ بھارتی پولیس مسلمانوں پر جھوٹے کیس ڈال کر انھیں گرفتار کر لیتی ہے۔ یہ سلسلہ ۲۰۰۲ء سے چلا آ رہا تھا۔ خیال ہے کہ اسے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ ممبئی حملے بھارتی ایٹمی جنس ایجنسیوں نے ہی انجام دیے ہیں۔ اسی لیے فروری ۲۰۱۰ء میں انھیں دہشت گردوں نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ دہشت گرد دیا آئی بی کے ایجنٹ تھے۔

(۲۷)

۲۸ نومبر ۲۰۰۸ء کو بھارتی نیٹ ورک، ڈی این اے (DNA) نے ایک رپورٹ جاری کی۔ اس کے مطابق ہادی سینئر، نریمان ہاؤس کے سامنے والی عمارت میں آئندہ اورا نے (Anand Raorane) نامی ایک شخص مقیم ہے۔ اس نے ڈی این اے کو بتایا کہ جب ٹی وی پر یہ خبر چلی کہ دہشت گرد کرکرے مارے گئے ہیں، تو نریمان ہاؤس پر قبضہ

جائے دہشت گردوں نے خوشی سے نعرے لگائے اور یوں جشن منایا جیسے وہ بہت خوش ہوں۔ یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ نریمان ہاؤس پر قبضہ جمانے بیٹھے دہشت گردوں کا تعلق بھارتی خفیہ ایجنسیوں یا ہندو انتہا پسند تنظیموں سے تھا۔

ڈی این اے کی اسی رپورٹ میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ صحافیوں کو نریمان ہاؤس کے ایک رہائشی اور مقامی دکاندار نے بتایا کہ دہشت گردوں نے حملے سے قبل بڑی مقدار میں کھانے پینے کی اشیاء اور شراب خریدی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اگر دہشت گردوں کا تعلق لشکر طیبہ سے تھا، جیسا کہ بھارتی حکومت کا دعویٰ ہے، تو کوئی بھی ذی عقل یہ کیسے یقین کر سکتا ہے کہ انھوں نے شراب خریدی اور نریمان ہاؤس میں قلعہ بند ہو کر جام خمر چڑھاتے رہے؟

(۲۸)

۲۸ نومبر ۲۰۰۸ء کو اکثر بھارتی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی: یعنی شاہدین نے صحافیوں کو بتایا کہ انھوں نے رات ۱۲:۳۰ پر سینٹ زیویر کالج کے باہر فٹ پاتھ پر پڑی ایک لاش دیکھی۔ اس کے قریب تین مسلح نوجوان کھڑے تھے۔ وہ لاش کس کی تھی اور وہ تین مسلح آدمی کون تھے؟

(۲۹)

۲۸ نومبر کو بھارتی اخبارات میں یہ خبریں بھی شائع ہوئیں کہ پولیس نے ابتدا میں دو سے آٹھ دہشت گرد زندہ پکڑنے کی کال چلائی تھی، لیکن آخر میں صرف ایک ہی دہشت گرد پایا گیا۔ بقیہ زندہ گرفتار ہونے والے دہشت گرد کہاں گئے؟

(۳۰)

بھارتی سرکاری بیان کے مطابق اجمل قصاب، اسماعیل اور بعض دیگر پاکستانی دہشت گردوں نے اپنے موبائل گرا دیے تھے۔ (گو کیا انھیں شناخت کرنے میں مزید آسانی رہے)۔ یہ موبائل بھارتی سیمز رکھتے تھے۔

جب پولیس نے چھان بین کی، تو انکشاف ہوا کہ ممبئی حملوں سے قبل کلکتہ میں دو بھارتی مسلمانوں، توصیف رحمان اور مختار احمد نے تین سہ ماہی خریدے تھے جو دہشت گردوں کے زیر استعمال رہے۔ چنانچہ ۶ دسمبر ۲۰۰۸ء کو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد ازاں انکشاف ہوا کہ توصیف اور مختار، دونوں آئی جی کے خفیہ ایجنٹ تھے۔ انھیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ لشکر طیبہ میں شامل ہو کر اس کے قاعدین کی جاسوسی کرتے رہیں۔

یہ ایک اور نہایت اہم انکشاف ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ تمام جنگجو پاکستانی تنظیموں میں بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹ کام کر رہے ہیں۔ اسی لیے یہ ایجنسیاں پاکستانی ریاست کے خلاف سرگرم ہوئیں اور اب تک ارض پاک میں دہشت گردی کروا رہی ہیں۔

داؤد گیلانی کا انوکھا کردار؟

ممبئی حملوں کے بھارتی سرکاری بیان میں سید داؤد گیلانی المعروف بڈیوڈ کو لینن ہیڈ لے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس شخص کی داستان بھی بڑی ڈرامائی اور پُر اسرار ہے۔ داؤد گیلانی پاکستانی باپ، سید سلیم گیلانی اور امریکی ماں، ایلس شیر کی بیٹی ہے۔ سلیم گیلانی سفارت کار کی حیثیت سے واشنگٹن کے پاکستانی سفارت خانے میں تعینات تھے۔ ایلس وہیں بحیثیت سیکرٹری کام کرتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے جو شادی پر منتج ہوئی۔ اس بندھن سے ۱۹۹۰ء میں داؤد گیلانی پیدا ہوا۔

جلد ہی سلیم گیلانی اہل خانہ کو لاہور لے آئے مگر ایلس پاکستانی معاشرے میں جذب نہ ہو سکی اور واپس امریکا چلی گئی۔ پھر اس نے طلاق لے لی۔ ۱۹۷۷ء میں سترہ سالہ داؤد بھی ماں کے پاس امریکا چلا گیا۔ تب تک سلیم گیلانی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل رہے اور ۲۰۰۸ء میں فوت ہوئے۔ ان کا ایک اور

سوتیلہ بھائی، دانیال بھی سفارت کار ہے۔ وہ سابق وزیر اعظم، یوسف رضا گیلانی کا ترجمان رہ چکا۔

بال ہونے کے بعد داؤد پاکستان آتا رہا۔ ان دوروں کے دوران وہ منشیات کی اسمگلنگ کرنے لگا۔ ۱۹۸۸ء میں آخر وہ جرمنی میں پکڑا گیا۔ جرمنوں نے اُسے امریکا کے حوالے کر دیا جہاں داؤد چار برس جیل میں رہا۔ ۱۹۹۷ء میں داؤد پھر منشیات اسمگل کرتے امریکا میں پکڑا گیا۔

جلد ہی داؤد نے امریکی خفیہ ایجنسیوں کا ایجنٹ بننا منظور کر لیا۔ نتیجے میں اُسے بارگروا گیا۔ یہ واقعہ افشا کرتا ہے کہ امریکی اپنے مفادات کی خاطر غیر قانونی عمل بھی کر ڈالتے ہیں۔ امریکی حکومت کا دعویٰ ہے کہ داؤد کو پھر لشکر طیبہ کی سرگرمیاں جاننے کی خاطر پاکستان بھیجا گیا۔ پاکستان پہنچ کر داؤد لشکر طیبہ کا کارکن بن گیا۔ حقیقتاً وہ سی آئی اے کا ایجنٹ تھا۔ وہ امریکی خفیہ ایجنسیوں کو لشکر طیبہ اور دیگر پاکستانی جہادی تنظیموں کے بارے میں اندرونی معلومات دیتا رہا۔

امریکی حکومت کا دعویٰ ہے کہ ۲۰۰۶ء میں داؤد نے اپنا نام ڈیوڈ کو لینن ہیڈ لے رکھ لیا۔ اس دوران وہ ڈبل ایجنٹ بن گیا۔ یعنی وہ لشکر طیبہ کے لیے بھی کام کرنے لگا۔ اسی حیثیت سے ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء میں ممبئی گیا۔ اس نے تاج محل ہوٹل، اور برائے ہوٹل، زریمان ہاؤس اور دیگر ٹارگٹوں کی تصاویر اور ویڈیو بنائیں اور لشکر طیبہ کے حوالے کر دیں۔

۲۰۰۹ء میں وہ لشکر طیبہ کو خیر آباد کہہ کر الیاس کشمیری کا ساتھی بن گیا۔ الیاس کشمیری ڈھماکہ کے بدنام زمانہ اخبار، جیلڈ سے پوسٹن کے دفتر پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ داؤد گیلانی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ دفتر کی ”رہائی“ کر کے آئے اور کوشش کر کے، تصاویر بھی اتارے۔ چنانچہ داؤد جب امریکا سے ڈھماکہ برائے پاکستان جا رہا تھا، تو اکتوبر ۲۰۰۹ء میں اُسے گرفتار کر لیا گیا۔

امریکی حکومت کا دعویٰ ہے کہ جب داؤد گیلانی سے لفتیش

ہوئی تو اس نے انکشاف کیا کہ وہ بھی ممبئی حملوں میں ملوث تھا۔ لہذا اس جرم پر داؤد کے خلاف امریکا میں مقدمہ چلا اور جنوری ۲۰۱۱ء میں اُسے امریکی عدالت نے پینتیس سال کے لیے جیل بھجوا دیا۔ گویا بالفرض داؤد جیتا رہا، تو رہائی کے وقت وہ ۸۸ سال کا ہو گا لیکن قوی امکان یہی ہے کہ وہ جیل ہی میں وفات پا جائے گا۔ اجمل قصاب کی طرح امریکی حکومت نے بھی داؤد پر دھمکے میں مقدمہ چلایا۔ اس مقدمے کی تفصیل کلاسیفائیڈ یا خفیہ ہے۔ پس امریکی حکومت جو کچھ صحافیوں کو داؤد گیلانی کے بارے میں بتاتی رہی، وہی سامنے آیا۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ داؤد گیلانی امریکی خفیہ ایجنسیوں کا ایجنٹ تھا۔ اس کی مدد سے وہ لشکر طیبہ اور دیگر جہادی تنظیموں کی جاسوسی کرتی رہیں، لیکن اکتوبر ۲۰۰۹ء میں اپنا ٹک اُسے ”ڈبل ایجنٹ“ قرار دے کے گرفتار کر لیا گیا۔ یعنی یہ کہ وہ لشکر طیبہ کے لیے کام کرنے لگا تھا مگر یہ محض ایک الزام ہے جو امریکی حکومت نے داؤد پر لگایا۔ سوال یہ ہے کہ امریکی حکومت نے داؤد پر یہی کیوں لگایا؟ امریکی حکومت نے یہ چال کیوں چلی اور اپنے ہی ایجنٹ کو معتبوت ٹھہرا دیا؟ یہ جاننے کی خاطر ہمیں نوسال پیچھے جانا پڑے گا۔

جنوری ۲۰۰۹ء میں بارک اوباما نے امریکی صدر بن گئے۔ اوباما افغانستان میں امریکی فوج کی تعداد بڑھانا چاہتے تھے تاکہ طالبان کو شکست دی جاسکے۔ پاک فوج نے اس نئی حکمت عملی کو ناقص قرار دیا اور امریکیوں کو بتایا کہ کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (بعد ازاں یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔) رفتہ رفتہ دیگر معاملات پر بھی امریکا اور پاکستان کے مابین عدم اتفاق نے جنم لیا اور درویریاں بڑھنے لگیں۔

مارچ ۲۰۰۹ء میں رانے اپنے ایجنٹوں کی مدد سے امریکا میں سری لنکن کرکٹ ٹیم پر حملہ کر دیا۔ اس بھارتی حملے کا مقصد پاکستان کو عالمی سطح پر مزید تنہا کرنا اور دہشت گردوں کا سرپرست ملک قرار دلوانا تھا۔ یہ حملے بھی پاکستان کے لیے

تباہ کن ثابت ہوئے۔ انھیں انجام پانے نو برس بیت چکے، آج بھی غیر ملکی کھلاڑی پاکستان آتے ہوئے گھبراتے اور خوف کھاتے ہیں۔

حرف آخر

قارئین کرام درج بالا تمام حقائق سے عیاں ہے کہ بھارتی فوج، را، آئی بی سے منسلک قوم پرست طاقتور ہندو ٹولے نے ممبئی حملوں کا گمراہ کن اور شاطرانہ منصوبہ تیار کیا تاکہ وہ کثیر مقاصد حاصل کر سکے۔ اس پلان کو انتہا پسند ہندو تنظیموں کی بھی مدد شامل تھی۔ تبھی ممکن ہو سکا کہ جنوبی ممبئی میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت چا کر اس کا مرتکب پاکستان کو قرار دیا جائے۔ یوں پاکستان کو سیاسی و معاشی طور پر زبردست نقصان پہنچتا۔

ممبئی حملوں کے ”فالو اپ“ سے اس ہندو ٹولے نے گونا گوں فوائد پائے۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بھارت میں ہندو قوم پرستی بڑھنے لگی تاکہ نام نہاد اسلامی دہشت گردی کا مقابلہ کیا جاسکے۔ چنانچہ صرف پانچ برس بعد ہزار ہا مسلمانوں کے قاتل مودی کی زیر قیادت قوم پرست ہندو برسر اقتدار آ گئے۔ اب یہ ٹولہ پورے بھارت میں قدم جمانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس کا ایک اہم مشن مسلمانان بھارت کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو ہندو بنالینا ہے۔

اسی طرح ممبئی حملوں کے بعد سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات مسلسل تناؤ کا شکار چلے آ رہے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی کہ معمولی واقعات کشیدگی بڑھا دیتے ہیں۔ سفارت کاروں کو تنگ کرنے کا حالیہ واقعہ ثبوت ہے۔ غرض برصغیر کی تاریخ میں ممبئی حملے حقیقتاً انقلاب ساز ثابت ہوئے۔ انھوں نے پاکستان کے لیے علاقائی ہی نہیں عالمی سطح پر بے انتہا مسائل کھڑے کر دیے۔ اس گمراہ کن پلان کے بطن سے جنم لینے والی انتہائی منفی تبدیلیاں آہستہ آہستہ ہی کافور ہوں گی۔



شعور کی آنکھ کھلی تو چاروں جانب رنگ برنگ کتب پائیں۔ ان میں آپ بیتی اور خاکوں پر مشتمل کتابیں مرغوب ٹھہریں۔ ممتاز خاکہ نگاروں میں مولانا سلیمان ندوی، شاہد احمد دہلوی، ملا واحدی، منٹو، اخلاق احمد دہلوی، ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ اب اس مختصر فہرست میں جناب فاروق عادل کا نام بھی شامل ہو چکا۔

خاکوں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ متاری کو مختلف النوع شخصیات کے اچھے برے پہلوؤں سے روشناس کرواتے ہیں۔ خصوصاً خاکے میں درج واقعات سے انسان صراطِ استقیم پر چلنے کا طریقہ سیکھتا ہے۔ خیر کے واقعات سے جوش و ولولہ پاتا اور شرانگیزی واقعوں سے عبرت پکڑتا ہے۔ اگر یہ خاصیتیں عمدہ خاکوں کی کسوٹی قرار پائیں، تو فاروق عادل کی تخلیق ”جو صورت نظر آتی“ میں بہار دکھلاتے خاکے اس پر پورے اترتے ہیں۔

فاروق صاحب نے ۳۲ شخصیات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جہاں ایک طرف ان میں قائد اعظم، انیر مارشل محمد اصغر خان، انیر کوڈ ورا ایم ایم عالم، میاں طفیل محمد، پروفیسر غفور احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، محمد صلاح الدین، احمد ندیم قاسمی اور الطاف حسن قریشی جیسی نامور ہستیاں شامل ہیں تو وہ بھی جنہیں ذاتی تعلق کی خاطر یا منفرد خوبیوں کی بناء پر چنا گیا مگر خاکہ کسی بھی ہستی کا ہو، وہ قاری کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ضرور ڈالتا اور اسے غور و فکر کا سامان دے جاتا ہے۔

فاروق صاحب کی برس سے سیاسی ہفت روزہ تکبیر میں بطور صحافی ذمے داری نبھا رہے ہیں۔ باقاعدہ صحافت میں داخل ہو کر عموماً اندازِ تحریر بگڑ جاتا ہے لیکن انھوں نے اپنی ادیبانہ حس کو زندہ رکھا۔ اسی کی بدولت وہ اپنے خاکوں میں بھی شگفتگی، بشارت و سلامت کو صہنم دینے میں کامیاب رہے۔

”جو صورت نظر آتی“ کے خاکوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر ممدوح کی شخصیت کا یک طرفہ رخ دکھائی نہیں دیتا بلکہ تصویر کے دونوں اطراف دکھائے گئے ہیں۔ ان میں جذبات ہیں، معلومات اور فکر انگیز نظریات بھی۔ گویا انھیں ہر شخص کی زندگی کے سہ آئینہ مختصر نثر پارے سمجھ لیجیے۔

معنوی لحاظ سے یہ کتاب گونا گوں خوبیاں رکھتی ہے تو ظاہری طور پر بھی اس کی تزئین و آرائش میں بڑا اہتمام برتا گیا ہے۔ کاغذ معیاری ہے اور چھپائی اعلیٰ۔ خاکہ نویس ہی نہیں تاریخ، ادب، سیاست اور معاشرت سے دلچسپی رکھنے والی خواتین و حضرات اسے ایسی منفرد کتاب پائیں گے جسے پڑھ کر انسان کچھ پاتا ہی ہے، کھوتا کچھ نہیں۔ ♦♦♦

کوئی عہدہ نہ ہونے کے باوجود لیبیا کے دوسرے بااثر ترین انسان کی زندگی



شاہ سے گدا تک

چند مسلمان حکمرانوں کی عیاشیاں پورے عالم اسلام کو ہنگامی پرستیں ہیں

ہوا بھی نہیں۔ اس کمرے میں پڑا فوم کا گدا، تکید اور کبل اس قدر گندے اور بدبودار تھے کہ ان کو استعمال کرنا تو درکنار، دیکھ کر بھی کھن محسوس ہوتی تھی۔ گندے اور بدبودار کبل میں لپٹا گرفتار ہوا وہ شخص کوئی عام آدمی نہیں بلکہ کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا ایک امیر ترین شخص تھا اور اس کا شمار دنیا کے چند بااثر لوگوں میں ہوتا تھا۔

وہ انتہائی پراساس زندگی گزارتا اور اپنی عیاشیوں پر کروڑوں ڈالر کھڑے کھڑے خرچ کرنے کا عادی تھا۔ اس امیر زادے کی شہرچیوں کا یہ عالم تھا کہ ایک بار لندن میں وہ اپنی کار پر سفر کر رہا تھا کہ دوران سفر اسے شمالی لندن کا ایک خوبصورت گھر پسند

آ گیا۔ اس نے اسی وقت وہ گھر خریدنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن مالک اپنا گھر بیچنے پر تیار نہ تھا۔ امیر زادے نے ضد میں آ کر گھر کی ڈبل قیمت وہیں کھڑے کھڑے ادا کر کے آخر کار وہ گھر ایک کروڑ برٹش پائونڈز میں خرید ہی لیا۔ پاکستانی روپے کے مطابق اس کی مالیت ایک ارب چالیس کروڑ بنتی ہے۔

۲۰۰۹ء میں اس نے اپنی ۷۳ویں سالگرہ منائی جو دنیا کی سب سے ہنگامی ترین سالگرہ تھی۔ اس سالگرہ میں دنیا کی امیر ترین شخصیات نے شرکت کی۔ جس میں روس کے ٹائیکون، سونے کی کانوں کے مالک، مونا کو کے پرنس البرٹ دوم بھی شامل تھے۔ اس کا ایک اور مہنگا اور بڑا شوق پیسنسنگ

ایک ویران سی جگہ پر واقع کھنڈر نما مکان سے ۱۹ نومبر ۲۰۱۱ء کو ایک ایسے شخص کو گرفتار کیا گیا جو اس کمرے میں تقریباً پانچ یا چھ ماہ سے چھپا ہوا تھا۔ وہ شدید زخمی اور بیمار تھا۔ کمرے کی حالت اتنی خستہ تھی کہ اس میں نٹو کو روشنی کا مناسب انتظام تھا اور نہ ہی کمرے میں تازہ ہوا آنے کا کوئی راستہ موجود تھا۔ یہاں تک کہ کمرے میں ہاتھ روم تک کی سہولت بھی میسر نہ تھی۔ اس شخص کا کھانا پینا، سونا اور رفع حاجت وغیرہ سب کچھ اس کمرے کی چار دیواری کے اندر ہی محدود تھا۔

جب اس شخص کو گرفتار کیا گیا تو اس کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کئی دنوں سے جھوکا یا سیاہے اور کچی ہفتوں سے نہایا

اشفاق جہاز سے اتر کر اسلام آباد ہوائی اڈے

سے نکلا ہی تھا کہ آصف نے اپنے دوست کو خوش آمدید کہا۔ بھینچ کر گلے لگایا اور پھر اس کے ہاتھ سے اپنی کیس لیتے ہوئے اسے اپنی کار تک لے گیا۔ کار چل پڑی تو اشفاق نے آصف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

”یہ دوسری دفعہ ہے کہ تم نے تار دے کر پھر اسی کام کے لیے طلب کیا ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا؟ آصف بولا: کام بھی تو اتنا ہی اہم ہے۔ تمہارے مشورے کے بغیر کیسے ایسا کر سکتا ہوں؟“

”میاں لڑکی ٹینا کہاں کا اہم کام ہے؟ بس لڑکی بڑا چہرہ مہرہ ٹھیک ہو، قد کاٹھ درست ہو اور خاصی ہو تو پڑھاؤ دو بول!“

”دوست! چہرے میرے ہی کے لیے تو تمہاری پسند معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔“

”مگر شادی تم نے کرنی ہے۔ پسند مجھ سے کروا لے ہو۔ کچھ مجھ نہیں آ رہا۔“

”دیکھو اشفاق، سیدھی سی بات ہے۔ یوں تو میں یہ کام کسی نانی یا نائیں کو بھی سونپ سکتا تھا لیکن نانیوں کے بس کا کام نہیں۔ اس کے لیے کسی معلم یافتہ اور ہمدرد دوست کی ضرورت ہے اور یہ حال میں تمہیں نانیوں پر ترجیح دیتا ہوں۔“

”اس نوازش کا شکریہ، مگر تعلیم اور ہمدردی والی خوبیاں تو تمہارے کئی دوسرے دوستوں میں بھی ہیں۔ آخر مجھے اتنی دور سے بلا کر لڑکی ہانپنے میں کیا حکمت ہے؟“

”حکمت میرے پیارے دوست“ یہ ہے کہ

سنبھالتا تھا۔ شاید یہ واحد ایسا شخص تھا جو کوئی عہدہ نہ رکھنے کے باوجود لیویا کا دوسرا بااثر ترین انسان ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ حکومتی معاملات میں اس کا اثر اور دخل اس حد تک تھا کہ کرنل قذافی کو نیوکلیئر پروگرام شروع کے لیے بھی اسی نے قائل کیا۔ سیف الاسلام اپنے ملک کی انویسٹمنٹ اتھارٹی کا سربراہ تھا اور یہ اتھارٹی اتنی طاقتور تھی کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں کسی بھی وقت دس بلین تک کی سرمایہ کاری کر سکتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعی بہت بڑی بات تھی۔ ایسی شان و شوکت سے زندگی گزارنے والا یہ شخص شاید سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کبھی اس کی زندگی دنیا کے لیے عبرت ناک بن جائے گی۔ کرنل قذافی کی حکومت ختم ہونے کے بعد سیف الاسلام لیویا کے ایک چھوٹے سے قصبے میں روپوش ہو گیا اور پھر اسے انتہائی خدوش حالت میں برآمد کیا گیا۔ اس کے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور ان پر پلستر لگا ہوا تھا جو اس نے خود ہی چڑھایا تھا۔ کیونکہ وہ کسی ڈاکٹر سے علاج کروانے کے قابل تک نہ رہا تھا اور نہ ہی اسے کسی قسم کی طبی سہولیات میسر تھیں۔ نومبر ۲۰۱۱ء سے لے کر جون ۲۰۱۷ء تک سیف الاسلام لیویا حکومت کے قصبے میں رہا۔ اتنے امیر کبیر بااثر شخص کو پناہ دینے والا پوری دنیا میں کوئی ایک انسان بھی نہ تھا۔ وہ دن فاختہ ہو چکے تھے جب اسے سر آنکھوں پہ بٹھایا جاتا تھا اور برطانوی شاہی خاندان اسے اپنا مہمان بنانے پر فخر کرتا تھا۔

چھ سال لیویا میں ایک مسلح گروہ کی قید میں رہنے کے بعد ۲۰۱۷ء جون میں اسے عام معافی کی بنیاد پر رہا کر دیا گیا۔

جو حکمران عوام کا اعتماد حاصل نہیں کرتے اور جو اپنے اثر و رسوخ کو محض اپنی ذاتی زندگی کی عیاشیوں کے لیے استعمال کرتے ہیں، نیز اپنی دولت و طاقت سے عوام کا جینا دو بھسر کیے رکھتے ہیں۔ جو اس قدر مغرور ہوتے ہیں کہ اپنے سوا انہیں دنیا کا ہر عام شخص کیڑے مکوڑے سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ ان جیسوں کے لیے سیف الاسلام آج کی تاریخ کا سب سے بڑا عبرت انگیز اور سبق آموز نام ہے۔ ♦♦♦

تھا۔ اس کے پاس اربوں ڈالر مالیت کے شہ پارے تھے جو اس کے گھر کی زینت تھے۔

برطانیہ کے وزیر ٹونی بلیر اسے ”مائی فرینڈ“ کہتے تھے۔ برطانوی شاہی خاندان نے انہیں کئی بار اپنے محلات میں مہمان کے طور پر ٹھہرایا اور ان کی خوب آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ یوں کہ نامناسب ہوگا کہ یہ اکثر برطانیہ کے شاہی خاندان کے خاص مہمان ہوا کرتے تھے۔ اس نے اپنی زندگی کی بیشتر شاموں کا حصہ پلے بوائے کی حیثیت سے لندن اور پیرس میں گزارا۔ پیرس کی خوشبو ساز کمپنیاں اس کے لیے ایسے خاص پرفیوم بنایا کرتی تھیں جو عام آدمی کے لیے نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی بازار میں دستیاب ہوتے۔

شاہ خرچ اور عیاش پسند ہونے کے ساتھ ساتھ یہ امیر زادہ قانون شکن بھی تھا۔ قانون کے ساتھ کھیلنے اور اسے توڑنے میں یہ ایک خاص لطف اور تفریح محسوس کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے پیرس کی ایک مشہور شاہراہ پر ایک سوئس کلومیٹر کی رفتار سے گاڑی چلا کر پوری یورپی دنیا کو حیران کر ڈالا اور ساتھ ہی وہاں کی سٹی حکومت کے قانون آکر اس کو بڑا چیلنج دیا۔ کوشش کے باوجود اس کا جالان نہ ہو پایا۔

۲۰۰۶ء میں اسے ایک اسرائیلی اداکارہ اور لے وئر سے عشق ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اور لے وئر دنیا میں سب سے زیادہ مہنگی گرل فرینڈ ثابت ہوئی جس کے گرد اس کے عاشق نے دولت کے انبار لگا دیے تھے۔

یہ مشہور و معروف شخص کوئی اور نہیں، لیویا کے سابق حکمران معمر قذافی اور اس کی دوسری بیوی کا بیٹا سیف الاسلام تھا۔ جس کی موجودہ زندگی آج کی تاریخ میں سوائے عبرت کے اور کچھ نہیں۔

اتنی بااثر شخصیت ہونے کے باعث دنیا سمجھتی تھی کہ کرنل قذافی کے بعد بھی لیویا کا حکمران ہوگا مگر ایسا نہ ہوا۔ اس نے باقاعدہ طور پر کوئی بھی سیاسی عہدہ لیما منظور نہ کیا البتہ پیرس پر وہ اپنے والد معمر قذافی کے تمام اندرونی معاملات یہی

پکائی قہی کھیر!

ایک نوجوان کے خوابوں کا محل
جب دھڑام سے گر پڑا

لڑکی امریکن ہے اور تم پورے پانچ سال امریکا میں رہے ہو۔ اتنے نازک مسئلے میں تم سے زیادہ "ایکسپٹ" مشورہ کون دے سکتا ہے؟

"تو یہ بات ہے! لیکن صاحب زادے! میں امریکا میں انجینئرنگ پڑھتا رہا ہوں۔ دلہنوں کو پرکھنا میرے نصاب میں شامل تھا۔"

"اوہ یار تم اس سے امریکی لہجے میں انگریزی تو بول سکو گے اور بہر حال میری چھٹی حس بتاتی ہے کہ اگر تم نے اسے پاس کر دیا تو وہ میرے لیے بڑی صحیح بیوی ثابت ہوگی۔" "تو کیا مجھے اسے تحریری پرچہ دینا پڑے گا؟" اشفاق نے چونک کر پوچھا۔

"تحریری نہیں، تقریری۔ اس کے ماں باپ ہماری سڑک پر ہی قریب کے ہنگے میں رہتے ہیں۔ لڑکی دیکھی تو یوں بھی جاسکتی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ انفریو کے لیے تم ان کے گھر "کال" کرو۔"

"کیا تم "کال" کر چکے؟ اشفاق نے پوچھا۔

"نہیں۔" "لڑکی سے علیک سلیک ہوتی ہے؟"

"نہیں۔ بس ذرا فاصلے سے دیکھی ہے۔۔۔ گویا صرف "سلیک" ہوتی ہے۔"

"خوبصورت ہے؟"

"بھئی سچی بات ہے تا حال اسے سامنے سے نہیں دیکھا۔"

"تو کیا اس کی کمرے عشق ہو گیا ہے؟"

"صرف کمری سے نہیں، اس کے بالوں سے بھی جو سونے کا ڈھیر ہیں، اس کے بازوؤں سے بھی جو مرمکی شائیں ہیں۔ قد سے بھی جو سرو کا ہونا ہے۔ بس، تم روبرو ہو کر اس سے دو باتیں کر کے اتنی تصدیق کر دو کہ وہ واقعی میرے خواب کی تعبیر ہے۔"

"مگر میرے شاعر یار، مجھے تمہارے خوابوں کے بارے میں کیا معلوم؟ میں تو زیادہ سے زیادہ تمہیں یہ بتا سکوں گا کہ وہ میرے خواب کی تعبیر سے یا نہیں۔"

"چلو منظور! آصف نے فوراً شوق سے کہا۔ "مجھے یقین ہے تمہیں بھی بڑے معیاری خواب آتے ہوں گے۔" گاڑی آہستہ آہستہ آصف کی کونٹھی میں داخل ہونے لگی تو اشفاق بولا:

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری امریکی محبوبہ کا دولت کدہ کس طرف ہے؟"

"ایک کونٹھی چھوڑ کر دوسری۔" آصف نے ادھر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا دو ریٹین سے دیدار کیا کرتے ہو؟" اشفاق نے پوچھا۔

"نہیں، وہ دور سے بھی چمکتی ہے۔ بہرا ہے بہرا!" آصف نے گاڑی گیراج میں ٹھہری کی تو اشفاق باہر نکلتے ہوئے بولا:

"دیکھو، پہلے مجھے ذرا غسل کر لینے دو۔ پھر چائے پیتے اور تازہ دم ہو کر تمہاری شادی کا بندوبست کرتے ہیں۔ میں انشاء اللہ چار بجے ان کے گھر جاؤں گا۔"

ابھی تین ہی بجے تھے لیکن آصف بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے نوکر کو چائے کا حکم دیا اور خود چمن میں بیٹھ کر بے صبری سے اشفاق کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ہر چند منٹ بعد اپنے "متوقع" سسرالی ہنگے کی طرف نگاہ دوڑاتا کہ شاید وہ سرور نظر آجائے۔ کوئی پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ آصف کے کان میں آواز آئی:

"تو جناب، اب سنائیں اپنی داستان محبت اور ذرا تفصیل سے؟"

یہ اشفاق کی آواز تھی جو غسل سے فارغ ہو کر آصف کی طرف چمن میں آ رہا تھا۔ آصف اشفاق کی سنجیدگی اور ہمدردی

پر خوش ہوا، بولا:

"معلوم ہوتا ہے اس دفعہ تم سچ سچ میری شادی میں گہری دلچسپی لے رہے ہو۔"

"دلچسپی تو میں نے پچھلی دفعہ بھی اتنی ہی گہری لی تھی، فقط یہ کہ لڑکی جتنی نکل پڑی حالانکہ مجھے بلانے سے پہلے تمہیں کم از کم اس کی آنکھوں کی چال دیکھ لینا چاہیے تھی۔"

"وہ غلطی ہو گئی تھی" آصف شرمندگی سے بولا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ لڑکی ہر لحاظ سے اسے دن ہے!"

"کس کس لحاظ سے؟ ذرا اس مددش کا مزید حدود اربعہ بھی بیان کرو۔"

"یار کہہ دو چکا ہوں، قد کی لمبی ہے، جسم کی پتلی ہے، بال سنہرے ہیں، قومیت امریکی ہے۔"

"اور چونکہ امریکی ہے، اشفاق نے گرہ لگائی۔ "لہذا سرخ ہے، سپید ہے، براق ہے، برندہ ہے۔۔۔"

"بالکل بالکل" آصف نے تائید کی۔ "اتنی سرخ، اتنی سپید کہ پچھلی سی سی، اگلی سات پشتوں کی قلعی ضرور کر دے گی۔۔۔ یہ کہہ کر آصف ہنس پڑا۔

"مگر تمہارا اپنا وائٹ واش کون کرے گا؟" اشفاق نے آصف کے سانولے رنگ پر چوٹ کرتے ہوئے ذرا شرارتی انداز میں پوچھا۔

"میرے امریکا پلٹ دوست" آصف نے کسی قدر طنزاً کہا: "یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ امریکی لڑکیوں کو گہری جلد والے اور ان ڈھلے، ان کٹے بالوں والے کھر دے مرد اچھے لگتے ہیں۔"

"یعنی تم جیسے؟"

"بالکل!" آصف نے کسی قدر سینہ بھلا کر کہا۔ "مگر تمہارے چہرے پر تو مونچھ ہے نہ ڈاڑھی۔"

"بھئی، مونچھ ڈاڑھی بے شک اضافی خوبی ہے مگر اصل

غزل

کس حال میں ہے کوئی، اس کو نہیں خبر
اب تو زباں پر نہ ذکرہ اپنی جفا کا تھا
وہ لاکھ پشیمان ہوں، سر سے پانی اتر گیا
اب ڈھونڈتا جواز ہے جو بھی خطا کا تھا
غیر بھر نبھاتے رہے جو ہر خطا کو ہم
دانستہ جرم بھی اس کی پہن سلی ادا کا تھا
بہی شب منسراق شب عنم بھی ہو گئی
اب راستہ سامنے بس اپنی فنا کا تھا
اب تو بہار کیا، خزاں بھی نہیں رہی
عبرت کا ہر مقام بھی فقط آشنا کا تھا
اب تو بتاؤ توفیق بھلا کیے گزر گئی
ہر لمحہ زندگی کا بس صبر آرم کا تھا

نقی حسین نقی امر ویوی

آنکھیں بھیگے جاتی ہیں

دیار غیر میں کیسے تجھے صدا دیتے
تو مل بھی جاتا تو آخر تجھے گنوا دیتے
تمہی نے ہم کو سنایا نہ اپنا دکھ ورنہ
دعا وہ کرتے کہ ہم آسمان بلا دیتے
ہمیں پر زعم رہا اب کے وہ پکاریں گے
انہیں یہ ضد تھی کہ ہر بار ہم صدا دیتے
وہ تیرا غم تھا کہ شاید میرے لہجے کی
کہ جس کو حال سناتے اسے ٹلا دیتے
تمہیں بھلا نا ہی اول تو دوسترس میں نہیں
جو اختصار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے
ہم اپنے بچوں سے کیسے کہیں کہ یہ گڑیا
ہمارے بس میں جو ہوتی تو ہم دلا دیتے
سید وصی شاہ (انتخاب: ایم ایس ایم، پکارت)



فاتح مہمان کہلائے جانے والے
عظیم صحابی کی
ایمان افروز داستان حیات

ا اطراف سے زبردست محاصرہ کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ان کی آنکھیں مسلسل جاگنے سے پتھرا گئی تھیں۔ پریشانی سے کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور ہلاک کر دینے والی بھوک سے صحابہؓ نڈھال تھے۔ ”جب وہ تمہارے اوپر نیچے کی طرف سے تم پر (دشمن چڑھ) آئے اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ پر طرح طرح کے گمان کرنے لگے (امید و یاس کے ساتھ)۔ (سورہ احزاب آیت نمبر-۱۰) فریق ثانی بھی عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ فقط مدینہ کو فتح کرنے آئے تھے لیکن خندقوں کو دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں خندقیں دیکھی تھیں اور نہ اس سے پہلے کبھی ان کے بارے میں سنا تھا۔ مجبوراً انھیں خندقوں کے اس پار ہی قیام کرنا پڑا۔ سب سے بڑا مسئلہ اتنے بڑے لشکر کے

صحراے عرب میں سرما عیسٰی راتوں کی طرح ہی وہ ایک غنیمت کی رات تھی۔ رات ایسی اندھیری کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی دیتا تھا اور اوپر سے طوفانِ ایسا زوروں پر کہ صحرا کے مضبوط پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہلنے لگتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ محاذ پر لڑے ہوئے تھے۔ ایک مہینے سے کفار عرب و یہود یثرب نے تین

پشت کیے، اپنے سفید بالوں والے کتے کے پیچھے بھاگتے، سیڑھیاں اترتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”چار بج چکے۔“ آصف نے اشفاق کو گھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اب چلو گئی۔ اس وقت وہ گھر ہی میں ہے۔“

لیکن پیشتر اس کے کہ اشفاق کوئی حرکت کرتا، وہی سفید سفید نرم نرم بالوں والا کتا، بھاگتا ہوا کٹھی کی باڑھ سے اندر آ گیا۔

”ہیلو ڈارلنگ۔“ آصف نے دو قدم آگے بڑھ کر اسے
یوں لپیٹ لیا جیسے برسوں کی گمشدگی کے بعد ملا ہو۔

"LOVE ME! LOVE MY DOG" (مجھ سے پیار ہے، تو میرے کتے کو بھی چاہو) اشفاق نے آصف

”تم کچھ بھی کہو، یہ اچھا شگون ہے۔“ آصف کتنے کو ہانروؤں میں لپیٹائے پیار کرتے ہوئے بولا۔

دفعۃً کوھی کے آہنی گیٹ پر نازک سی انگلیاں بچ
اٹھیں۔ اشفاق اور آصف نے چونک کر دیکھا۔ گیٹ کے نیچے

سے نازک سی چپل پہنے گلابی گلابی پاؤں جھانک رہے تھے۔
پھر ان کی نظریں اوپر اٹھیں تو گیٹ کے کنارے سے سفید

پچھلے ماہ کی جھلک دہائی بس پرستہ ہے بالوں کی لٹ ہر
آئی تھی اور درو بخ صورت نیلگوں آنکھیں، تبسم بکھیرتی، اشفاق

اور اصف پر مرنے لگیں۔ لیٹ سی اوچھائی سی وہ امری
حسن کا شاہکار اگرچہ پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا تاہم اشفاق

یہاں کے پرہیزگاروں کی یہ آصف کا خواب دہائی کا خواب ہے۔
 "Come In" (اندر آئیے)۔ آصف نرم نرم بالوں
 سے سجھٹا کرتا ہے۔

"I AM JOHN. I HAVE COME
TO FETCH MY DOG"!

”(میں جان ہوں۔ میں اپنا کتا لینے آیا ہوں!)“

چیز سر کے بال ہوتے ہیں۔
 ”یہ جنگل تو میں صبح سے دیکھ رہا ہوں۔“ اشفاق نے
 آصف کے سر پر نظر میں جراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن لڑکیاں
 کوئی کبھی مجھ پر نہیں ہوتیں کہ بالوں کے جال میں پھنس
 جائیں۔“

آصف مسکرایا اور بولا۔ ”اشفاق، میرے پیارے یار، مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ لڑکیاں کھیاں ہوتی ہیں یا مچھر مگر آج

تک اس جال سے بہت کم بچ کر نکلی ہیں۔“

تمہاری ہزار خواہش کے باوجود کہیں رو کر دے اور تمہارے جال کی طرف دیکھے بھی نہ۔ ایسا ہوا تو بڑی سبکی ہوگی۔“

”مہم فرمت کرو، اشفاق۔“ آصف اشفاق کو کھورتے ہوئے بولا۔ ”یہ جال غیر ملکی مکھیوں کے لیے بھی اتنا ہی

”داد دیتے ہیں تمہارے اعتماد کی دوست“ اشفاق نے

”مگر اب داد کا نہیں، امداد کا وقت ہے۔ دیکھو چار بجے

”بچنے والے ہیں، ج تو نہیں گئے۔ ذرا دم لو۔ ابھی کھٹکتا تو ہے، لیکن سسکا رہا ہے۔“

چمن کی گھاس پر سنہری دھوپ کی آخری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ اشفاق (آرام گری) پر نمودار تھا اور آصف باس کھڑا

جیبوں میں ہاتھ ڈالے، حسب عادت سامنے والی کوٹھی کی طرف متوجہ تھا۔ دفعتاً آصف کے منہ سے نکلا:

”وہ دیکھو سنا منے تیس پر۔ پھر اپنا کتا لیے کھڑی ہے مگر...“ وہ جھنجھلا اٹھا:

بہت زیادہ چمک تھی۔ عمر قریباً ۵۵ سال۔ جھڑیوں بھرا چہرہ ڈھوپ اور ہر قسم کے مومنوں میں کام کرنے کا غماز تھا۔ پرانے ماڈل کی سپورٹس سائیکل سواری تھی۔

میرے گھر ناکا کھولنے کے لیے اپنے چری تھیلے سے اوزار نکالے اور پاپ سے زور آزمائی کرنے لگے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا، تو انھوں نے سرد سے لہجے میں ٹھٹھے ٹوکا اور بولے:

”سرا! پلیز مجھے کام کرنے دیں۔ تو جہنم ہٹائیں۔“

میں حیران سا ہوا۔ بات کرنے کا انداز بھی ان پڑھ کاریگروں والا نہ

تھا۔ بہر حال موڈی آدمی سمجھ کر میں نیچکا ہو رہا۔ انھوں نے خاموشی سے کام ختم کیا، اجرت لی اور اپنی سپورٹس سائیکل پر بیٹھ کر چلتے بنے۔

اس کے بعد گھر میں جب بھی کسی موٹر یا سینٹری کا مسئلہ درپیش ہوتا میں ظفر صاحب کو فون کیا کرتا۔ وہ خاموشی سے مسئلہ سننے اور پھر صرف یہ کہتے:

”صادق صاحب آپ کا کام ہو جائے گا۔“ مجھے دوسری کال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں اکثر دفتر میں ہوتا اور ظفر صاحب کی جوابی کال آتی کہ کام ہو گیا ہے۔ شام کو میں اجرت دیتا تو خاموشی سے رکھ لیتے۔



میرا دوست پلمبر

زندگی بھر مشکلات سے نبرد آزما رہنے والے ایک مسرور کا قصہ

ظفر صاحب سے میری پہلی ملاقات آج سے قریب اسی سال پہلے ہوئی۔ میرے صحن کا ناکا غالباً کام کرنا چھوڑ گیا، تب میں کسی پلمبر کی تلاش میں نکلا۔ جی ہاں، ظفر صاحب ایک پیشہ ور پلمبر تھے۔ غلے کی خراب موٹریں اور ٹکے ٹرٹ کرتے اور مناسب اجرت لے کر چلے جاتے۔ دوسرے کاریگروں کی طرح اجرت پر بحث نہیں کرتے تھے۔

پہلی بار دیکھنے پر وہ مجھے پلمبر کے بجائے غریب شاعر سے لگے۔ غلیب ہی کچھ ایسا تھا: ڈبلا پتلا بدن، پرانی بھدی سی جینز اور شرٹ میں ملبوس۔ سب سے زیادہ قابل ذکر ان کے کاندھوں تک آتے لمبے بال تھے۔ آنکھیں اندر کوھنسی ہوئیں جن میں

نکل آئے۔ جب انھوں نے حضرت حذیفہؓ کو بوسیدہ کپڑوں کے ساتھ پھر پر سوار دیکھا تو بے ہوش ہوتے ہوئے بچے۔ آپؓ کی سادگی و درویشی دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آپؓ تیغ ذرّں کے بھی ماہر رہے ہیں۔ آپؓ غزوہ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے۔ ہمدان، رے اور دینوار کے فاتح بھی آپؓ ہی تھے۔

آپؓ اگر جنگ میں ہوتے تو اپنی بہادری اور وجاہت کے باعث بے مثال نظر آتے۔ اگر عبادت میں ہوتے تو اپنے نشوونما و فضولیت اور حکمت و دانائی میں باکمال نظر آتے۔ غرض آپؓ کو جو ذمہ داری سونپی جاتی آپؓ پورے حقوق کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

آپؓ کی حکمت و دانائی بھی بے مثال تھی۔ آپؓ کا قول بہت مشہور تھا:

”تمہارے اچھے لوگ وہ نہیں جو آخرت کی خاطر دنیا، چھوڑ دیں بلکہ اچھے وہ ہیں جو اس میں سے بھی حصہ لیتے ہیں اور اس سے بھی۔“

راز دار رسول اللہ ﷺ فاتح ہمدان اور قابل تقلید شخصیت حضرت حذیفہ بن یمانؓ سن ۳۶ھ میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔

آپؓ کی زبان پر آخری الفاظ یہ تھے جو ان کی حکمت و دانائی کا منہ بولتا ثبوت تھے: ”موت کو خوش آمدید، دوست بڑے چاؤ سے آیا ہے جو اس سے شرمندہ ہوا وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

اس کے بعد یہ متقی و پرہیزگار اور عظیم روح اللہ کی جوار رحمت میں پہنچ گئی۔

کھولنے والے روشن کر دینے والے مزید

اسلامی واقعات کا انتخاب پر دھیان

صفحہ ۷۴ پر

ہے جو آخر دم تک ثابت قدم رہتا ہے اور جو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے وہ ناکام و نامراد ہوتا ہے۔

ایسے موقع پر کامیاب سپہ سالار کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ فریق ثانی کے حالات سے باخبر رہے۔ سپہ سالار اعظم ﷺ بھی کفار کے حالات سے باخبر ہونے کے لیے کسی ایسے موزوں شخص کی تلاش میں نکلے جو انہیں حالات سے باخبر کر دے۔ آپ ﷺ کی نگاہ مبارک جا کے جس موزوں شخصیت پر پڑی وہ حضرت حذیفہ بن یمان تھے۔

آپ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ صحابہ کرام کو اپنی نگاہ بصیرت سے خوب اچھی طرح جانچتے۔ جس صحابی میں کوئی خوبی پاتے، مناسب وقت پر اس سے وہ کام لے لیتے۔ آپ ﷺ نے حضرت حذیفہؓ میں جو خوبیاں پائی تھیں۔ ان میں سے احساس ذمہ داری اور رازداری آپؓ کی قابل دید خوبیاں تھیں۔

اسی لیے آپ ﷺ خفیہ امور آپؓ ہی کو بتاتے تھے۔ آپؓ کے علاوہ کسی کو بھی ان کی خبر نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ نے ریاست مدینہ کے اندرونی دشمنوں یعنی منافقین کے نام فقط حضرت حذیفہؓ ہی کو بتائے تھے۔

بعض اکابر صحابہ کرام نے بہت کوشش کی کہ وہ ان سے نام آگلوئیں لیکن آپؓ مرتے دم تک راز اپنی زبان پر نہ لائے۔ حضرت عمرؓ جب آپؓ سے منافقین کے نام معلوم نہ کر سکے تو لوگوں سے پوچھتے کہ حذیفہؓ فلاں شخص کے جنازے میں شریک ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر حضرت حذیفہؓ شریک ہوتے آپؓ سمجھ جاتے کہ یہ منافق نہیں تھا اور اگر حذیفہؓ شریک نہ ہوتے تو آپؓ سمجھ جاتے کہ یہ منافق تھا۔

یہ ان خصوصیات کی مثالیں تھیں جو حضور اکرم ﷺ نے حضرت حذیفہؓ بن یمانؓ میں پائی تھیں۔ ان ہی خصوصیات کی بناء پر حضرت عمرؓ نے جب انھیں مدائن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان کے استقبال کے لیے شہر کے امراء اور سردار شہر کے باہر

ایک بار ان کے ساتھ سائیکل پر حادثہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ایک دن میرے دفتر آئے اور کہنے لگے۔ ”صادق صاحب مجھے آپ کی مدد چاہیے۔“

حادثے کے نتیجے میں ان کی ٹانگ میں راڈ ڈالا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ مالی ٹھران میں مبتلا ہو گئے تھے۔ میں نے فوراً حسب توفیق ان کی مالی امداد کر دی۔ وہ خاموشی سے شکر یہ ادا کر کے لوٹ گئے۔ دو دن بعد ان کی کال آئی:

”صادق صاحب! میں غریب مگر غیرت والا انسان ہوں۔ آپ نے مشکل وقت میں میری مدد کر کے بہت احسان کیا۔ میں بہت جلد آپ کا یہ ادھار چکا دوں گا۔“

تب میں نے انھیں کہا، یہ ادھار نہیں تھا۔ صرف آپ کی چھوٹی سی مدد کی تھی۔ مگر ظفر صاحب اس دن کے بعد میرے احسان مند ہو گئے۔ ان کا ایک تکیہ کلام تھا جو وہ فون پر کال کے اختتام پر ادا کرتے:

”ملتے ہیں بریک کے بعد۔“

میں اکثر سوچتا کہ دیکھنے میں ظفر صاحب جو لگتے ہیں، حقیقت میں کچھ اور ہیں۔ کئی بار میرے استفسار پر جواب دیتے کہ میں تنہا آدمی ہوں۔ خاندان شاد باغ میں رہتا ہے۔ ایک بڑا بھائی انگلینڈ میں مقیم ہے۔ میں نے کہا، آپ باہر کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہ اپنی چندھیائی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر کہتے:

”سر! یہ دنیا بڑی مشکل جگہ ہے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ سب غرض کے رشتے ہیں۔ میں محنت کر کے بڑی مشکل سے پیٹ پالتا ہوں۔ عمر کے اس حصے میں مشقت والا کام کرنا آسان نہیں، مگر کیا کروں، مجبوری ہے۔“

اکثر دفتر میں مجھے کال کرتے کہ صادق صاحب! ”آپ کا چھوٹا دروازہ اکثر تھوڑا کھلا ہوتا ہے۔ حالات بڑے خراب ہیں۔ اپنے ملازمین کو تاکید کیا کریں کہ دروازہ بند

رکھا کریں۔ ملتے ہیں بریک کے بعد۔“

ایک بار سخت سردیوں کی رات میں پانی کی موٹر خراب ہو گئی۔ دس بجے کا وقت تھا۔ اس وقت کسی کاریگر کا ملنا مشکل لگ رہا تھا۔ میں نے ظفر صاحب کو فون کیا تو کہنے لگے، طبیعت خراب ہے لہذا آنا مشکل ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد ان کی کال آئی کہ میں آ رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد اپنی سپورٹس سائیکل پر سردی سے ہانپتے کانپتے آئے اور موٹر کا نقص ٹھیک کیا۔ میں نے شکر یہ ادا کیا تو کہنے لگے ”صادق صاحب! میں غریب ضرور ہوں خود غرض نہیں۔ آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔“

ایک دن کہنے لگے ”میرے بھائی نے مجھے باہر بلائے کا وعدہ کیا ہے۔ لہذا کچھ عرصے بعد شاید میں باہر چلا جاؤں۔ وہ تو باہر نہ گئے، ہمیشہ لوگوں کی موٹر میں ٹھیک کرتے ہی نظر آئے۔ پھر ایک دن کہنے لگے، مجھے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کے ایک ڈرامے میں مختصر سا کردار ملا ہے۔ اس کی آمدنی ہوگی تو پھر اکاؤنٹ کی ضرورت پیش آئے گی۔ میں نے اپنے بینک میں ان کا اکاؤنٹ کھلوادیا۔ کافی دنوں بعد

بامحاورہ اُردو

ایک بار حضرت داؤدؑ اپنے ساتھیوں سمیت پھول والوں کی سیر میں گئے۔ داؤدؑ پان کے رسیا تھے۔ ایک جوان اور شوخ پنواژن کی دکان بھی دیکھ کر اس کی طرف بڑھے اور پنواژن سے بولے، ”بی پنواژن! اس پان لگانا۔“

پنواژن نے جوتی کی نوک پر ہاتھ لگا کر کہا، ”کیسا فرمایا، کتنے لگاؤں؟“

مرزا داؤدؑ جھینپ گئے اور پنواژن سے صحیح محاورہ سن کر چوکڑی بھول گئے اور سنہیل کے ہوئے، ”دس پان بنانا۔“

دلی کی پنواژنیں بھی بامحاورہ اُردو بولتی تھیں۔

قلعہ کی مارکیٹ میں نظر آئے۔ میں نے پوچھا تو سرد آہ بھر کر کہنے لگے:

”سر جی! کام کچھ چلتا نظر نہیں آ رہا۔“

پھر ایک روز کام کے دوران بتایا ”کافی دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں۔ سینے پر بوجھ پڑا رہتا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے آرام کرو۔ بھلا اب آپ ہی بتائیں کہ آرام کروں گا تو کمرے کا کرایہ کہاں سے دوں گا، دو وقت کی روٹی کا ہمدوست کہاں سے ہوگا؟ سرکاری اسپتال جاتا ہوں تو وہاں نفسیاتی کا عالم ہے۔ غریب آخر کہاں جائے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں گھر کا کھانا کھاؤ۔ میں تو اکیلا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ بہت مشکل ہے۔ یہ زندگی بڑی ظالم شے ہے۔“

وقت گزرتا چلا گیا۔ کافی دن بعد ظفر صاحب مارکیٹ میں ایک جگہ خاموش بیٹھے نظر آئے۔ میں نزدیک سے گزرا تو مجھے سلام کیا۔ میں نے حال احوال دریافت کیا تو کہنے لگے:

”کارڈیالوجی اسپتال میں ایک دوست نے بڑے ڈاکٹر سے وقت لے کر دیا ہے۔ اس نے ایک ماہ بعد آنے کو کہا ہے۔ اس ٹیسٹ میں پتا چل جائے گا کہ کیا مسئلہ ہے۔ آپ دُعا کریں۔“

میں نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور آگے بڑھ گیا۔ دو دن بعد میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ ان کی کال آئی کہ میرا اکاؤنٹ بند ہو گیا ہے۔ کچھ پیسے جمع کروا کر اسے چلانا چاہتا ہوں۔ میں نے طریقہ کار بتایا تو کہنے لگے، ”صادق صاحب آپ ہمیشہ میری مدد کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ ملتے ہیں بریک کے بعد!“

۲۶ مارچ ۲۰۱۷ بروز اتوار مجھے سینٹری کا ایک مسئلہ درپیش آ گیا۔ دوپہر کے وقت میں نے ظفر صاحب کا نمبر ملا یا۔ کافی دیر بعد کال ملی۔

ایک نامانوس سی آواز نے ہیلو کہا۔ پیچھے ٹریفک کا شور

تھا۔ میں سمجھا شاید رانگ نمبر مل گیا ہے۔ دوبارہ نمبر ڈائل کیا تو اسی نامانوس شخص نے ہیلو کیا۔ میں نے کہا:

”یہ ظفر پلیمبر کا نمبر ہے؟“

اس آدمی نے جواب دیا۔ ”ہاں جناب۔ آپ کون بول رہے ہیں؟“

”ظفر صاحب سے بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔

ٹریفک کے شور میں اس آدمی نے ذرا توقف سے کہا

”جی۔ ظفر صاحب تو ابھی گھنٹا پہلے فوت ہو گئے ہیں۔“

پس کن میں سٹائے میں آ گیا۔ ایسا لگا جیسے وہ آواز کسی گہرے کنویں سے آرہی ہے۔

”کیا مطلب...! آپ کون ہیں؟“ الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔

”جی! میں انھیں تھوڑی دیر پہلے اسپتال لے کر آیا تھا۔

وہ انتقال کر گئے ہیں۔ دل کا دورہ پڑا تھا۔“ وہ آدمی بولتا جا رہا

تھا۔ ”کیا آپ ان کے کسی عزیز کو جانتے ہیں۔ مجھے ان کے

لواحقین کو اطلاع کرنی ہے۔“

”ہیلو... ہیلو...!“

مجھے سمجھ نہ آیا کیا کہوں، بمشکل کہہ سکا۔ ”نہیں بھائی۔

میں ان کے کسی عزیز پر رشتے دار کو نہیں جانتا۔ میں تو ان سے

کام کرواتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے فون کاٹ دیا۔ اور کیا کرتا؟ میں نے تو

ایک غریب پلیمبر کو فون کیا تھا جو دن رات لوگوں کی موٹر میں

مرمت کر کے پیٹ پالتا تھا۔ اس کی جڈ و جہد آج ختم ہو گئی۔

زندگی کی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک مزدور خاموشی سے دنیا

سے چلا گیا۔ کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے بھی شاید کوئی فرق

نہیں پڑا۔ کسی اور پلیمبر کو بلا کر اپنا کام کروا لیا مگر ظفر صاحب

کے الفاظ بہت دنوں تک میری سماعت میں گونجتے رہے:

”ملتے ہیں بریک کے بعد!“

ایک دفعہ مدینہ منورہ سے ایک شخص کوفہ آیا۔ وہ اس غرض سے آیا تھا کہ گھریلو ضروریات کا ساز و سامان خرید سکے اور چیزوں کے علاوہ اسے کپڑے کی خریداری بھی کرنا تھی۔ کوفہ میں اس نے اپنے دوستوں سے خاص قسم کے کپڑے خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے کہا ”اگر آپ کو اعلیٰ معیار کا کپڑا



ایماندار تاجر

کھوئی راہ روشن کر دینے والے سبق آموز
اسلامی واقعات کا چھوٹا انتخاب

اس پر بحث نہ کرنا۔ قیمت کم کروانے کے لیے ہرگز یہ جھگڑنا نہ ہو۔ وہ صرف ایک ہی بات کرتے ہیں۔ ایک ہی قیمت دیتے ہیں جو پہلی اور آخری ہوتی ہے۔“

وہ شخص دوستوں کے مشورے پر حضرت امام ابو حنیفہؒ کی دکان پر پہنچا۔ وہ دکان پر موجود نہیں تھے۔ وہاں ایک شاگرد بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص نے یہی سمجھا کہ ابو حنیفہؒ ہی دکان پر بیٹھے ہیں۔ اس نے مطلوبہ کپڑا لیا۔ اسے پسند کیا اور قیمت دریافت کی۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد نے اسے بتایا ”یہ کپڑا ایک ہزار درہم کا ہے۔“

اس شخص نے دوستوں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دکان پر ایک ہزار درہم ادا کیے اور کپڑا خرید کر آگیا۔ اس کے بعد وہ اپنی دوسری خریداری مکمل کر کے واپس مدینہ روانہ ہوا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت امام ابو حنیفہؒ نے کسی درت سے اس کپڑے کے بارے میں اپنے شاگرد سے دریافت کیا۔ اس نے بتایا ”جناب وہ کپڑا تو بک گیا۔“ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے پوچھا ”کتنے میں؟“

شاگرد نے بتایا ”جناب! وہ کپڑا میں نے ایک ہزار درہم میں بیچا۔“ آپ نے شاگرد سے پوچھا ”کس کے پاس بیچا؟“ شاگرد نے بتایا ”ایک شخص مدینہ منورہ سے آیا تھا، اس کے پاس بیچا تھا۔“

حضرت امام ابو حنیفہؒ ایک ہزار درہم لیے اس شخص کی تلاش میں مدینہ منورہ پہنچے جو کپڑا خرید کر لے گیا تھا۔ کافی تلاش کے بعد آپ کو وہ شخص مل گیا۔ دیکھا کہ اس شخص نے وہی کپڑا پہنا ہوا ہے اور مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ بھی وہاں نماز پڑھنے

لگے۔ جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کی طرف پہنچے، تو آپ نے بڑھ کر اس شخص کو سلام کیا۔ سلام دعا کے بعد حضرت امام ابو حنیفہؒ نے اس شخص سے کہا۔ ”بھائی! یہ جو کپڑا تم نے پہن رکھا ہے یہ میرا ہے۔“

وہ شخص از حد حیران ہوا اور کہنے لگا ”جناب! آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کپڑا آپ کا ہے۔ میں نے تو یہ کپڑا کوفہ سے ابو حنیفہؒ کی دکان سے ایک ہزار درہم میں خریدا ہے۔“

حضرت امام ابو حنیفہؒ نے کہا ”اگر تم ابو حنیفہ کو دیکھ لو تو پہچان لو گے؟“

اس شخص نے کہا ”بالکل! میں ابو حنیفہؒ کو فوراً پہچان لوں گا کیونکہ میں نے ان ہی سے تو یہ کپڑا خریدا تھا۔“ حضرت نے اس شخص سے کہا ”ابو حنیفہ تو میں خود ہوں۔“

کیا آپ نے یہ کپڑا مجھ سے خریدا تھا؟“ اس نے کہا ”میں نے یہ کپڑا آپ سے تو نہیں خریدا۔ وہ تو کوئی اور شخص تھا جسے میں ابو حنیفہؒ سمجھا۔“

حضرت امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ”اچھا! جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب یوں کرو کہ اپنے ہزار درہم واپس لے لو اور مجھے میرا کپڑا دے دو۔ دراصل یہ کپڑا میرے ایک شاگرد نے آپ کے پاس بیچا تھا۔ اب میں اس کپڑے کو واپس لینے آیا ہوں۔“

اس شخص نے کہا ”حضرت! میں اس کپڑے کو کئی مرتبہ پہن چکا۔ اب یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ کپڑا استعمال کرنے کے بعد اسے آپ کو واپس کر دوں۔ ہاں! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کپڑا اس قیمت سے زیادہ کا تھا جتنی قیمت پر میں نے خریدا اور آپ کے شاگرد نے بیچا تو میں زائد رقم دینے کو تیار ہوں۔ آپ بتائیے کہ زائد قیمت کتنی بنتی ہے؟“ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے کہا ”میں! ایسا ہرگز

نہیں۔ میں آپ سے زائد قیمت لینے نہیں آیا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اس کپڑے کی صحیح قیمت چار سو درہم ہے۔ میرے شاگرد نے آپ کو اسے ہزار درہم میں فروخت کر دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ چھ سو درہم آپ کو واپس کر دوں اور کپڑا بھی آپ کے پاس رہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملے پر آپ رضامند ہو جائیں گے۔ اگر یہ صورت آپ کو پسند نہیں تو ازراہ صلہ لطف و کرم میرا کپڑا مجھے واپس کر کے ایک ہزار درہم کی رقم واپس لے لیں۔ البتہ اس دوران آپ نے یہ کپڑا جو بار بار استعمال کیا ہے اس کی میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔“

اس شخص نے کہا ”حضرت اب میں کسی صورت یہ کپڑا واپس کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے یہ کپڑا ایک ہزار درہم میں اپنی خوشی سے خریدا تھا۔ اس لیے ایک ہزار درہم میں ہی یہ کپڑا میرے پاس رہنے دیں۔ میں اب اسے واپس نہیں کروں گا۔“

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اپنی بات پر ڈٹے اور برابر اصرار کرتے رہے۔ آخر کار وہ شخص مجبور ہو کر اس بات پر رضامند ہو گیا کہ چھ سو درہم کی رقم واپس لے اور چار سو درہم کے عوض کپڑا بھی اس کے پاس رہے۔ اس شخص کی رضا مندی پر حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ از حد خوش ہوئے۔ چنانچہ چھ سو درہم کی رقم اسے واپس کر کے ہی مدینہ منورہ سے کو فلوٹے۔ (المنقب الموفق)

آخر معاملہ کیا ہے؟

اس کا پیشہ جواہرات کی تجارت تھا۔ ایک مرتبہ وہ تجارت کی غرض سے روم پہنچا۔ وہاں اس کی ملاقات قصر روم کے ایک وزیر سے ہوئی۔ دوران گفتگو وزیر نے اس سے کہا ”ہم آج ایک جگہ جا رہے ہیں۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ اس سے ہمیں خوشی ہوگی۔“ اس نے وزیر کے اظہار دعوت پر پسندیدگی اور

رضامندی کا جواب دیا اور ساتھ چل پڑا۔ وزیر اسے ایک جنگل کی طرف لے گیا۔ جب وہ جنگل میں پہنچا تو وہاں ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ جنگل میں انتہائی خوبصورت اور بیش قیمت خیمہ نصب تھا اور ایک بہت بڑا لشکر خیمے کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ جب لشکر خیمے کے گرد چکر لگا چکا تو پھر حکیموں اور فلاسفوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے خیمے کے گرد چکر لگایا۔ بعد ازاں بے شمار حسین و جمیل عورتیں قیمتی لباس زیب تن کیے نایاب زر و جواہرات کے تھال اٹھائے خیمے کے چکر لگانے میں مصروف ہو گئیں۔

جب یہ سب لوگ خیمے کے گرد چکر لگا چکے تو پھر بادشاہ اور وزیر اس خیمے کے اندر تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر اندر ٹھہرنے کے بعد باہر نکل آئے۔

وہ یہ سارا منظر از حد حیرت، استعجاب اور انہماک کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ وہ کافی دیر تک سوچتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ بالآخر اس نے وزیر سے پوچھا ”یہ سب کچھ کیا ہے؟“

وزیر نے اسے بتایا ”قصر روم کو رب کائنات نے انتہائی خوبصورت اکلوتا بیٹا عطا فرمایا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا وہ عین عالم شباب میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کی تہریر خیمے کے اندر موجود ہے۔ اس کی وفات کی برسی پر ہر سال ہم لوگ اسی شان و شوکت کے ساتھ یہاں آتے اور یہ سب کچھ کرتے ہیں۔“

اس نے وزیر سے پوچھا ”آخر تم یہ سب کچھ کیوں کرتے ہو؟“

وزیر نے بتایا ”اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم مرنے والے کو یہ باور کروادیں، اگر تجھے زندہ کرنے میں کوئی بھی کوشش کارگر ہو سکتی تو ہم ضرور ایسا کرتے۔ ہم تجھے زندہ کرنے کے لیے اپنی تمام فوج، حکیم، فلاسفر، مال و دولت حتیٰ کہ سب کچھ تجھ پر نچھاور کر دیتے۔ اگر ہم جانتے کہ اس

لے سے تو زندہ ہو جائے گا، تو سب کچھ کرتے مگر انفس نہ تیرا معاملہ ایسی عظمت والی ذات اقدس سے ہے جو ہات دھمت کی مالک ہے جس کے مقابلے میں ساری مائمی تو کیا، ساری کائنات کی طاقت اور قوت بھی بالکل کمزور رہتی۔ زندہ رکھنے اور مارنے کا اختیار صرف اسی ذات واحد کو ہے۔“

وہ شخص بصرہ سے تجارت کی غرض سے روم پہنچا تھا۔ اس کے وزیر کی یہ باتیں سنیں تو دل میں ایسا انقلاب برپا ہوا کہ وہ تمام کار و بار اور مال و متاع روم میں چھوڑ کر واپس اپنے گھر بصرہ پہنچا اور جس قدر بھی بیش قیمت جواہرات اس کے پاس موجود تھے، وہ سب اللہ کی راہ میں غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیے اور ترک دنیا کی راہ اختیار کر کے اپنا تعلق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے جوڑ لیا۔ اس قدر عبادت کی کہ رہتی دنیا تک اس کا نام زندہ نہ تانبہ رہا۔ کاکیکو تک وہ اب محض حسن نام کا ایک تاجر نہیں رہا تھا بلکہ وہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ بن چکے تھے۔

ایک اٹکھا تحفہ

ایک غیبت گو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے دور میں اسی موجود تھا۔ اس کا ہر لمحہ دوسروں کی غیبت جوئی کی کرتا۔ سارا دن ایک سے دوسری جگہ پہنچتا۔ ایک کی دہائی دوسرے کے پاس اور دوسرے کی تیسرے کے پاس آتا۔ ایک ساعت ایک مقام پر تو دوسری ساعت دوسرے مقام پر گزرتا۔ وہ جہاں جاتا کسی نے کسی کو اپنی بے وفائی کا نشانہ نہ بتاتا۔ اس کی ناپائیدار زندگی کے شب و روز اسی طرح بسر ہو رہے تھے۔ جس کسی کو معلوم ہوتا کہ اس شخص کو نے اس کے بارے میں یہ کچھ کہا ہے تو وہ غم زدہ ہو کر رہ جاتا۔ کچھ لوگ اپنی صفائی بیان کرتے تو کچھ خاموش رہ جاتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فن میں ماہر ہو چکا تھا۔

ایک وقت آیا کہ اس نے وقت کے ولی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کو بھی نہ چھوڑا اور ان کی غیبت سے اپنے دامن کو آلودہ کر لیا۔ لوگوں نے سنا تو اسے ٹوکا مگر وہ کب رکنے والا تھا۔ مریدین نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کو اس کے بارے میں بتایا کہ وہ آپ کے متعلق ایسی باتیں بناتا پھرتا ہے۔

ولی اللہ کے ہر کام کا اپنا جدا انداز ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے سنا تو فوراً اپنے ایک مرید کو آواز دی۔ مرید حاضر خدمت ہوا اور عرض کی ”فرمائیے جناب! کیا حکم ہے؟“

حضرت حسن بصری نے کہا ”یہ لو پیسے، جیب میں ڈالو اور ابھی اسی وقت بازار جاؤ، وہاں سے تازہ اٹلی چھو باروں کا ایک ٹوکرا خرید لاؤ۔“

مرید دوڑا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد چھو باروں کا ایک ٹوکرا لا حاضر کیا۔ حضرت نے ان چھو باروں کو ایک طباق میں سجایا اور ایک مرید خاص کو کہا ”طباق کو اس شخص کے پاس لے جاؤ جو ہماری غیبت کرتا ہے۔ اسے یہ پیش کرو اور ہماری طرف سے کہو کہ یہ تحفہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کا از حد شکر گزار اور ممنون ہوں کہ آپ نے میری غیبت کر کے اپنی نیکیوں کو میرے دفتر اعمال میں منتقل کر دیا۔ میں آپ کی یہ عنایت ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اگرچہ میں آپ کے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا تاہم یہ حقیر سائنحہ قبول فرمائے۔“

مرید خاص نے حضرت کے حکم کی تعمیل میں آپ کا پیغام اور چھو باروں سے بھرا طباق غیبت گو تک پہنچایا۔ وہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے اس قول و فعل سے اپنے کیے پر شرمندہ اور نادم ہوا۔ اس نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی طلب کی اور غیبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۲ میں رب کائنات ارشاد فرماتا ہے:

اسی رات فیض اور فرازمیر سے پاس آئے اور کہنے لگے جالب تم جلدی سے اس میٹنگ پر کوئی نظم لکھ دو۔ میں نے کہا میں نے ہمیشہ زندہ شاعری کی ہے مری ہوئی شاعری کبھی نہیں کی۔ تم دونوں کو شش کرو۔ دونوں چلے گئے۔ میں یہاں پاکستان ٹیلی ویژن دیکھتا ہوں۔ ن لیگ کے روشنی کے اشتہار جو تاریکی سے بھرے ہوتے ہیں، دیکھ کر دل خراب ہو جاتا ہے۔ بجلی کا حال اگر تمہارے یہاں بھی رہا تو آنے والے دنوں میں تم لوگ ایمان کی روشنی میں نقب لگا کر ٹیلی ویژن دیکھو گے۔ میں نے تمہارا ۱۴ اگست کا

پروگرام دیکھا۔

تم کو پروگرام کا آغاز میرے اس شعر سے کرنا چاہیے

تھا۔

بہتے لبو میں سب تیرا مفہوم یہ گیا

۱۴ اگست صرف تیرا نام رہ گیا...

یہاں مجھے ایک ہی بات کا افسوس ہے کہ تم ابھی تک

گرفتار نہیں ہوئے۔ تم اسیری کے لطف سے آج تک

ناواقف ہو۔ میری تو آدھی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے

گزری۔ سلاخوں کے پیچھے ساری قوم کو جالب قیدی نظر آتا تھا

مگر سلاخوں کے سامنے جالب کو ساری قوم قیدی نظر آتی تھی۔

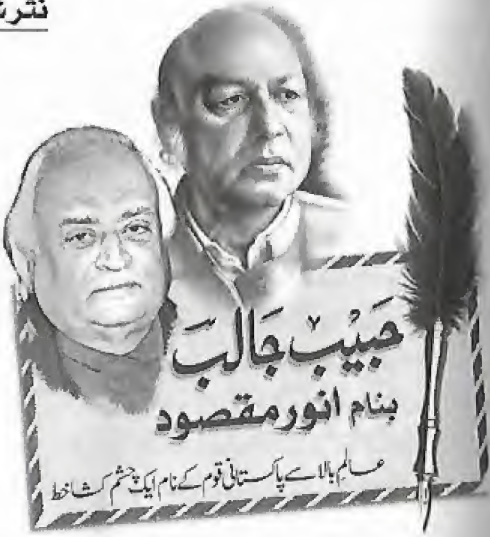
میرے ایک رشہ دار ہیں، ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی

ہے۔ ان کا خط میرے پاس آیا۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ

بیٹی کا نام کیا رکھوں؟ میں نے خط لکھ کر کہا۔ فیصلہ رکھ لو۔ کم از

کم محفوظ تو رہے گی۔

میں ہر جمعے کی شام قائد اعظم اور فاطمہ جناح سے ملنے جاتا



حبیب جالب
بنام انور مقصود

عالم بالا سے پاکستانی قوم کے نام ایک چشم کشا خط

اردو کے آخری عوامی شاعر حبیب جالب صاحب کو میں نے

خط لکھا اور یہ جواب میرے پاس آیا:

انور میں تم کو اب تک ۲۵ خط لکھ چکا ہوں۔ اب جالب

جالب تو نہیں کہ ہر خط کی دو کاپیاں بناؤں ایک چھپنے کے

لیے اور ایک بچھنے کے لیے۔ اگر میرے خط تمہارے پاس

محفوظ ہیں تو یہاں آنے والے کسی شاعر یا ادیب کے ہاتھ بھجوا

دینا۔

لائل پور کا نام جب تم لوگوں نے فیصل آباد رکھ دیا تو میں

نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ اب وہ شہر میرا نہیں رانا ثناء اللہ کا

ہے۔ تمہارے خط سے پاکستان کے حالات معلوم ہوئے۔

یہاں کے حالات بھی کچھ کچھ پاکستان کی طرح ہیں۔ کل

یہاں ایوب خان، بیجی خان، جنرل موسیٰ اور ضیاء الحق کی

میٹنگ تھی۔ یہ بات ہم لوگوں کو یہاں کی آئی ایس پی آر کے

نوٹس سے معلوم ہوئی۔ صدیق سالک یہاں کی آئی ایس پی

آر کے انچارج ہیں۔

سے فراغت کے بعد وہ سیدھے ہسائے کے مکان پر گئے اور دستک دی۔

ایک بچی روتی ہوئی باہر آئی۔ اس سے پوچھا ”بیٹا! وہ

کہاں ہیں؟ خیریت سے تو ہیں!“

بچی نے بتایا ”آوارہ گردی کے جرم میں کوئٹہ شہر نے

میرے باپ کو گرفتار کر لیا ہے۔ یوں وہ تمام رات کو توالی

میں رہے اس وقت بھی وہیں ہیں۔“

جیسے ہی انھوں نے اپنے ہسائے کی گرفتاری کی خبر سنی

فوراً کوئٹہ پہنچے۔ کوئٹہ شہر کو آپ کی آمد کا علم ہوا تو خوشی

اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ استقبال کرنے کے باہر

آیا۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ اتنی بڑی شخصیت نے اس

کے ہاں خود آکر ملاقات کا شرف بخشا مگر وہ حیران تھا کہ وہ

کوئی بات تھی جو انھیں کوئٹہ تک لے آئی۔

کوئٹہ شہر نے ان سے دست بستہ عرض کی ”فرمائیے

جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

انھوں نے کہا ”میں اپنے پڑوسی کی سفارش سے لے کر حاضر

ہوا ہوں۔ ہو سکے تو اسے رہا کر دیجیے۔“

کوئٹہ شہر نے کہا ”عالی مرتبت! آپ کا کہا تو

میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ میں آپ کے پڑوسی کو تو کیا

بلکہ اس رات جتنے لوگ گرفتار ہوئے ہیں، سب کو رہا کرنا

ہوں۔“

جب وہ اپنے پڑوسی کو کوئٹہ لے رہا کروا کر اپنے ساتھ

لا رہے تھے تو انھوں نے اپنے پڑوسی سے کہا ”تو اکثر گایا

کرتا تھا کہ لوگوں نے تجھے کھو دیا۔! کیا میں نے تجھے

کھوایا؟“

ان کی اس بات کا وہ کیا جواب دیتا۔ اس کی آنکھوں

سے آنسو رواں تھے۔ اس نے صرف اتنا کہا ”اے امام! وہ

حنیف! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے مجھے نہیں

کھوایا بلکہ میں نے آپ کی بدولت اللہ کو پایا ہے۔“

”اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو۔ بلا شبہ بعض گمان گناہ ہیں اور جاسوسی بھی نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ اس کو تو تم ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم والا ہے۔“

مسجد سے کوئٹہ تک

آج رات خاموشی رہی۔ کوئی شور شراب یا ہنگامہ نہیں۔

کوئی ساز و آہنگ کا طوفان نہیں جو ان کی نماز، عجز و نیاز،

تلاوت اور عبادت میں خلل انداز ہو۔ ورنہ یہ تو روز کا معمول

تھا کہ ان کا ہسپا شراب پی کر غل غپاڑہ کیا کرتا تھا۔ بدستی

اور بدتمیزی کا ایسا مظاہرہ ہوتا کہ سکون کا سانس لینا دشوار تھا۔

اس ہل بازی میں وہ ایک شعر بھی چلا چلا کر پڑھتا تھا جس کا

مفہوم تھا کہ لوگوں نے مجھے کھو دیا اور مجھے کھو کر ایسے شخص کو

کھو دیا جو لڑائی کے روز کام آنے والا تھا۔

اس سب ہنگامے کے باوجود وہ تمام رات بارگاہ رب

العزت میں سجدہ ریز رہتے۔ روزانہ ایک قرآن ختم کرتے

اور تہجد کے لمحات سعید میں تو ان پر خاص قسم کی روحانی

سرشاری اور ایمانی خمار طاری ہوتا۔ تاہم انھوں نے اپنے

ہسائے سے کبھی شکوہ و شکایت کا ایک لفظ تک نہ کہا کہ اس کا

لے بہنگ سرگم ان کی عبادت و ریاضت میں کس قدر بدمزگی

پیدا کرتا ہے۔ وہ تو محض ہسائے کی گنجائش کے اس کی اس

ایذا رسانی پر صبر فرماتے۔

مگر آج رات مکمل خاموشی رہی۔ رات خراماں

خراماں اپنا سفر مکمل کیا یہی چاہتی تھی۔ تہجد کا وقت تھا اور یہ

وقت بھی سکون سے گزر گیا۔ اتنے میں مؤذن نے اللہ اکبر

کی صدا لگائی۔ وہ مسجد کی جانب تشریف لے گئے مگر تمام

راستے ذکر کے ساتھ ساتھ اس فکر میں رہے کہ آخر آج

میرے پڑوس میں سناٹا کیوں ہے! اللہ خیر کرے! نماز

ہوں۔ وہ دونوں کہیں نہیں جاتے۔ میں نے قائد سے کہا پاکستان میں آپ کی سالگرہ کا کیک کوئی نہیں کاٹا۔ قائد نے کہا، جالب میں نے پاکستان ایک کیک کی طرح اس قوم کو پیش کیا تھا، جس کو اس قوم نے ۱۹۷۱ء میں کاٹ دیا۔ آدھا کیک بنگلہ دیش بن گیا، آدھا مغربی سیاست دان کھا گئے۔ ہم لوگ پاکستان کی باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں رئیس امر وی آگئے۔ یہ بھی جیسے کی شام قائد سے ملنے آ جاتے ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح نے کہا ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اب لوگ قائد کے مزار پر بھی جاتے ہیں یا نہیں۔ رئیس نے اپنے چار مصرعے سنائے:

بہت سے لوگ جدائی میں جان کھوتے ہیں
بہت سے اشک سے نوک نثرہ جھگوتے ہیں
بہت سے لوگ جنہیں ضبط غم کے دعوے تھے
مزار قائد اعظم پہ حبا کر روتے ہیں.....

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد قائد نے پوچھا: رئیس مہاجروں کا کیا حال ہے؟ رئیس نے کہا قائد! لندن میں تو مہاجر خوش ہیں مگر کراچی میں مہاجروں کا حال تباہ ہے۔ میں نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا

جو زندگی بہ فراغت گزر نہیں سکتی
تو زندگی کی رہ تنگ سے گزر حباؤ
مہاجرین غریب دیار پاکستان
تمہارے حق میں مناسب یہ ہے کہ مر جاؤ
میں نے رئیس سے کہا، آپ لوگ خود کو مہاجر کیوں کہتے ہیں؟ بتائیے قائد!

سنوہ ادائے تکلم سے احتیاط زباں
مگر یہ ضد ہے کہ ہمیں اہل لکھنؤ کہیے
بھول جائیں لفظ مہاجر۔ اب آپ لوگ سندی ہیں۔
رئیس غصے میں آگئے۔ کہنے لگے، اپنے نام سے امر وہ نکال
دون رئیس ٹیڈ ورکھ لوں؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے

قائد کہ جب تک ن لیگ کی حکومت ہے، مہاجر پریشان ہی رہیں گے اور مجھے ن کی حکومت جاتی نظر نہیں آتی۔ اگلے الیکشن میں بھی لگتا ہے کہ یہی جیتیں گے۔ جس کی وجہ ہے مسلمان میں ن، پاکستان میں ”ن“، پاکستان کے صدر منون میں ”ن“، پاکستان کے وزیر اعظم خاقان میں ”ن“، پاکستان کے قانون میں ”ن“، پاکستان کے نظام میں ”ن“، سرکاری افسران میں ”ن“، سب تو ”ن“ سے ہی شروع ہوتا ہے۔ نیشنل بینک آف پاکستان شروع ”ن“ سے ہوتا ہے اور ختم ”ن“ پر ہوتا ہے۔ میں نے رئیس سے کہا، اس طرح تو بے ایمان میں ”ن“، بجلی کے بحران میں ”ن“، تعلیم کے فقدان میں ”ن“، پچاب کے ہر پہلوں میں ”ن“، رئیس کہنے لگے، قائد! آپ کے زمانے میں کراچی پاکستان کا کیمپل تھا۔ اب پاکستان کا آدھا Capital دہلی میں ہے، پاؤ لندن میں ہے، پاؤ چینیا میں ہے۔ سارا قومی خزانہ ملک سے باہر ہے اور وزیر خزانہ تقریباً آندر۔ یہ ہے آپ کا پاکستان۔ دہشت گرد جب چاہتے ہیں ہزاروں بے گناہ مار دیتے ہیں۔ فاطمہ جناح نے کہا مسلم لیگ دہشت گردوں کے خلاف کیوں نہیں کھڑی ہوتی؟ رئیس بولے: صرف اس لیے محترمہ کہ طالبان میں بھی ”ن“ ہے۔

اللہ حافظ کہہ کر رئیس چلے گئے۔ قائد نے کہا اللہ پاکستان کی حفاظت کرے۔ محترمہ نے کہا، آمین۔ میں نے کہا محترمہ! آمین میں بھی ”ن“ ہے۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ اتنا طویل خط میں نے پہلے کبھی نہیں لکھا۔

مگر قائد اور رئیس کی باتیں سننا چاہ رہا تھا۔
تمہارے یہاں نہ آنے کا طالب...

♦♦♦ جالب پڑھیں

”اردو ادب کا چھلاوہ“

شوکت تھانوی کی شخصیت پر انوکھی تحریر صفحہ ۱۰۴ پر

ہائے میرے جوڑ

قدرتی غذاؤں کے ذریعے ایک
موزی بیماری سے نجات پالیں

۱۔ جسم میں یورک ایسڈ (uric acid) کی سطح کا بڑھنا عام سی بات ہوگئی ہے اور اکثر لوگ اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ یورک ایسڈ میں مسلسل اضافہ انسان کو خاص طور پر جوڑوں کے درد کا نشانہ بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے، آج کل جوڑوں کے درد میں مبتلا مریض ہمیں اپنے ارد گرد دکھائی دیتے ہیں۔ یورک ایسڈ سے جوڑوں میں درد، سوزش اور سوجن پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ انسان چلنے پھرنے سے بھی قاصر ہو جاتا ہے۔

یورک ایسڈ بڑھنے کی وجوہ بلڈ پریشر، موٹاپا، بخون کی کمی اور کچل ہیں۔ طبی ماہرین کے مطابق بہت زیادہ سرخ گوشت کا استعمال اسے بڑھاتا ہے۔ تاہم چند قدرتی غذاؤں کو اپنی غذا کا جزو بنا کر یورک ایسڈ کی اضافی سطح کو کم کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ یہ پھل جوڑوں کے سبھی امراض کا شکار مریضوں کے لیے بہترین غذا ہے۔ البتہ بطور علاج روزانہ آدھ سے نو کیلے کھانے پڑتے ہیں اور یہ عمل تین سے چار روز تک مسلسل جاری رہتا ہے۔ مرض سے چھڑکے کی واضح علامت یہ ہے کہ جوڑوں پر سوجن اور سوزش کم یا ختم ہو جائے گی۔

۳۔ یہ بھی ایک ایسی قدرتی غذا ہے جو جسم میں پائے جانے والے مضر صحت کیمیائی مادوں کی بلند سطح کے خلاف مزاحمت کرتی ہے۔ یہ مزید ارغذا یورک ایسڈ کم کر کے آپ کو گٹھیا

بیگم عامر ملک

سے آرام پہنچا سکتی ہے۔

سیب

سیب میں میلک (Malic) ایسڈ کی بھاری مقدار پائی جاتی ہے۔ یہ تیزاب قدرتی طور پر یورک ایسڈ کے اثرات بے اثر کرتا اور اس سے پیدا شدہ امراض میں آرام فراہم کرتا ہے۔ بہترین فوائد کے لیے روزانہ ایک سیب کھانا ضروری ہے۔

چیری

اس میں انٹوسینین (anthocyanin) نامی کیمیائی مادہ سوزش کے خلاف مزاحمت پیدا کرتا ہے۔ چیری نہ صرف یورک ایسڈ کی سطح بڑھنے سے روکتی بلکہ جسم کو مختلف کیمیائی سے جنم لینے والے مرکب کے نقصانات سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ یورک ایسڈ کی سطح میں کمی کے لیے روزانہ دو سو گرام چیری کھائیے۔

پانی

یہ سیال تمام جانداروں کے لیے ضروری ہے۔ پانی جسم میں موجود اضافی یورک ایسڈ اور ہر میلے مادے خارج کرتا ہے جس سے گٹھیا جاتا رہتا ہے۔ ماہرین کے مطابق روزانہ دس سے بارہ گلاس پانی ضرور پینا چاہیے۔

سبز یوں کا رس

جسم میں یورک ایسڈ کی سطح کم کرنے کا یہ آسان اور نہایت اہم گھریلو ٹوکا ہے۔ گاجر، کھیرے اور چغندر کے رس باہم شامل کر کے پینے سے آپ کو جوڑوں کے امراض سے نجات ملے گی۔

فابرونی غذا

یونیورسٹی آف میری لینڈ میڈیکل سینٹر کی ایک تحقیق کے مطابق ایسی غذائیں جن میں فابریک کی بھاری مقدار پائی جاتی ہے، جسم میں موجود یورک ایسڈ کی سطح کم کرتی ہیں۔

”نہیں، کرو بند۔“

اس نے دروازے کو تالا لگا دیا اور کاشف کو لیے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ انجمن کا اپارٹمنٹ بلڈنگ کی آکٹالیسویں منزل پر تھا۔ یہ پچاس منزلہ عمارت تھی۔ امریکا میں جہاں سو منزلوں سے بھی زیادہ پر مشتمل عمارتیں موجود ہیں، وہاں پچاس منزلہ عمارت کچھ زیادہ اونچی شمار نہیں ہوتی۔ یہاں منتقل ہونے سے پہلے انجمن جس اپارٹمنٹ میں رہائش پزیر تھا، اس کی ستر منازل تھیں۔ وہ اس سے بھی اونچی عمارتیں دیکھ چکا تھا۔ اس لیے یہ عمارت اسے زیادہ موزوں اور اچھی لگی تھی۔ تین سال میں وہ ان فلک بوس عمارتوں میں رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔

کاشف ابھی حال ہی میں امریکا آیا تھا۔ وہ انجمن کے پاس ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ دونوں دوست تھے۔ برسوں اکٹھے رہے۔ اسکول اور کالج میں ساتھ رہا۔ انجمن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکا چلا آیا۔ یہاں پڑھ رہا تھا اور ملازمت بھی کرتا۔ اپنے تعلیمی اخراجات اور رہن رہن کے لیے پیسہ قانون وقت میں کام کر کے ہی اکٹھا کیا جاسکتا تھا۔ عام طالب علم ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ تو پیسے کمانے میں اس طرح جت جاتے کہ پھر تعلیم کی طرف سے غافل ہی ہو جاتے۔ دو سال کا کورس چھ سال میں بھی سن کر

اکٹالیسویں منزل

امریکا کی بلند وبالا عمارتیں جب دو پاکستانی طلبہ ایک دلچسپ حادثے کا شکار ہو گئے

کاشف کے کمرے سے نکلنے کے بعد انجمن نے دروازہ بند کیا۔ لاک لگانے سے پہلے کاشف سے پوچھا ”بند کروں۔“ کوئی چیز تو نہیں لیٹی اندر سے؟“

پاتے لیکن جو سنجیدگی سے پڑھنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے کام، آرام اور تعلیم کے اوقات کا تقسیم کر رکھے تھے۔ انجمن کا شمار بھی ایسے ہی طالب علموں میں ہوتا تھا۔

امریکا جیسی جگہ میں کوئی طالب علم دوسرے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوتا ہے لہذا اپنا کماؤ کا اپنا کھانا ڈالنے لگتا ہے۔ انجمن نے یہ بات کاشف پر واضح کر دی تھی۔ فی الحال دونوں اکٹھے ہی رہ رہے تھے۔ کاشف کے پاس ابھی ساٹھ لائے ہوئے پیسے موجود تھے اور انجمن نے بھی کچھ رقم پس انداز کی ہوئی تھی۔ کاشف کی یونیورسٹی میں جماعتیں شروع ہونے میں ابھی دو ہفتے باقی تھے۔ انجمن نے دوست کے لیے وقتی طور پر کام بھی تلاش کر لیا تھا۔ یونیورسٹی کافی دور تھی۔ کاشف کو اسی علاقے میں رہائش کا بندوبست کرنا تھا جہاں یونیورسٹی تھی۔ انجمن اس کے لیے اپارٹمنٹ تلاش کر رہا تھا۔ کل بھی کافی وقت انھوں نے اس تلاش میں گزارا اور آج بھی وہ اسی کام کے لیے جا رہے تھے۔

لفٹ سے دونوں نیچے آئے۔ انجمن نے گیراج سے گاڑی نکالی۔ کاشف اس میں بیٹھنے ہوئے بولا۔ ”بھئی میرے لیے تو اپارٹمنٹ کسی ایک یا دو منزلہ عمارت میں ہی تلاش کرنا۔“

”کیوں۔“

”تمہارا ہی حوصلہ ہے جو ان اونچی اونچی عمارتوں میں رہ لیتے ہو۔“

”اونچی نیچی سے فرق کیا پڑتا ہے۔ ہر عمارت میں لفٹ موجود ہے۔ منٹوں میں اوپر منٹوں میں نیچے۔“

”لفٹ تو ہے لیکن.....“

”لیکن کیا۔“

”جو کبھی لفٹ خراب ہو جائے تو۔“

”جناب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اول تو ایسا کبھی ہوتا نہیں اگر ہو بھی جائے تو لفٹ کے ساتھ میڑھیاں بھی موجود ہیں۔ آنے اور جانے کے لیے لوگ انھیں متبادل کے طور پر

استعمال کرتے ہیں۔“

”تمہارے ساتھ کبھی ایسا اتفاق ہوا؟“

”نہیں، میرے قیام کے دوران کبھی لفٹ خراب نہیں ہوئی۔ ویسے لوگ میڑھیاں چڑھنے اترنے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ اپنی مصروف ترین زندگی میں یہی ورزش کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ تجربے کے لیے اترتے چپڑھتے ہیں۔“

”بے وقوف ہی ہوں گے۔“

”اپنی اپنی سوچ ہی ہے۔“

”تم بھی یہ ورزش کر کے دیکھو تو۔“

”نہ بابا، میں تو باز آیا۔ مجھے کیا مصیبت پڑی ہے۔“

”تجربہ کرنے میں کیا ہرج ہے۔“

”ہرج نہیں تو پھر تم ہی کر لو۔“

”میں..... تو بہ۔ تو بہ۔ میں تو کانوں کو ہاتھ لگا تا ہوں بھی۔ مجھے تو ہول آتا ہے یہ سوچ کر کہ اتنی اونچی عمارت میں رہ رہ رہے ہیں۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ میرے لیے کسی اکیلی دو کیلی منزل والی بلڈنگ میں جگہ تلاش کرنا۔“

”نہیں ملے گی۔“

”کوشش تو کرنا۔“

”سنے دنوں سے سرگرداں پھر کے دیکھ لیا نا۔“

”پنچلی منزلوں کے کرائے بھی تو زیادہ ہیں۔“

”وہ تو ہوں گے ہی۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے راستہ طے کر رہے تھے۔ کاشف نے جس علاقے میں رہنا تھا، وہ تقریباً تیس میل دور تھا۔ وہاں دو ایک ایسے اپارٹمنٹس کا پتا چلا تھا جہاں ہندوستانی اور پاکستانی طالب علم مل کر رہ رہے تھے۔ انجمن نے کاشف کو یہی مشورہ دیا تھا کہ کسی کے ساتھ رہ لے، اس طرح کافی بچت ہو جائے گی اور تنہائی کا احساس بھی زیادہ اذیت ناک نہیں ہوگا۔

کاشف کو یہ رائے پسند تو تھی لیکن مسئلہ وہی تھا۔ یہ اپارٹمنٹس بھی سٹر سٹر اسی منزل عمارات کے اندر تھے۔ کوئی باون منزل پر تھا، کوئی تیرہ منزل پر۔ ایک اپارٹمنٹ انھوں نے نکل ہی دیکھا تھا۔ وہ تیرہویں منزل پر تو تھا لیکن اتنا زیادہ کرایہ دینا ایک طالب علم کے بس میں نہیں تھا۔

اب دونوں صلاح کر رہے تھے۔ انجم نے کہا ”کوئی اور سٹوڈنٹ مل جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

”سٹوڈنٹ کسی اسٹور میں تو ملتے نہیں جو خرید کر لے آئیں۔“

”بات کرنا پڑے گی۔“ شاید کوئی آسانی ہاتھ آ ہی جائے۔ وہ جو کل انڈین اور پاکستانی سٹوڈنٹ ملے تھے، ان سے بات کرتے ہیں۔ شاید ان کے کسی واقف کار کو جگہ کی تلاش ہو۔

”یہ بات ٹھیک ہے۔ اللہ کرے یہ تیرہویں منزل والا کام بن جائے۔“

”تیرہویں منزل بھی تو کچھ کم اونچائی پر نہیں۔“

”پھر بھی تمہاری اس فلک بوس اپارٹمنٹ کی طرح تو نہیں۔“

”ایسے ہی خوفزدہ ہو۔ میرا خیال تھا تم کسی پاکستانی لڑکے سے شیئر کر لو گے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”تم چلو تو سہی۔ آج شاید تیرہویں منزل والا کام بن جائے۔“

”تیرہویں والا بنے یا تیرہویں والا، بہر حال آج طے کر کے آنا ہے۔ روز بروز میں چھپتی کر سکتا ہوں نہ اتنی دور آ جا سکتا ہوں۔“

”امریکا میں رہ کر مروت کا دامن بھی چھوڑ دیا،“ کاشف نے ہنس کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”یہاں اسے مروت نہیں بے وقوفی کہتے ہیں۔“ انجم نے

ہنس کر کہا ”گئے چنے پیسے ہوتے ہیں یا۔ اس میں اخراجات بھی پورے کرنا ہوتے اور ٹرم کی فیسوں کے لیے بھی جمع کرنا پڑتے ہیں۔ مروت میں تم پر ڈالر لکنا تاہا تو اس ٹرم کی فیس جمع نہیں کر داسکوں گا۔“

”میں سمجھتا ہوں یا۔ فکر نہ کرو، ابھی میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔“

”انھیں سنبھال کر رکھو۔ شروع شروع میں کافی خرچے آ جاتے ہیں۔ ایک ایک ڈالر قیمتی ہوتا ہے۔“

کاشف نے سر ہلایا۔ اسے یہاں کوئی تجربہ تو نہیں تھا لیکن اتنے دنوں سے انجم کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ واقعی اسے اگر تعلیم حاصل کرنے کی لگن تھی، تو ہر طرح سے محتاط ہو کر گزر بسر کرنا ضروری تھی۔ دونوں نے بڑا مصروف دن گزارا۔ انجم کا شرف کو جگہ جگہ لیے پھرتا رہا۔ ہندوستانی اور پاکستانی طلبہ سے بھی ملاقات کی۔ سب نے کاشف کو اپنے ساتھ ٹھہرانے کی پیشکش کر دی۔

لیکن کاشف متنبذ تھا۔ وہی تریسٹھویں بلڈنگ کا مسئلہ اسے تو تیرہویں منزل کا اپارٹمنٹ ہی بمشکل پسند آیا تھا۔ اسے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر کبھی خدا نخواستہ لفٹ خراب ہو جائے تو تریسٹھویں منزل تک آتے جاتے دم نکل سکتا ہے۔ تیرہ منزلیں تو ضرورت پڑنے پر سیدھیوں کے ذریعے طے کی جا سکتی تھیں۔ حالانکہ یہ بھی کم اونچائی نہ تھی،

پاکستان میں تو وہ بھی دوسری سے تیسری منزل پر بھی نہ گیا تھا۔ بچپن میں ایک دفعہ اندرون شہر وہ اپنے کسی عزیز کے ہاں اس کے پانچ منزلہ گھر میں گیا۔ امی سیزھیاں چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگی تھیں۔ وہ خود بھی تھک گیا۔ امی تیسری یا چوتھی منزل کے گھماؤ پر دھپ سے سیزھی پر بیٹھ گئیں۔ لمبے لمبے گہرے گہرے بے ربط سانس لیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا

”تو بہ عذاب ہے سیزھیاں چڑھنا۔“

تب سے اسے بھی سیزھیاں چڑھنا عذاب لگتا تھا لیکن یہاں تو لفٹ تھی۔ منٹوں میں اوپر منٹوں میں نیچے۔ سب کا تجربہ یہی تھا کہ یہاں لفٹ خراب نہیں ہوتی اور پانچ دس دنوں میں کبھی ایسا موقع آ بھی جائے تو فوراً ہی ٹھیک کر دی جاتی ہے۔ اللہ اللہ کر کے کاشف کی رہائش کا مسئلہ حل ہو ہی گیا۔ دو اندویشی مسلم طالب علم بھی کسی شیئر کرنے والے طالب علم کی تلاش میں تھے۔ انھیں بھی تیرہویں منزل والا اپارٹمنٹ پسند آیا تھا۔ تین سٹوڈنٹ اس میں باسانی گزر بسر کر سکتے تھے۔ کاشف نے ہامی بھسری۔ دونوں ضروری کارروائیوں کے بعد رات کو واپس لوٹے۔ راستے ہی میں دونوں نے برگر کھائے اور گھر کی طرف چل دیے۔ انجم نے کار گیراج میں کھڑی کی اور کاشف کو لیے لفٹ کی طرف بڑھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔

لفٹ میں اس وقت رش نہیں تھا۔ دو تین مسرد اور نو تین لفٹ کی طرف جا رہے تھے لیکن پتا چلا کہ لفٹ تو بند تھی۔

اس جگہ بڑا سا بورڈ آویزاں تھا، ”لفٹ خراب ہے۔ مرمت کے لیے بند ہے۔ براہ مہربانی سیزھیاں کی طرف جا بیٹے۔“

”یہ پہلا موقع ہے یا۔ پتا نہیں کیا ہوا۔ کس وقت سے بند ہے۔“

قریب کھڑے ایک امریکی سے انجم نے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ”تھوڑی دیر رہی ہوئی ہے۔ تیسویں منزل پر کوئی خرابی ہوئی ہے۔ ٹھیک کر رہے ہیں۔ لیکن معلوم ہوا ہے، کوئی بڑی خرابی ہے۔ ہو سکتا ہے صبح تک ٹھیک نہ ہو سکے۔ ویسے آپ سیزھیاں کی طرف سے اپنے اپارٹمنٹ میں جا سکتے ہیں۔“

”جا تو سکتے ہیں،“ کاشف غرایا۔ ”لیکن اس منزل تک جاتے جاتے بالکل ہی اوپر بھی پہنچ سکتے ہیں۔“

انجم کاشف کی بات پر بے دلی سے ہنس دیا اور بولا ”اب کیا کریں؟“

”رات باہر ہی گھوم پھر کر گزراؤ۔“ کاشف نے مشورہ دیا۔

”نہیں بھئی۔ مجھے تو کام بھی کرنا ہے۔“

”تو پھر کمر کس لو۔ ورزش ہی سہی۔ مناسب سمجھو تو مجھے اپنی گاڑی کی چابی دے دو۔ میں تو اس میں پڑا رہوں گا۔“

”تو کیا تمہارا خیال ہے کہ میں اکیلا اتنی سیزھیاں چڑھ کر جاؤں گا؟“

”تمہارا تو گھر ہے، تمہیں تو جانا ہی ہوگا۔“

”تم بھی آج کل اس گھر کے کینین ہو۔“

”میں تو بالکل بھی نہیں چڑھوں گا اتنی سیزھیاں۔“

”تو کیا کرو گے؟“

”کسی نہ کسی طرح رات گزاری لوں گا۔“

”اتنی مردی میں مرنا ہے؟“

”سیزھیاں چڑھنا بھی تو مرنے کے برابر ہے۔“

”اب کچھ بھی ہو، اوپر تو جانا ہی ہے۔“

دونوں تھوڑی دیر بحث و مکرار کرتے رہے۔

لیکن جب کاشف اور انجم کو لفٹ بند ہونے کا پتا چلا تو دونوں ششپا گئے۔ ”اف۔ اب کیا کریں؟“ انجم نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

لیکن جب کاشف اور انجم کو لفٹ بند ہونے کا پتا چلا تو

دونوں ششپا گئے۔ ”اف۔ اب کیا کریں؟“ انجم نے ماتھے پر

ہاتھ مارا۔

کاشف دل چلے انداز میں بولا ”اب چڑھو سیزھیاں۔ تم

کہتے تھے یہاں لفٹ کبھی بند نہیں ہوتی، اب سناؤ۔“

اردو ڈائجسٹ 85 اپریل 2018ء

اردو ڈائجسٹ 84 اپریل 2018ء

پھر کاشف نے ہمت جمع کر لی، بولا، ”اچھا چلو۔“
دونوں سیزھوں کی طرف بڑھے۔ ”ایک بات کہوں“
کاشف بولا۔

”کہو“ انجم نے جواب دیا۔

”یوں کرتے ہیں۔ ذہن میں یہ تصور باندھ لیتے ہیں کہ ہم کسی عرصہ جگہ پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ اس طرح مکان نہیں ہوگی اور مسافت بھی کٹ جائے گی۔“ کاشف نے جیسے حل نکالا۔

”تم ایسا کر سکتے ہو؟ میں نہیں۔“ انجم کا لہجہ قطعی تھا۔
”پھر تو بڑی مشکل سے چڑھ پائیں گے۔“ کاشف۔
ماپوسی سے بولا۔

”تم ٹھیک ہی خوفزدہ تھے۔“ انجم نے استرا کرتے ہوئے کہا۔

”اب مانے استاد۔“ کاشف چپکا۔
”کالی زبان ہے تمہاری۔ تین برسوں سے یہاں ہوں۔ کبھی لفٹ میں خرابی نہیں ہوئی۔ تم کو اعتراض ہی یہی تھا، اس لیے بد شکوئی ہوئی۔“ انجم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”میرے ساتھ تم بھی پلیٹ میں آگئے۔“
دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے پہلی منزل پر آگئے۔
کاشف نے کرکرائی اٹھائی، بولا، ”ایک کھٹی، باقی رہیں چالیں۔“

انجم اس کی بات پر مسکرایا۔
”انجم“ کاشف بولا۔ ”مصیبت تو بہر حال کاٹنی ہی ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہنس کر کاٹیں۔“
”ہنسنے کی بات کرتے ہو مجھے تو رونا آ رہا ہے۔“
”شکر ہے میرا مسئلہ تمہاری سمجھ میں تو آیا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یوں کرتے ہیں کہ.....“

”کیا۔“

”لطیفہ گوئی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہنستے ہنستے سیزھیاں چڑھتے جائیں گے۔ بوریت بھی نہیں ہوگی اور جھکس کا احساس بھی نہ رہے گا۔“

”یہ ٹھیک کہا تم نے۔“

”مجھے بہت سے لطیفہ ازر ہیں۔ سنو گے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔“

”باتیں کرتے کرتے انھوں نے دوسری سے تیسری منزل بھی طے کر لی۔“

”اچھا میں سناؤں لطیفہ۔“

”سناؤ۔“

اور کاشف لطیفہ سنانے لگا۔

اب وہ چوتھی منزل کی سیزھیاں چڑھ رہے تھے۔ کاشف لطیفہ سنار تھا لطیفہ سنانے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ منہ بنانا کر آواز بدل بدل کر لطیفہ اس طرح سناتا کہ سننے والے کو خود بخود ہنسی آ جاتی۔ ہنستے ہنستے وہ سیزھیاں چڑھ رہے تھے۔ پتا بھی نہ چلا اور وہ دونوں ساتویں منزل پر پہنچ گئے۔

”دیکھا“ کاشف نے چند لمحوں کو روک کر کہا، ”ہم آٹھویں منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میری ترکیب کتنی کامیاب ہوئی۔“

”واقعی“ انجم بولا۔ ”سناتے چلو لطیفہ۔ وقت اور سفر اچھا گزر رہا ہے۔“

مگر اب ان کی رفتار سست پڑ رہی تھی۔ ناگیں شل ہو رہی تھیں۔ لطیفوں کا بھی لطف نہیں آ رہا تھا۔ چوبیسویں منزل پر پہنچ کر دونوں ناگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ ”کچھ دیر رک کر دم لینا چاہیے۔ انجم بولا۔“ سستانا ضروری ہے۔“

”ہاں، کچھ آرام کر لیں تو باقی منزلیں آسانی سے چڑھ لیں گے۔“

دونوں دس پندرہ منٹ وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے قریب کبھی کبھی کوئی ہانپتے ہانپتے خراب لفٹ ہی کی باتیں کرتا کرتا رہتا تھا۔ انھیں اس انداز میں بیٹھ دیکھ کر ایک امریکی نے مسکرا کر بیلو بھی کہا۔

ستانا کروہ کچھ تازہ دم ہو گئے۔ دونوں پھر سیزھیاں چڑھنے لگے۔ بلندی کی وجہ سے ہوا قدرے ہلکی ہو رہی تھی۔ سانس جلد ہی پھولنے لگتی اور رفتار بھی پہلے کی طرح تیز نہ تھی۔ ”یہاں کی خاموشی سے تو میرا جی بھی ادب رہا ہے۔“

”تو شروع ہو جاؤ۔“

”ٹھیک ہے سنو۔“

وہ پھر لطیفہ سنانے لگا۔ بعض لطیفوں پر تو انجم کو واقعی اتنی ہنسی آئی کہ پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ کچھ مسنر لیں انھوں نے خاموشی سے طے کیں۔

”بھئی تم نے تو چپ سا دہلی۔ کچھ ہنسو یلو۔ حنا موٹی سے تو فاصلے بڑھتے ہوئے لگتے ہیں۔“ انجم نے کاشف سے کہا۔

ہنستے، روتے، ہانپتے وہ بالآخر چالیسویں منزل تک آ ہی گئے تھے۔ اب آخری منزل سامنے تھی مگر ناگیں لرز رہی تھیں۔ اپنا وجود سنبھالنے نہ سنبھیل رہا تھا۔ سانس سینے میں سا رہا رہی تھی۔

وہ وہاں تھوڑی دیر کو روک گئے۔

”اب تم جا کر دروازہ کھولو“ کاشف نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے زیادہ تھک گیا ہوں۔ اوپر چڑھنے کے ساتھ ساتھ مسلسل بول بول کر میرا ذہن اور دماغ بھی مکان سے چور ہے۔ تم جا کر دروازہ کھولو، مجھ میں اب دروازہ کھلنے کا کھڑے رہنے کی بھی ہمت نہیں۔“

”چلتے آؤ۔ اب تو ہم اپنی منزل تک تقریباً آ ہی گئے ہیں۔“ انجم نے آخری منزل کی سیزھیاں چڑھتے ہوئے جیب میں چابی نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا۔

کاشف واقعی بے دم ہو رہا تھا۔ وہ درمیانی سیزھی پر پکسٹرا مار کر بیٹھ گیا۔ ریلنگ سے پشت لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے بے ترتیب سانس لینے لگا۔

انجم دو سیزھیاں آگے تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر گھبرا کر دوسری جیب دیکھی۔ پھر پتلون کی جیبوں میں ہاتھ گھسیڑے۔ اندر تو تیس کی جیب کو چھتھپایا۔

اس کا دماغ چکر ا گیا۔ ریلنگ کا سہارا نہ ہوتا تو شاید وہ گر جاتا۔ کئی لمحے یونہی گزر گئے۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کھلکھلا کر ہنس دے یا چیخ چیخ کر رو دے۔

وہ اسی کیفیت سے گزر رہا تھا کہ کاشف نے آنکھیں کھولیں، سر اٹھا کر انجم کی طرف دیکھا اور اسے کھڑا دیکھ کر غصے سے بولا:

”ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔ چار سیزھیاں اور نہیں چڑھ سکتے تھے۔ میں سمجھا تم نے دروازہ کھول دیا ہے۔“
انجم اسے ٹکڑے ٹکڑے لگا۔

کاشف تیز و تند لہجے میں بولا، ”یار کیا بے ہودگی ہے، جاؤ ادھر دروازہ تو کھولو۔ مجھ سے زیادہ تو نہیں تھک گئے۔ میں نے تمہیں اتنے لطیفے سنا دیے ہیں کہ.....“
”لطیفہ تو تمہیں میں سناؤں گا ابھی۔“ انجم روتی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”کمرے میں جا کر بھی سنا سکتے ہو۔ میں قطعاً ہنسنے کے موڈ میں نہیں۔“

”اس لطیفہ پر تمہیں ہنسی تو کیا رونا بھی پڑے گا بلکہ سیدھے سیدھے بے ہوش ہو جاؤ گے۔“

”کیا“ کاشف ہیزاری سے چنچا۔

”وہ..... وہ میں..... میں اپارٹمنٹ کی چابیاں نیچے گاڑی ہی میں بھول آیا ہوں۔“ انجم رونا ہنسی آواز میں بولا۔
”ادھر تیرا ذہن غرق.....“ کاشف نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ اس کے چاروں طرف واقعی اندھیرا پھیل گیا تھا۔

ڈاکٹر ایس ایم قریشی

راستہ تلاش کر لیتے۔ ایک روز کسی ہوٹل میں بھی راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے انھوں نے بے خیالی میں ایک ہاتھ روم کا دروازہ کھول لیا جہاں ایک نوجوان جو غسل تھا۔ انھوں نے جھٹ یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا ”معاف کیجیے، میں فاترا بیگٹ تلاش کر رہا تھا۔“

ساتھ ہی وہ پلٹے۔ ابھی انھوں نے چند ہی میز ھیں طے کی تھیں کہ غسل خانے والا نوجوان پانی میں تریز تو لیا لیٹے پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور انھیں بازو سے پکڑ کر بدحواسی کے عالم میں بولا ”کہاں لگی ہے آگ؟“

بعض لوگ کسی سے ملتے جاتے تو پیش آنے والی کیفیت کا پہلے سے ذہنی خاکہ تیار کر کے اپنے موقف کا تعین کر لیتے ہیں۔ خواتین اپنے آپ کو دنیا کی حسین ترین، ذہین ترین اور نہ جانے کیا کیا ”ترین“ مخلوق سمجھتی ہیں۔ انھیں ہمیشہ دور کی سوچتی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی قریب کی عقل کمزور اور دور کی تیز ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ بہت آگے کی فکر بہت پہلے کر لیتی ہیں۔

ایک مرتبہ ہماری بیگم نے ایک خاندانی تنازع نمٹانے کے لیے ہمیں اپنے قریبی عزیز کے گھر جانے کے لیے کہا۔ ہم بادل خواستہ راضی ہوئے۔ ہمارے گھر چھوڑنے سے پہلے انھوں نے ہمیں جو ہدایات دیں وہ کچھ یوں تھیں: ”دیکھو وہ خود تو بے چارے سیدھے سادے آدمی

انسان اپنی طاقت، ذہانت، متانت اور مہارت کے بل بوتے پر شیر، چیتے اور بھیرے جیسے خونخوار درندوں کو مطیع کر سکتا ہے۔ تاریخ صدیوں میں ایک آدھ ایسے جاننازکا پتا بھی دیتی ہے جس نے اپنی بیوی پر قابو پایا یا یاساس کے سامنے ڈٹ گیا لیکن... جذبات کو قابو میں رکھنا ان سب سے مشکل



حجامت قبل از گرفتاری

کچھ سزائیں ایسی بھی ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے

کام ہے۔ اسی لیے استاد ذوق نے کہا تھا

نہنگ واژدھا و شیر تر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا

ایک صاحب جو پیشے کے لحاظ تاجر تھے، اکثر مصروف سفر رہتے۔ وہ جس ہوٹل میں بھی قیام کرتے احتیاطاً آگ سے بچاؤ کا

ہیں لیکن ان کی بیوی بڑی فتنہ ہیں۔ تمہارے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ مجھ پر الزام لگائیں گی کہ میں تعویذ گنڈا کر داتی ہوں۔ اس پر تم بھی اس عامل کا نام بتا دینا جہاں سے وہ خود تعویذ لے آتی ہیں۔ جیسے ہی تم عامل کا نام لو گے بات بڑھ جائے گی اور ان کی ساس مداخلت کرنے لگیں گی۔ یوں تو ساس اور بہو میں بنی بنی نہیں لیکن میری مخالفت میں دونوں ایک ہو جائیں گی۔ مگر تم ہرگز ڈھیلے نہ پڑنا ورنہ ہماری ناک کٹ جائے گی۔ پھر تمہیں تو معلوم ہی ہے، ان کی چھوٹی بہن بھی ہری مرچ سے کم نہیں۔ اگر وہ...“

اس پر چند اور جنگجو لال پیلے ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرخ نے جوش میں آ کر اعلان کیا ”تو پھر دیر کس بات کی ہے، چلو ابھی انھیں اس حرکت کا مزہ چکھاتے ہیں۔“

چنانچہ پوری جمعیت نے ڈنڈے سنبھالے اور انتہائی طیش کے عالم میں پڑوس کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ وہ ان منہ، بے قصور اور بے خبر دیہاتوں کو مارتے جاتے اور غصے میں کہتے جاتے ”اور توڑو گے ہمارے گنے؟“ گو یا یہ قول فانیؔ

کچھ سزائیں ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے ہمیں بھی ایک بار اپنے ایک کالم کے سلسلے میں ایک جذباتی قاری کی طرف سے ایسی ہی سزا کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ کالم کا عنوان تھا ”یاقاضی عذاب ہے یارب۔“ یہ معصومانہ کالم ”لو میرج“ کے موضوع پر تھا۔ میرج کا ذکر کہو تو قاضی کا ذکر نوک قلم پر آ ہی جاتا ہے۔ بس یہی غضب ہو گیا۔ مذکورہ قاری نے، جن کی سیاسی بصیرت پر ہمیں رشک آتا ہے، اس قاضی کو قاضی حسین احمد تصور کر لیا۔ وہ عنوان دیکھتے ہی جذبات کے ہاتھوں اتنے بے قابو ہوئے کہ کالم پڑھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی اور فوراً ایڈیٹر صاحب کو قاضی حسین احمد کے دفاع میں ایک خط لکھ مارا جس میں ہمارے خلاف بغض و عناد کے خراج کے بعد دھمکیاں دینے پر آمرائے۔

خط پڑھ کر ہم نے ان کی ذہانت کی داد دی اور شجاعت کی بھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنا پتا لکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ ہمارے قارئین گواہ ہیں کہ کالم نگاری کی حد تک ہم نے سیاست کو ہمیشہ اپنے لیے شجر ممنوعہ سمجھا ہے، اس لیے کہ آج کل زندگی کے ہر میدان میں سیاست ہے، سوائے میدان سیاست کے، جہاں محض فاؤل پلے ہو رہا ہے لہذا ہماری توجہ جو آئندہ کسی شخیر میں قاضی کا لفظ استعمال کریں۔ محاورہ چاہے وزن سے گر جائے لیکن ہم اس کی بھی ٹانگ توڑ کر یہ کہیں گے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا کاج خواں! ♦♦♦

اس مرحلے پر ہم نے کان میں انگلیاں ٹھونسیں اور چلا کر کہا ”دور اندیش خاتون، بس اتنا اوتا ہوا دو کہ اگر اس عورت نے تم پر وہ تعویذ والا جائز الزام نہیں لگایا جس کے گروتم نے اس پوری کہانی کا پلازہ کھرا کیا ہے تو میں کیا کروں گا؟ تمہاری تازہ ہدایات لینے کے لیے گھر لوٹ آؤں؟“

بیگم نے بیزار سے کہا ”اب جاؤ گے بھی یا نہیں کھڑے کھڑے باتیں بناتے رہو گے؟“

ہم نے اچانک اپنا بلڈ پریشر گر جانے کا بہانہ کر کے ان کا بلڈ پریشر تو ضرور بڑھا دیا لیکن اپنے آپ کو ایک ممکنہ آفت سے بچا لیا۔ اس لیے کہ ہم اگر وہاں جاتے تو لازماً صلح کر کے آتے اور اس سے ہماری خود دار بیگم کی ناک نہیں کٹ جاتی؟

بعض لوگ اپنے جذبات کے زیر اثر ہمیشہ دوسروں کے جذبات سے کھیلے ہیں۔ ایک بار سکھوں کے کسی گاؤں کی پناہیت میں فیصلہ کیا گیا کہ گاؤں سے باہر خالی زمین پر گنے اکا دیے جائیں تاکہ علاقے کی خوبصورتی میں اضافہ ہو اور فصل کی آمدنی سے عوام کے لیے فلاحی کام کیے جاسکیں۔ جب تمام منصوبہ بندی مکمل ہو گئی تو ایک خالصے نے کھڑے ہو کر کہا ”اوہ بلیہ! یہ سب تو ٹھیک ہو گیا لیکن آپ جانتے ہیں، ماٹھ کے گاؤں والے ہم سب کے ازلی دشمن ہیں۔ وہ اگر ہمارے گنے توڑ توڑ کر کھا گئے تو ہم کیا کریں گے؟“

ذکیہ علی بیک

روشدان، چوڑے پلنگ اور صوفے۔ انگلیڈ اور جرمی، بالیڈ، آسٹریا وغیرہ میں موسم کی مناسبت سے چھوٹے اور تنگ گھر بنتے ہیں۔ بچپن کی یادیں در آئیں جب ہم پنڈی، مری، کراچی وغیرہ امی ابو کے ساتھ جاتے تھے اور ایسے ہی ہوٹلوں میں ٹھہرتے جہاں بل کھاتے لوہے کی جالی والے زینے اور غسل خانے میں چھوٹی چھوٹی صابن کی ٹکیاں ہوتی تھیں کاغذ میں لپیٹی ہوئیں۔ ہوٹل کے حالات بھی پاکستان والے تھے بل سے پانی نہیں آرہا تھا، بلوا کر ٹھیک کروایا۔

ٹریک کے حالات بھی مختلف نہ تھے۔ موٹر سائیکل والے گھوم گھوم کر دائیں بائیں سے نکل رہے تھے۔ اٹلی میں موٹر سائیکل کی سواری عام ہے۔ یہ مجھے شہاب نامہ میں درج واقعہ کی یاد دلاتی ہے جس کی رو سے اشفاق احمد ہاتھ چھوڑ چھوڑ کر سکوتر چلا شہاب صاحب کو روم کی سیر کرواتے رہے تھے۔

ہم شام کو دیر تک اندرون شہر کی تنگ گلیوں میں گھومتے رہے۔ سڑک پتھروں سے بنی تھی اور دونوں اطراف تین تین منزلہ گھر تھے جن کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں۔ کھڑکیوں کے چوٹی جالی دار پتہ بیرونی دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایسی گلیوں اور گھروں کا ذکر ”اندلس میں اجنبی“ میں ملتا ہے۔ ان گلیوں میں دکانیں ملتی ہیں اور ریسٹوران بھی جن کے فٹ پاتھ پر میزیں، کرسیاں اور پھول سجے ہوئے ہیں یعنی وہی مناظر جو مسٹر تارڑ نے کھینچے ہیں۔

پیزا اور جیلاٹو

کھانا کھاتے پیزا کی دکان میں گئے۔ اٹلی کے پیزے ہمارے ہاں کے پیزا سے بہت مختلف ہیں۔ ہمارے پیزے امریکی پیزے کی پاکستانی شکل ہیں جس کی موٹی میس پر ڈھیر سارا پنیر اور گوشت لاد دیا جاتا ہے۔ اطالوی پیزا پتلی میس، مونزیرا چیز اور ٹماٹر کی پٹنی کے ساتھ بنتے ہیں اور بس! حنیڈا

شہرہ آفاق (خود ساختہ) تحقیق... پاکستانی مردوں کا اطالویوں سے تقابلی جائزہ جوش و خروش سے جاری ہے کیونکہ میں نے دونوں میں خاصی مماثلت پائی۔ اطالوی مرد طبیعت کے لحاظ سے پاکستانیوں کے قریب ہیں۔ باتیں بنانے کے ماہر، تیز تیز بولتے ہوئے، بے تکلف اور ہنس مکھ۔ کچھ اطالوی ساتھی میرے ساتھ بھی بھارکام کرتے ہیں تو ان سے بھی تحقیقی مواد جمع کرتی رہتی ہوں۔

اس دفعہ میرے خاوند، خلیل کو اٹلی کے شہر جنیوا میں کچھ کام تھا۔ میں نے سوچا کہ اپنی ریسرچ پر دوبارہ سے کام شروع کرنے کا نادر موقع ہے لہذا ساتھ ہوئی۔ جنیوا ہوائی اڈے پر ہی تحقیقی مواد جمع ہونے لگا۔ گاڑی کرائے پر دینے والا عملہ تیس کے پیٹے میں ہوگا یا اس سے بھی کم۔ اطالوی مرد فو بصورت مشہور ہیں۔ سرو قد، سیاہ بال، گوار رنگ (پاکستان کے لحاظ سے)، گندی آنکھیں اور شادی سے پہلے تک مناسب جسم۔ بعد میں بیگم کے ہاتھ کی مار، اوہ معاف کیجیے زبان پھسل گئی، میرا مطلب ہے کہ بیگم کے ہاتھ کے پکے چمچ، سیکمٹی، پاستا، چیز وغیرہ کھانے سے ان کے جسم پھیل جاتے ہیں، جیسے ہمارے پاکستانی شوہر بھی دسی گئی لگا کر دلی کھائیں، تو جلد موٹے ہو جاتے ہیں۔ ہیں نا بالکل ہمارے پاکستانی مردوں والی باتیں؟

اور سنیے، کار کرائے پر دینے والی ایک ذمہ داری پر تین تین بندے مامور تھے لیکن اللہ کے فضل سے کام اور کمپیوٹر کی رفتار وہی تھی جو ہمارے ہاں ہوتی ہے۔ ہم ٹھہرے پاکستان کے عادی جہاں پبلک جھپکنے میں کام ہو جاتے ہیں۔

دائیں بائیں سے نکلتے موٹر سائیکل

اللہ اللہ کر کے اتیر پورٹ سے نکلے اور ہوٹل پہنچے جو ہمارے شہر کے عین درمیان تھا۔ صرف اطالوی مردوں ہی نہیں ہوٹل نے بھی پاکستان کی یاد تازہ کروا دی۔ اونچی پتلیں، سنگ مرمر کے فرش، لمبی چھت تک کھڑکیاں،

اطالوی ہمارے بھائی ہیں

لندن میں مقیم ایک پاکستانی سیاح کا دلچسپ سفر نامہ جنھوں نے تہذیب و ثقافت کے گہوارے، اٹلی میں گھومتے پھرتے ہم وطنوں اور اطالویوں میں بڑی مماثلت پائی اور قدم قدم پر انھیں پیارا دیس یاد آتا رہا



میں پیر اریستوران میں کھائے لیکن وہ مزہ نہ تھا جو روم والے میں تھا۔ روم ہم دسمبر ۲۰۱۳ میں گئے تھے اور زندگی بھر نہیں بھولے گا وہ سفر۔ عام گلی کی دکان سے لے کر کھائے گئے پیرا میں، بریانی سے بھی زیادہ لذت تھی۔ جانے کس آلے سے بناتے تھے بالکل کچی، ہلکی پیس جس پر چیر پیکنگ یا توری یا شملہ مرچ کی ٹاپنگ۔ منہ میں رکھتے ہی گھل جائیں اور بھاری بھی نہیں۔

روم سے لے کر سسلی کی ساحلی پٹی تک ایک بات اطالوی مردوں میں مشترک نظر آتی کہ وہ خواتین کو ایسی ہی نظروں سے گھورتے ہیں جن سے پاکستانی بازاروں میں واسطہ پڑتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ پاکستانی مرد اٹھنے پر بازار جاتے ہیں لیکن اطالوی اس خوبی سے بے نیاز ہیں۔

بہر حال کھانا کھا کر نکلے تو جیلاٹو کھانے چل نکلے۔ آپ اٹلی آئیں اور پیرا نہ کھائیں تو گناہ کبیرہ ہے۔ ان کی مشہور کافی کپوچینو، ایکسپرسو، موکا نوش نہ کریں تو اٹالین کی بے عزتی ہے لیکن اگر ان کی آئس کریم جیلاٹو نہ کھائیں تو قابل دست اندازی پولیس کیس ہے۔ مجھے تو تمام آئس کریمیں ایک جیسی لگتی ہیں۔ لیکن اس کا شوق رکھنے والے بتاتے ہیں کہ ہر آئس کریم مختلف ذائقہ رکھتی ہے۔ مجھے تو آج تک ایک ہی آئس کریم کا لطف آیا۔ وہ انگلیڈ کے ساحلی علاقے کارن وال کی آئس کریم کا تھا، جو فارم کے تازہ دودھ سے بنتی ہے۔

ہم جہاں بھی جائیں، انگلیڈ سے اپنے ساتھ بارش لے جاتے ہیں۔ یکا یک کالی گھٹا اٹھی اور ڈوبتے سورج کو ڈھانپ لیا۔ ہوٹل تک جاتے جاتے گرج چمک کے ساتھ ہوتی بارش نے بہت لطف دیا۔ پاکستان کی یاد پھر سے تازہ ہو گئی۔ بارش تو انگلیڈ میں بھی بہت ہوتی ہے لیکن ہر وقت کن من جاری رہتی ہے بغیر شور کے۔ .. عین انگریزوں کے مزاج کی طرح!

صبح ناشتے کے لیے پہنچے تو ایک مکھی بھنھناتی ہوئی پھر رہی تھی۔ کسی نے اسے بھگانے کی کوشش نہ کی۔ میں نے اٹلی میں نوٹ کیا کہ پاکستان کی طرح اطالوی بھی مکھیوں، پھر

کے عادی ہو گئے ہیں جب کہ انگلیڈ میں صفائی کا بے حد خیال رکھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ اٹلی کا موسم ہو جس میں اتنی صفائی رکھنا مشکل ہے لیکن لاس انجلس کا موسم بھی تو گرم ہے پر وہاں مجھے صفائی کا معقول انتظام نظر آیا۔ خاص کر کھانے کی دکانوں پر۔ بہر حال واپس چلتے ہیں اطالوی ناشتے کی طرف۔ اٹلی اپنی ڈبل روٹی کے لیے بھی مشہور ہے اطالوی طرح طرح کے نان بناتے ہیں، جس میں زیتون اور ٹماٹر وغیرہ لگاتے ہیں۔ نہایت خستہ، لذیذ اور کافی کے ساتھ مزادیتے ہیں۔

فلورنس کو روٹا گئی!

جیسا کہ باہر نکلے تو پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سمجھ لیں کہ ہم پنڈی سے جہلم جا رہے ہیں۔ سرسبز پہاڑیاں کاٹ کر جو بہت اونچی نہیں، سرنگوں میں سے سڑکیں نکالی گئی ہیں۔ پہاڑ سے گزرتے ہوئے سمندر نظر آیا۔ اٹلی کے سمندر بہت خوبصورت ہیں۔ تاحہ نظریلے رنگوں کا حسین امتزاج، گرم سمندر جو سمندری حیات سے مالا مال ہے۔ ٹسکینی کا علاقہ ساحلی پٹی اور رنگ برنگ کھانوں کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ جیسے جیسے ہم سفر طے کرتے فلورنس کی جانب بڑھے، پاکستان کی یادیں سمندری لہروں کی طرح ذہن پر مدد جز بنانے لگیں۔ لگتا تھا ہم پاکستان میں سفر کر رہے ہیں۔ اطالوی بھی پاکستانیوں کی طرح سڑکوں پر گاڑیوں کو ادھر ادھر سے نکالنے کے ماہر ہیں۔ پاکستان بہت یاد آیا۔

پہاڑ سکو کر اطراف میں سمت رہے تھے اور اطراف میں کہیں کہیں گھر نظر آتے اور کہیں کہیں فصلیں۔ زیتون کے درخت ایسے عام ہیں جیسے ہمارے ہاں نیم کے۔ مکانات کی تعمیر بھی موسم کی مناسبت سے کھلی کھلی ہوتی ہے۔ کھیریل چھتیں، کھڑکیوں کے باہر کھتی بالکنی اور وسیع دالان و صحن میں دھوپ میں سوکھتے کپڑے۔ گھروں اور گلیوں میں کوئی ترتیب نہیں، بس چلے جا رہے ہیں۔

کھانا پیش کرنا آرٹ ہے!

فلورنس پہنچے تو شام ڈھل رہی تھی اور موسم بے حد خوشگوار

تھا۔ ہوٹل میں ہم کھانا کھانے گئے۔ اطالوی، انگریزی اور فرینچ ریسٹوران میں کھانا کھانے کے بھی آداب ہیں۔ بیروں کا انداز تکلم اور انداز آداب دونوں نہایت پر تکلف ہوتے ہیں۔ پہلے آپ کو مینو پیش کیا جاتا ہے جس کے بعد خریدی ہوتی ہے۔ گرمی کی قسمیں ہیں، ہر کھانے کے ساتھ مخصوص دان پی جاتی ہے۔ کھانا پیش کرنا اور اس کے بارے میں بتانا بھی ایک آرٹ ہے۔

ہم نے ہنگری میں اس فن کا نمونہ دیکھا۔ ہیرا سالم

زیتون کا تیل ڈال کر کھائے بہت لطف آئے گا۔ اس کے بعد وہ پہلا کورس لائے گا۔ کھانا ڈونگوں میں نہیں لایا جاتا۔ یورپ میں یہ کورس کی شکل میں پیش ہوتا ہے۔ میں نے پاستا، وائٹ ساس اور خلیل نے پیسٹیکلی ٹماٹر ساس میں مگوائی جو بہت لذیذ تھی۔ ملازم پھر برتن اٹھا کر لے گیا۔ گلاس بھی تین رکھے جاتے ہیں آپ کے سامنے: وائن گلاس، پانی کا اور سوٹ ڈرنک والا۔ چھری کانٹوں کی بھی خاص ترتیب ہوتی ہے۔



فٹ پاتھ پر بنا ریسٹورانٹ

اطالوی مرد حضرات اور پاکستانیوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ وہ اپنے کھانے کو بے حد سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ کھانے کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے! کھانا مزیدار ہونا چاہیے۔ پنیر اور زیتون کے تیل کی بہتات ہو اور خوب ہو۔ اسی لیے پاکستانیوں کی طرح اٹالین مرد بھی شادی کے بعد توند نکال لیتے اور جلد ڈھل جاتے ہیں۔

شہر کی سیاحت

صبح ہم بس پر سوار ہو کر شہر پہنچے۔ بس سٹاپ کے قریب

اوٹ مچھلی دم پخت کر کے لایا۔ اس نے چھری کی مدد سے درمیان سے کاٹا اور دو چھجوں کی مدد سے ایک جھٹکے میں کی ریزہ کی پڈی نکال لی۔ یہ ایسا مظاہرہ تھا کہ اسے بے درددلی ہو گی کیونکہ اس نے نہایت فاتحانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ایسی ٹراؤٹ دوبارہ صرف مشی گن کی گلی کی ہی نصیب ہوئی لیکن ایسا مظاہرہ دیکھنے کو نہ ملا۔ اس چلتے ہیں اطالوی ریسٹوران میں۔ پھر ہیرا آپ کے منہ نوکری میں اطالوی نان، باقیان کے ٹکڑے رکھ دے گا۔

ایک کیفے تھا۔ میں نے ایکسپریس میں، جو انتہائی تلخ کافی ہوتی ہے، دودھ ڈال دیا تو گویا طیف ہو گیا۔ سب لوگ زور زور سے اشارے کر کے ہنسنے اور زور زور سے اٹالین میں بولنے لگے۔ بالکل پاکستانی دکان والا منظر تھا۔ اطالوی یہ کڑوی سیلی کافی پی کر اوپر سے پانی کا گلاس پیتے ہیں۔ عجیب رسم و رواج ہیں ملک ملک کے!

اطالوی آج بھی اپنے کلچر پر خاصا غرور کرتے ہیں، اپنی لمبی ناکوں کی طرح۔ روایتی اطالوی میکڈونلڈز کے ایف سی اور سٹار بگ وغیرہ میں جانا جرم سمجھتے ہیں۔ کافی کوئی ان کے جیسی نہیں بناسکتا، کیا مجال کہ کسی اور کی کافی پسند آجائے۔ ہر موقع کی کافی الگ ہے۔ صبح تلخ کافی ایکسپریس یونوش جاتی ہے جس کے بعد پانی کا ایک گلاس۔ صبح چھپو نہیں تو وہ بہت برا مناتے ہیں۔ چائے صرف ایک بار پیتے ہیں جو انکس بریک فاسٹ کہلاتی ہے۔ انگریز خود کو دنیا سے ارفع سمجھتے ہیں، اسی لیے طرح طرح کی چائے پیتے ہیں۔

فلورنس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ وہ قرون وسطیٰ میں تجارت و مالیات کا مرکز تھا۔ وہ نہش جو روم کی تاریخی عمارات دیکھتے ہوئے چڑھتا ہے، شاید فلورنس پہنچ کر اترا جاتا ہے۔ روم کی تنگ تنگ، اینٹوں سے بنی گلیوں میں چلتے ہوئے لگتا ہے جیسے آپ زمانہ قدیم میں سانس لے رہے ہوں۔ قدم قدم پر گرے آتے ہیں کیونکہ روم کھٹولک عیسائیت میں مکہ کا درجہ رکھتا ہے۔ گرجوں اور عمارتوں کے باہر مذہبی عجیبے نصب ہیں۔ کئی منزلہ مکان جن کی کھڑکیوں پر سبز رنگ کے لکڑی کے شجر جوالی، مالٹا اور اسپین میں عام ہیں اور ان سے لگتی پھولوں کی بتلیں۔

راستے میں چلتے رہا جب جو زمانہ قدیم کے سفید لباس میں ہوتے ہیں۔ ان کی کمر سے بندھی رسی اور صلیب، راہبانیں جو عبا نہیں پہنے، صلیب لٹکائے، کھڑوائیں پہنے چل رہی ہیں۔ لگتا ہے ابھی رات ہوگی اور مشعل بردار صلیب اٹھائے، جلوس کی صورت میں نمودار ہو کر ان تنگ گلیوں کا طواف کریں اور مناجات گائیں گے۔

لیکن فلورنس میں ایسا کچھ نہ تھا۔ گلیاں تھیں اور گرے بھی لیکن روحانیت مفقود تھی۔ شاید ہر جگہ کا پائنا خاص اثر ہوتا ہے۔ روم میں تقدس کی جھنسا ہے۔ روم عیسائیت کا مرکز ہونے کے باعث کمرشل ازم سے آج بھی خاصی حد تک دور ہے۔ فلورنس بھی اپنی تاریخی عمارات اور حسن کے لیے مشہور ہے۔ ویسے تو اٹلی کا ہر شہر تاریخی عمارات سے مالا مال اور دیکھنے کے لائق ہے۔

فلورنس میں پینٹن کی ایک دکان بہت مشہور ہے۔ چھوٹی سی دکان میں بہت بھیر تھی۔ پینٹن برگر کی قدیم قسم ہے۔ ہم نے بھی یہ برگر کھایا مگر اپنے پلاؤ اور بریانی کے سامنے وہ ماند دکھائی دیا۔

دکان کے سامنے ایک شاندار عمارت تھی۔ کئی کنوؤں والی، قدیم تعمیرات کا شاہکار۔ ایک سرے سے دوسرے تک نقش و نگار۔ ایسی شاندار اور پر شکوہ کہ دیکھو تو دیکھتے چلے جاؤ۔

اٹلی کے گرجا گھر

اس کے اندر جانے کے لیے لمبی قطار لگی تھی۔ ہم اندر گئے تو معلوم ہوا گرجا گھر ہے جو خاندان مدیسی (House of Medici) کے رئیس اعظم نے بنوایا تھا۔ اودھ اور لکھنؤ کی طرح زمانہ قدیم میں ہر ملک کے شہروں میں تہذیبی مسابقت تھی۔ پیر اور فلورنس کی بھی مسابقت مشہور تھی۔ ان کے نواب ہر دم نئی نوعی عمارات بنوا کر بازی مارنے کی فکر میں رہتے۔ آن کل الامارات کے حکمران بھی نئی عمارتیں بناتے رہے ہیں۔

یہ پندرھویں صدی کا شاہکار گرجا تھا جو کلیسا سان لورینو کہلاتا ہے۔ اتنے بڑے گرجا گھر کے اوپر گنبد تعمیر کرنا آسان نہ تھا اور نواب خاندان سبقت لے جانے کے لیے اسے ہر حال میں بنوانا چاہتا تھا۔ مشہور ماہر تعمیرات، یرونلنکی نے یہ ذمہ لیا اور کر دکھایا۔ اس نے پھر اپنے ڈرافٹ کالمیو پرنٹ جلا دیا۔ لیکن انگریز قوم بھی ہندو تھی کہ راز کھول کر دم لے گی۔ انھوں نے تھری ڈی کی مدد سے راز جان لیا۔ اگر آپ آرکیٹیکٹ ہیں تو بی بی سی کی ویب سائٹ پر جا کر ساری داستان پڑھ سکتے ہیں۔

وٹیکن میں چھاپ دی۔ خود وہ لادین تھا، شرابی، خود پرست اور بد زبان۔ اپنے کام میں رعایت نہ کرنے والا اور پرفیکشنسٹ۔ مہذب قوم... ایک نعمت!

فلورنس کی گلیوں میں ہزاروں نہیں لاکھوں کا مجمع دکھائی دیتا ہے مگر نہایت پر امن، کسی کا کچھ چوری نہیں ہوتا (ہوا ہو تو علم نہیں) کسی نے دوسرے کو نہیں چھیڑا سوائے نگاہ مستانہ ڈالنے کے۔ ایک مہذب قوم ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ مجھے ٹی وی میں دیکھے گئے پاکستانی سیاسی جے کے بعد بیٹے کھانوں کے مناظر یاد آ گئے۔ جانور بھی جنگل میں ایسے ہی کھاتے ہیں جیسے پاکستانی کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ شرمناک مناظر ہیں۔ ان پر پابندی ہونی چاہیے۔ دل خراب ہوتا ہے بلکہ اس کو چھوڑئیے، ہمارا اعلیٰ طبقہ شادی بیاہ میں کیا کرتا ہے؟ یقین نہیں آتا کہ ہمارا تعلق صوفیاء کی سرزمین سے

فلورنس کا مشہور گنبد والا مقبرہ



ہے جو ضبط نفس کا سبق دیتے ہیں۔

ہم پھر ایک روز گارڈن پہنچے۔ سخت دھوپ میں پودے کھلائے ہوئے تھے۔ باغ میں گلاب تھے مگر خوشبو ندارد، پاکستانی باغ تو مہک رہے ہوتے ہیں۔ باغبانی میں سوئس، جرمن، سوڈن اور انگریز ماہر ہیں۔ ان کا موسم باغبانی کے لیے موزوں نہیں پھر بھی لندن میں ہر سال چلسی کا شو ہوتا ہے جس میں انواع و اقسام کے پودے ہوتے ہیں اور پھولوں کو تو دیکھتے ہی رہتے۔

راستے میں نوادرات کی دکان آگئی۔ اطالوی فرنیچر اپنی ڈیزائننگ کے لیے پورے یورپ میں مشہور ہے۔ اندر گئے۔ سیاحتی قیلوے کا وقت تھا۔ دکاندار خاتون یورپوری تھیں لہذا ہم نے لمبی چوڑی گفتگو چھیڑ دی۔ گویا اس معاملے میں بھی اطالوی پاکستانی جیسے ہیں۔ بہت باتیں کرتے اور فوراً بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں کی طرح سنبھل کر گفتگو نہیں کرتے بلکہ لاہوریوں کی طرح دل کی بات لبوں پر ہی رہتی ہے اور ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔

شام تو ڈھل رہی تھی مگر بہت کچھ دیکھنا باقی تھا۔ ہم گلیوں میں گھومتے گھومتے پیرا کے چھوٹے سے ریستوران میں چلے گئے۔ اس کے ساتھ والا ریستوران صرف پاستا بنا تھا۔ یہاں بھی پاکستان کی طرح ریستوران کے باہر کھڑے ہو کر گاہک گھیرنے کا رواج ہے۔ ایک خوبصورت سافٹو جوان صاف ستھرا اچھرن پہن کر مینو پکڑے کھڑا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر اپنی سہیلی کی بات یاد آگئی، ”ذکیہ، اب تو کوئی بھی خوبصورت لڑکا دیکھ کر پتا نہیں کیوں اپنا بیٹا یاد آ جاتا ہے۔“

پیرا کھاکر ہم آئس کریم کی سب سے بہترین دکان کی جانب چلے۔ حقیقت ہے کہ انٹریٹ نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب لوگ اپنی آراء ہم تک بآسانی پہنچا دیتے ہیں۔ آئس کریم کی اس دکان کو انٹریٹ پر لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ دکان پر پہنچے تو چھوٹے سے پیارے کتے نے جس

کی دم سے رہن بندھا تھا، پیار سے سونگھ کر ہمارا استقبال کیا۔ اطمینان ہونے پر اپنے تنبیہ پر لیٹ مر اقبے میں کھو گیا۔ آئس کریم مزے کی تھی۔ کھانی کر بس میں بیٹھے تو اتنی بھری ہوئی تھی کہ سانس لینے کی بھی جگہ نہ تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اس سے تو پیدل چلنا بھلا تھا سوا تر کر چل دیے۔

اٹلی فطری خوبصورتی، کھانوں، زبان، ثقافت اور خمر کے علاوہ اپنے برانڈز (Brands) کی وجہ سے بھی عالمی شہرت رکھتا ہے۔ اطالوی برانڈ اور ڈیزائننگ بہت اعلیٰ معیار کی ہے مثلاً بربری، واریچی، وغیرہ۔ روم میں بھی دکانیں ڈیزائنر برانڈ سے مالا مال ہیں۔ اطالوی چمڑے کی مصنوعات بھی اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ دکاندار بھی پاکستانی دکانداروں کی طرح بے حد چرب زبان ہیں۔ آپ کو کچھ کر دم لیں گے (جی ہاں، آپ کو بھی)۔ آپ کو دکان کے باہر جاتے جاتے بھی چیزیں بیچتے چلے جائیں گے، بالکل پاکستانیوں کی طرح۔ انگریزوں، جرمنوں، ڈچ اور ڈنمارک کے لوگوں کا رویہ ہے کہ خریدنا ہے تو خریدو ورنہ اللہ حافظ۔

روم کا ٹھکانہ

روم کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ ایک اطالوی نوجوان نے جو فیٹ کار میں بیٹھا تھا، سڑک کے کنارے کھڑے ہارن بجا بجا کر ہمیں متوجہ کیا، بالکل پاکستانی سٹائل میں۔ مجھے بہت ناگوار لگا کیونکہ انگلستان میں یوں ہارن بجانا گالی دینے کے مترادف ہے۔ مسلسل ہارن بجنے پر خلیل متوجہ ہوئے۔ ایسا لگتا تھا گویا اٹلی میں بنائی گئی ۶۰ کی دہائی کی ہالی وڈ فلم کا منظر ہے۔ فیٹ میں بیٹھا پچھیل چھیل سادہ بلا نوجوان جس نے بالوں کے گچھے اکڑا کر آگے کیے ہوئے تھے اور ڈی ڈیزائنر لباس میں ملبوس تھا، اطالوی انداز میں انگریزی بولتے خلیل سے کہنے لگا کہ میں وٹائی کا نمائندہ ہوں۔ فیشن شو سے آ رہا ہوں۔ اب میا نو (میلان) جا رہا ہوں۔ آپ بہت اچھے لگے۔ ذرا راستہ بتا دیں میا نو کا۔

(سوچئے ذرا، کیا خیر ملکوں کو میا نو کا راستہ پتا ہوگا؟

اس مقامی سے پوچھو اپنی زبان میں۔ بہانہ تو ڈھنگ کا بناؤ گئے کے لیے ورنہ پاکستانیوں سے سبق لو، اس معاملے میں روم سے بہتر ہیں)۔ خیر خلیل نے کہا مجھے تو میا نو کا راستہ معلوم نہیں۔ اس نے کہا، میرے پاس یہ سہیل کے ڈیزائنر وٹ ہیں۔ فیشن شو والوں نے دیے تھے۔ آپ کو میری طرف سے تحفہ۔

اثالیوں بلاشبہ مہمان نواز ہیں مگر مجھے تشویش ہونے لگی۔ خلیل کو میں نے واپس آنے کے لیے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ خلیل نے کہا کہ میں نہیں لے سکتا۔ اس نے کہا، اچھا، پھر ۳۰ یورو کا پیٹرول ڈلوادو، میا نو جانے کے لیے اور ۵۰۰ یورو کے سوٹ لے لو۔

میں نے چیخ کر کہا ”فراڈ یا“۔ وہ جلدی سے گاڑی چلا کر بھاگ گیا۔ اس قسم کے نو سر باز پاکستان ہی نہیں دنیا

کے تقریباً ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ جب دیر پا خوشی ملی فلورنس میں عوام کی سہولت کے لیے جگہ جگہ بینڈ پسپ لگے ہیں جیسے کبھی ہمارے ہاں بھی سہیل عام ہوا کرتی تھی۔ پیاس لگی تو میں نے بینڈ پسپ چلا کر پانی پینا شروع کر دیا۔ ایک آدمی نے دیکھا تو بھاگا بھاگا پانی کی بوتل بھرنے چلا آیا۔ پھر ایک اور، ایک اور، مجھے ایسا لگا کہ یہ بھی روحانیت کا کوئی درجہ ہے جب آپ بلا امتیاز رنگ و نسل کسی کو پانی پلانے لگتے ہیں اور خصوصاً جب اس میں کوئی عرض پوشیدہ نہ ہو۔

لوگ کچھ حیران تھے لیکن خوش بھی۔ ایک چینی عورت کا بیٹا بھی پانی کی بوتل بھرنے بڑھا۔ اس عورت کے چہرے پر ممنونیت کے نقش گڑھے تھے اور احترام و حیرت کے بھی۔

مصنفہ کے عقب میں روس اسٹیلی کے عمارت ہے



پھر بعد میں وہ پانی پینے آگے بڑھی۔ میں اس کے دس بارہ سالہ بیٹے کے چہرے پر آنے تاثرات فراموش نہیں کر سکتی۔ اپنی ماں کو پانی پلاتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں میرے لیے منونیت اور پیار بھرا تھا۔ وہ دس سالہ بچہ جیسے اپنی ماں کا رکھوالا تھا اور اس کی منونیت میں اپنی ماں کے لیے محبت پنہاں تھی۔ اس نے بڑے احترام سے مجھے گریسا (شکریہ اطالوی زبان میں) کہا اور ہینڈ پمپ کی موٹر پکڑ لی۔

یہ چند لمحوں کا کھیل تھا لیکن ہم اپنی ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے جذبات محسوس کر سکتے تھے۔ مجھے انگریز یورو سرجن ہنری مارش کی بات یاد آگئی کہ اصل اور دیر پا خوشی مادی چیزوں سے نہیں ملتی، وہ کسی کی دادرسی کرنے میں پنہاں ہے۔ شاید یہ وہی کیفیت ہے جس میں انسان ایک دفعہ کم ہو جائے تو یہ ظاہری دنیا بے معنی ہو جاتی ہے۔ ہم اکثر واقعات میں پڑھتے ہیں کہ کئی بزرگ ساری عمر پانی پلانے کی ڈیوٹی پر ہی رہے اور روحانیت کے اعلیٰ درجے پا گئے۔ اس کیفیت میں بہر حال ایک نشوونما ہے۔ یہ کیفیت میں نے بارہا محسوس کی ہے۔ مادی اشیاء کے حصول کی خوشی لمبائی ہے اور جب کسی کی مدد کردی تو اس سرور کی کیفیت جاوداں ہو گئی۔

اسلام آباد کی یاد

خیر واپس فلورنس چلتے ہیں۔ وہاں موسم ہمیشہ معتدل رہتا ہے، لہذا گھروں کے باہر سچن ہیں اور بالکنی بھی۔ ہوٹل کے باہر کبھی بالکنیاں بنی تھیں۔ میں دیر تک اس میں کھڑی پھاڑوں کے پار سورج کو ڈوبتے دیکھتی رہی۔ مجھے فلم جہاں آرا کا ایک کلاسیک سین یاد آ گیا جس میں قلعہ بند جہاں آرا (ادا کارہ مالا سہنا) جھروکے میں بیٹھی اندھیرے میں باہر دیکھ رہی ہے۔ اس کی ملازمہ آکر پوچھتی ہے ”بیگ صاحبہ، اندھیرے میں کیا دیکھ رہی ہیں؟“ جہاں آرا کہتی ہے ”آگرہ“۔ وہ حیرت سے پوچھتی ہے ”آگرہ؟“ کیونکہ جہاں آرا آگرہ سے منیلوں دور بیٹھی ہے۔

میں بھی فلورنس، اٹلی کی بالکنی میں کھڑی اسلام آباد کو دیکھ

رہی تھی۔ اسی قدوقامت والی مارگلہ کی پہاڑیاں۔ شہر بھی وہاں ہی۔ سامنے ایک دو بوسیدہ مکانات استادہ جواب خالی تھے۔ پاکستان کے گھروں کی طرح صحن، بڑے بڑے کمرے اور برآمدے۔ یادیں تھیں کہ موج در موج آتی گئیں۔ پھر سورج ڈوبنے لگا اور اس کی کرینیں مارگلہ کی پہاڑیوں کو شعلہ بار کرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ اندھیرے کا راج ہونے لگا اور پہاڑ پر کہیں کہیں بتیاں ٹھٹھانے لگیں۔ شہر میں بھی بتیاں جل اٹھیں۔

یہ جلتی رنگ بھی اسلام آباد جیسا تھا۔ جلتی روشنی میں بے ترتیبی، ہوا میں تازگی، فضا میں خوشگوار حدت، بڑے سے ہوٹل کا پارکنگ ایریا اور لان۔ سامنے کسی مقدس جہتی کے مجسمہ کا استھان، جلتی بتیاں اور اس پر پڑے منت کے سکے۔ ہماری طرح اطالوی بھی خاصے مذہبی ہیں۔ ہر وقت دعائیں اور مناجات پڑھتے رہتے ہیں۔ صلیب اور مریم عیسیٰ کے مجسمے عام ہیں۔ مذہب سے عقیدت غیر معمولی ہے۔ عورتیں پاکستانی خواتین کی طرح وفا شعار اور گھریلو ہیں۔ فراک پر ایجنر پہن کھانے پکاتی ہوتیں۔ بچوں کی فوج ظفر موج، شو مارنے کا شوق، شوخ چیزوں کا اہتمام۔ عورتیں اور مرد خوبصورت نقش و نگار والے، لیکن جوانی پھلاکتے ہی جھدے جسم کے ہوجاتے ہیں۔ کھانے اور کھلانے کے شوقین اور پینے کے کبھی۔

اطالوی مرد رنگیلے مزاج کی وجہ سے بھی معروف ہیں۔ فلرٹ کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ یورپ میں مشہور ہے کہ جٹ میں اطالوی عاشق و معشوق ہی ہوں گے۔ عورتوں کو گھوڑنے کے شوقین۔ پاکستانی مردوں سے زیادہ ڈھیٹ ہیں ہمارے اٹالین بھائی۔ پاکستانی مرد تو ڈانٹنے یا واپس گھوڑنے پر شرمندہ ہوجاتے ہیں لیکن یہ حضرات اپنا تیرہ نہیں بدلتے۔ صبح اٹھ کر کھڑکی کھولی اور پردہ اٹھا یا اس بے یقینی کے ساتھ کہ جانے آج کیسا موسم ہوگا۔ ”واہ“ بے ساختہ دل نے کہا، کتنا پیارا موسم، خوبصورت چمکتی صبح جو سورج کی سنہری کرنوں میں نہانی ہوئی تھی۔ دور پہاڑوں پر بھی کرنیں نقش صبح میں چمکتیں۔ پھر پاکستان یاد آ گیا اور بچپن کا وہ گیت بھی جو

میں کی نشریات میں ٹی وی پر سکول جاتے وقت سنا کرتے تھے: ”پورب کاروازہ کھلا، ٹھنڈی ٹھنڈی چلی ہوا، سورج نے کہا جاگو جاگو صبح ہوئی“۔ جبکہ میں تو عادی ہو گئی ہوں کہہ آلود افسانہ صبح کی! پردہ ہٹانے اور کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ کیا منظر ہے، کبھی سورج نکلتا تو گھڑی بعد بارش ہونے لگتی۔ عموماً بالوں بھرا سرد موسم ملتا۔

مجھے ہوٹل میں کمرے کی کھڑکی کے باہر لگے شجر بھی بہت یاد آئے۔ بن بن دبانے پر خود کار طریقے سے نیچے اوپر ہو جاتے۔ پت بھی مکمل یا نیم وا ہو سکتے تھے۔ سخت گرمی میں کمرے میں سورج کا داغ مکمل ممنوع کر دیتے۔ اپنی مرضی کے مطابق کرنیں انھیں نیم وا کر کے مدہم کر لیں۔ عرب مالک میں بھی ایسے لکڑی کے منتش تختے لگے ہیں جو شدید گرمی میں حدت روکتے ہیں۔



پیساک ایک رومانوی گلی

پیساکا خمیدہ مینار
ہر رت کا اپنا مزہ ہے۔ سخت گرمی میں دوپہر کے وقت نیم روشن کمروں میں سونے اور شام کو چھوڑ کر کے باہر بیٹھنے کا! یہ مزہ انگلستان میں مفقود ہے لیکن وہاں کی سخت سردی میں آتشدان میں لکڑیاں، آونی جرائیں پہن کر گرما گرم پاکیٹ پینے میں عیاشی ہے۔ خاص طور پر جب آپ کا گھر پہاڑی پر ہو، باہر بارش ہو، ہوائیں چل رہی ہوں یا برف گر رہی ہو، گھپ اندھیرے اور خاموشی میں!

چلتے ہیں اب پیسا کی طرف۔ ترچھا مینار جو شاید کسی پاکستانی ٹھیکیدار نے بنایا تھا۔ ہم اسے دیکھنے فلورنس سے نکلے۔ پہاڑیاں دور بھاگ گئیں جیسے ہم پھر اسلام آباد سے جہلم جا رہے ہوں۔ جگہ جگہ زیتون، سبزیاں کاشت ہو رہی تھیں لیکن جہلم کی طرح زیادہ زور معدنی وسائل کی دریافت پر



تھا۔ سنگ مرمر کے ڈھیر لگے تھے۔ اطالوی سنگ مرمر کی شہرت کے بارے میں کون نہیں جانتا؟

قدم قدم پاکستان کو یاد کرتے، بالآخر پیسا شہر پہنچے۔ یہ مینار اور ایک شاندار کلیسا ساتھ ساتھ ہیں۔ وہاں امریکی سیاحوں کی کثرت تھی۔ بے شمار تالین اٹھارویں اور انیسویں صدی کے آغاز میں قوط، غربت اور جنگ اول و دوم کی وجہ سے امریکا سدھار گئے تھے۔ ایسے امریکی اپنے پرکھوں کی تلاش میں انگلینڈ، آئرلینڈ، جرمنی، وینا، پولینڈ وغیرہ بھی آتے ہیں۔ ان کا رویہ عام سیاحوں سے مختلف ہوتا ہے، گویا وہ دنیا کے مالک ہیں۔ بہت لمبے دیے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو ڈان سمجھتے اور کافی بدتمیز بھی ہوتے ہیں۔ اٹلی اگر بھی چپس اور مچھلی کھانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ حقیقی امریکی عموماً خوش اخلاق اور دوستانہ رویہ کے حامل ہوتے ہیں۔

کھانا کھا کر گرم چمکتی دوپہر میں ہم گلیوں کی خاک چھاننے نکل کھڑے ہوئے۔ پتھروں سے بنی گلیاں، دورویہ مکانات، گھروں کی کھلی کھڑکیاں۔ چلتے چلتے دریا کے قریب پہنچے، نہایت آلودہ تھا۔ چاکلیٹ کی دکان پر پہنچو تو طرح طرح کی چاکلیٹیں دیکھنے کو ملیں۔ یورپ نے چاکلیٹ کو کبھی ایک آرٹ بنا دیا ہے۔ اس میں وہ ایسے ڈانٹے اور مونے دریافت کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔ البتہ اس فن میں بھی اطالوی فنکاروں کے برابر کوئی نہیں۔

گلیوں سے پھرتے پھرتے گرجا گھروں کے پاس سے گزرتے پیسا مینار کی طرف چلے۔ ایک گرجا گھر میں پچیس دینے کی رسم ہو رہی تھی جس میں بچوں کو باقاعدہ عیسائی بنایا جاتا ہے۔ دیکھنے میں اچھا لگا۔ روم کی یاد پھر سے آگئی۔ وہاں ہر گرجے میں دن میں کئی بار یہ رسم انجام دی جاتی ہے۔ پادری خطبہ دیتا ہے جو شاید لاطینی زبان میں ہوتا ہے۔ قدیم بائبل اسی زبان میں تھی۔ جرمن پادری مارٹن لوتھر نے وہی کام کیا تھا جو شاہ ولی اللہ نے ہندوستان میں کر ڈالا یعنی الہامی کتاب کو مقامی زبان میں ترجمہ کر دیا تاکہ یہ خواص کی کتاب

بن کر رہ جائے۔ اس کام نے یورپ میں وہی انقلاب برپا کیا جو ہندوستان میں دیکھنے کو ملا۔ عام آدمی کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ مذہب پر برہمن کی اجارہ داری نہیں بلکہ اس کا پیغام ملت نسل سے بالاتر ہے۔

چلتے چلتے پیسا پہنچے تو معلوم ہوا کہ اندر جانے کے لیے تین گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔ میں تھک گئی تھی۔ گھاس پر لوگ رہ رہے تھے۔ ہزاروں کا مجمع تھا لیکن سبھی ایسے سکون سے بیٹھے تھے کہ طلائی کے بھی اچھا دل، کوئی توجہ نہیں دے گا۔ شاید تعلیم و تربیت اسی کو کہتے ہیں۔ گھاس کا قطعہ گرے کے قبرستان کے پہلو میں تھا جہاں قدیم رومیوں روزِ مشرق کا انتظار کر رہی ہیں۔ میں بھی وہاں اسی انتظار میں سو گئی، گہری نیند۔ جب بیدار ہوئی تو شام ہو چکی تھی۔ چار بج رہے تھے۔ ایک عرب مسلمان جوڑا اپنے نوجوان بیٹے کے ساتھ گرے کی دیوار کے سامنے میں نماز پڑھ کر سلام پھیر رہا تھا۔

نیند سے اٹھی تو تازہ دم تھی۔ غسل خانے گئی تو لمبی قطار لگی تھی۔ ایک یورودے کر سید اور قطار میں لگ جاؤ کئی لمکوں سے آئے ہزار ہا مرد و زن انہیں استعمال کر رہے تھے پھر بھی واش روم صاف تھے۔ اطالوی پھر بازی لے گئے۔

مینار پر چڑھنے کے لیے بھی قطار بنی نظر آئی۔ ہمارے پیچھے جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والا گھڑانا کھڑا تھا۔ ان کا بچہ باپ کے ساتھ جرمن زبان بول رہا تھا۔ باپ کی جرمن غلطی سلط تھی مگر دس سالہ بچہ بہت رواں تھا۔ غالباً اس کی پیدائش جرمنی کی تھی اور باپ نے جرمن شاید بالغ ہونے پر سیکھی۔ جیسے ہی بچے نے اپنی ماں کو دیکھا تو پٹ پٹ ساری روداد تامل زبان میں اُسے سنائی۔ وہ کمال پھرتی سے ایک زبان سے دوسری میں سفر کر رہا تھا۔

زبان اور بدن بولی

زبانوں کا سیکھنا حیرت انگیز عمل ہے۔ بچے بیک وقت کئی زبانیں سیکھ سکتے ہیں، درست تلفظ اور گرامر کے ساتھ۔ نئی زبان سیکھنے سے دماغ کو تقویت ملتی ہے۔ بچپن میں سیکھی

زبان عموماً نہیں بھولتی۔ مادری زبان وہ ہے جس میں آپ بچتے ہیں۔ تاہم دیگر زبانوں میں بھی سوچنا ممکن ہے۔

پیسا مینار کی ۱۲۰ سیڑھیاں میں آسانی سے پھلانا لگ گئی۔ میرا دفتر ساتویں منزل پر تھا اور میں دن میں دو سے تین بار ۱۲۰ سیڑھیاں چڑھتی تھی۔ پھر ہم پچھلے ہفتے انگلینڈ کی سب سے اونچی چوٹی فتح کر کے آئے تھے لہذا مینار پر چڑھتے ہوئے تھکن نہ ہوئی۔ البتہ اوپر جا کر موت کی تمنائے بھی خوف آئے لگا۔ مینار ٹیڑھا تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ اب گرا تب گرا۔

مینار سے باہر نکلے تو جدید دور میں پھر چلے آئے۔ خلیل نے آئس کریم کھائی تھی، سو پیدل چلتے چلتے ایک چھوٹی سی دکان پر پہنچے۔ خلیل نے آٹھ دو آئس کی آئس کریم کھائی جس میں بیک وقت خر بوز، تر بوز، پودینا، لیموں وغیرہ کے ڈانٹے شامل تھے۔ ہم پھر ٹیکسی کی تلاش میں سرگرداں چلے۔ شام کا وقت تھا۔ گا کہ لاہور میں گھوم رہے ہیں۔ حدت جا چکی تھی اور مدہم پانے کے بعد کبھی سی فنگی فرحت بخش تھی۔ وہی دورویہ سڑکیں، ہولوں بھرے درخت، ڈھلتی چھاؤں اور پھیلتا اندھیرا، بے ترتیب سڑکیں اور وہی صحن اور اونچی دیواروں والے گھر جن پر گن دیلیا لٹک رہی تھی۔ واپسی کے سفر میں سڑگوں سے ہوتے، پہاڑ دیکھتے، دیہات سے گزرتے جنیوا پہنچے۔ ہوائی اڈے پر پاکستانی انداز و اطوار رکھنے والے عملے سے ملا پڑا۔

ہر قوم کی پہچان اس کا لباس ہی نہیں بلکہ خاص قسم کی ہاڈی لگوں کی یا ”بدن بولی“ بھی ہوتی ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ وہ بولیں یا نہ بولیں یہ پکار پکار کر ان کی شناخت ظاہر کر دیتی ہے۔ پاکستانیوں اور اطالویوں میں یہ بھی خصوصیت مشترک ہے کہ وہ کھلے ڈھلے ہو کر بولتے ہیں۔ سر ہلاتے، جسم کو دائیں بائیں حرکت دیتے رہتے اور ہاتھوں سے اشارے کرتے ہیں۔ یہاں اور جرمن صرف چہرے سے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ کچھ نہ جانتے ہوں تو مخصوص سامنے بنا کر سوری کہتے یا انھوں سے اشارہ کرتے ہیں۔ ان کی اس عادت کا امریکی

بہت مذاق بناتے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ میری ملاقات مشی گن میں ایک پاکستانی خاتون سے ہوئی جو بہت رواں اردو بول رہی تھی لیکن مجھے کچھ ٹھنک رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے ہاتھ اور بازو فضا میں بلند کرتی۔ کبھی ہاتھ ملتی، کبھی منہ پر ہاتھ پھیرتی کبھی اسکارف مخصوص انداز میں ٹھیک کرتی۔ اس کی فرنی نشست بھی ہم سے مختلف تھی۔ مجھے وہ کسی عرب بدو خاتون کی یاد دلاتی تھی۔

میں نے پوچھا تو ہنس پڑی اور کہا ”میں ہوں ہی عرب بدو۔ میری نانی دہلی میں پیدا ہوئی تھی اور ماں بھی اور میں بھی لیکن ہم ہیں دراصل پنجابی۔ میری زیادہ عمر دہلی میں بدوؤں اور عربوں کے ساتھ گزری۔“ یوں یہ معملہ حل ہو گیا اور مجھے سکھا گیا کہ انسان کسی علاقے میں طویل عرصہ گزارے، تو وہاں کے انداز و اطوار بھی اختیار کر لیتا ہے لیکن انداز مقامی لوگوں ہی سے سیکھ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں لارنس آف عربیا اس کام میں کتنا ماہر تھا۔ کہتے ہیں عرب بھی دھوکا کھا جاتے تھے اس کی نشست و برخاست اور زبان سے۔

اٹلی کے سفر سے میری ”رلیسرچ“ میں اضافہ ہوا لیکن وہ ابھی جاری ہے۔ مجھے اٹلی کے بار بار دورے کرنے ہی ہوں گے کیونکہ یہ ملک انتہائی خوبصورت اور ثقافت سے رنگارنگ سماں ملک ہے۔ اگر میں آواگون پر یقین رکھتی تو تمنا کرتی کہ میری دوبارہ پیدائش اٹلی میں ہو۔ کسی گاؤں میں جو ساحل سمندر کے کنارے پہاڑی پر آباد ہو۔ پھولوں سے سجے گھروں کے درمیان سے میں گزرتی، چمکتی دوپہر میں صحن پار کر باورچی خانے میں زیتون کے نان اور پاستا بناؤں اور اپنے محبوب کے انتظار میں اطالوی گانا گاؤں۔ لیکن میں مسلمان ہوں اور یہی میرا آخری جنم ہے۔ ♦♦♦

کیا آپ نے ”پروڈیس میں دیسی کھانے“ اور وہ بھی بہترین کھانے ہیں؟ تو آئیے کینیڈا چلیں

ستمبر ۲۰۱۳ء

محمد خلیل چودھری

چیونٹیوں کی بستیاں ہیں۔ ایک بستی سینکڑوں سے لے کر کروڑوں چیونٹیوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔
کروڑوں چیونٹیوں پر مشتمل بستی کو ”سپر کالونی“ کہا جاتا ہے۔ ۲۰۰۰ تک دریافت ہونے والی چیونٹیوں کی کالونیوں میں سب سے بڑی کالونی جاپان کے شہر ایٹشی کاری کے ساحل پر دی گئی تھی۔
یہ اڑھائی تین مربع کلومیٹر پر پھیلی کالونی تقریباً پینتالیس ہزار گھروں پر مشتمل تھی۔ ۲۰۰۲ء میں ایک حیرت انگیز تحقیق سامنے آئی۔ جنوبی یورپ میں بحیرہ روم کے ساتھ ساتھ چھ ہزار کلومیٹر لمبی ایک سپر کالونی دریافت ہوئی۔ اس دریافت نے

چیونٹی ایک ننھی سی مخلوق ہے مگر یہ بہت منظم، محنتی اور سمجھدار ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں چیونٹیاں نہ پائی جاتی ہوں۔ اب تک چیونٹیوں کی دس ہزار سے زائد اقسام دریافت ہو چکی ہیں۔ ان کی بعض اقسام زہریلی بھی ہیں۔ چیونٹی کی اوسط عمر پینتالیس سے ساٹھ دن تک ہوتی ہے۔
ملکہ چیونٹی کا کام صرف انڈے دینا اور بستی میں چیونٹیوں کی تعداد بڑھانا ہے۔ وہ اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتی۔ ملکہ چیونٹی جسامت میں عام چیونٹی سے کئی گنا بڑی ہوتی ہے۔ باقی چیونٹیاں ملکہ کی خدمت گار ہوتی ہیں۔ ملکہ کی حفاظت کرنا، خوراک پہنچانا اور اس کے گھر کی صفائی کرنا ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ہر کام کے لیے الگ گروہ ہوتا ہے جو اپنے اپنے حصے کا کام ایک لمحے کی تاخیر یا سستی کے بغیر کرتا ہے۔

چیونٹیوں کی بستیاں باہمی محبت اور ایثار کی عمدہ مثال ہیں۔ اگر خوراک کم پڑ جائے تو نوجوان چیونٹیاں اپنے پیٹ سے خوراک نکال کر ننھی چیونٹیوں کو کھلاتی ہیں۔ ایسا اکثر جنگ کے دنوں میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس ننھی مخلوق کو شہر بسانے اور اجتماعی نظام قائم کرنے کی بہترین تعلیم دی ہے۔ ہر چیونٹی انجینئر ہوتی ہے۔ مٹی کے گھروں، میدانوں یا جنگلوں میں آپ نے یقیناً بھر بھری مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھر دیکھے ہوں گے۔ یہ

حیوانی دنیا کی ماہر تعمیرات

اس ننھے مخلوق کو بنائو
بستیاں باہم محبت اور ایثار
کو عمدہ مثال ہو



بڑے مکوڑوں پر تحقیق کرنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ دو ماہ بعد بڑا عظیم امریکا کے ملک میکسیکو میں بھی نو سو کلومیٹر لمبی کالونی دریافت ہوئی۔

چیونٹیوں کی ہر بستی کی اپنی الگ خوشبو ہوتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک چیونٹی کس بستی سے تعلق رکھتی ہے۔ پتا چڑھتا ہے کہ کتنی بستیوں میں داخل ہو تو پکڑی جاتی ہے۔
ننھی چیونٹیاں فوراً حرکت میں آتی اور باہر کی چیونٹی کا سر قلم کر لیتی ہیں۔

چیونٹیوں کے سب سے بڑے دشمن پرندے ہیں جو بہت کر ایک ہی وار میں کئی چیونٹیاں چٹ کر جاتے ہیں۔ کا مقابلہ کرنے کے لیے لڑا کر چیونٹیاں بستی کے سوراخوں پر لیٹ جاتی ہیں۔ جیسے ہی پرندہ قریب آتا ہے، اس پر خود سے تیار کر لیا گیا تیزاب، فارمک ایسڈ پھینکتی ہیں۔ اس تیزاب باعث پرندہ بھاگ جاتا ہے۔

جب چیونٹیوں کی ایک بستی کو پتا چلتا ہے کہ قریب کوئی اور بستی یا خوراک کا ذخیرہ موجود ہے تو وہ اس پر قبضے کی تیاری شروع کر دیتی ہیں۔ جیسے ہی دونوں لشکر آمنے سامنے آئیں لڑائی کرنے والی چیونٹیاں فوراً پتا چلا لیتی ہیں کہ کس لشکر کی مدد اور زیادہ ہے۔ جس کی تعداد کم ہو وہ پسپائی اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر انھیں پتا چلے کہ ان کی طرف ایک ہائی بھی زیادہ ہے تو ان کا لشکر حملہ کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔

چیونٹیاں اپنے راستے میں آنے والا ہرنڈی، نالا، جھیل یا پانی مار کر جاتی ہیں۔ سب چیونٹیاں ایک دوسرے کے منچے پر چڑھ کر ایک چپائی کی شکل بنا لیتی ہیں۔ پانی کا سطحی تناؤ اس ڈوبے نہیں دیتا۔ پانی میں اس طرح سے تیرنے کے لیے چیونٹیوں کو وہ خطرات کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک پانی کی تندو میں جن میں ڈوبے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ دوسرے پھیلیاں دھو جائیں اپنی خوراک بنا سکتی ہیں۔
اس تیرتی چپائی میں ملکہ چیونٹی سب سے اوپر سوار ہوتی

ہے۔ چیونٹیوں کا یہ قافلہ جب بحیرہ دوسرے کنارے پر پہنچے تو چیونٹیاں سب سے پہلے ملکہ کو کنارے پر اتارتی ہیں۔ اس کے بعد انڈوں کو حفاظت سے اتارا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے چیونٹیاں خشکی پر اترتی ہیں۔ ایسا اکثر بڑا عظیم امریکا کے ملک برازیل کے جنگلات میں دیکھا گیا ہے جنھیں ایمازون کے جنگلات کہتے ہیں۔

☆ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”یہاں تک کہ وہ چیونٹیوں کی بستی سے گزرے تو ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! کہیں سلیمان (علیہ السلام) اور ان کا لشکر تم کو کچل نہ ڈالے اور تم کو پتا بھی نہ چلے۔“ (النمل: ۱۸)

یہ ایک خطرے کا پیغام تھا جسے ایک چیونٹی نے نشر کیا۔ قرآن پاک ہمیں چودہ سو سال پہلے بتا چکا کہ چیونٹیاں پیغام رسانی کا مکمل نظام رکھتی ہیں۔ یہ نظام کیسے کام کرتا ہے؟ اس بارے میں سائنس دان آج تک تحقیق کر رہے ہیں لیکن کسی واضح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ایک اندازہ ہے کہ خوشبو، اٹینے کی حرکت اور جسم کی حرکت سے پیغام منتقل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چیونٹیوں کی ایک خاص قسم ہر بستی میں پائی جاتی ہے۔ وہ صرف خبریں دینے کا کام کرتی ہے۔

بہت سے پرندے چیونٹیاں پکڑ کر اپنے پروں میں چھپا لیتے ہیں۔ یہ ننھی مٹی چیونٹیاں ان کے لیے ڈاکٹر کا کام کرتی ہیں۔ پرندے جن جراثیم سے بہت تنگ ہوں، یہ چیونٹیاں انھیں ہلاک کر دیتی ہیں۔ وہ ان پر فارمک ایسڈ کا سپرے کرتی ہیں۔ یہ فارمک ایسڈ پرندوں کے جراثیم مار کر انھیں تکلیف اور خارش سے نجات دلا دیتا ہے۔

ویسے تو پچھلے سو سال سے چیونٹیوں پر تحقیق جاری ہے۔ لیکن حال ہی میں ایک حیرت انگیز بات پتا چلی ہے۔ وہ یہ کہ چیونٹیاں اپنی کالونی میں غیر ضروری پھپھوندی روکنے کے لیے کئی طرح کے اینٹی بائیوٹک بناتی ہیں جن سے انسان میں پانی جانے والی نئی بیماریوں کا علاج ممکن ہو سکے گا۔



اردو ادب کا چھلداوا

ممتاز مزاح نگار کی دلچسپ و سبق آموز یادیں جنہوں نے "قاضی جی" جیسا یادگار کردار تخلیق کیا تھا

اللہ بخشے شوکت تھانوی ان لوگوں میں سے تھے جو روتوں کو ہنساتے تھے۔ ان کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی۔ عجب زعفرانی شخصیت تھی مرحوم کی۔ چلبے آدمی تھے، غمچے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ رگوں میں خون کے بدلے پارہ دوڑتا تھا، بڑت پھرت، یہ آدھے وہ گئے۔ آدمی کیا تھا چھلداوا تھا۔ بڑی جان تھی مرنے والے میں۔

یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا چکا۔ اب بھی وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ بھلا جس میں اتنی زندگی اور زندہ دلی ہو وہ کیسے مر سکتا ہے؟ مگر یقین کر دیا نہ کہ شوکت واقعی مر گیا۔ روتوں کو ہنسانے والا ہنستوں کو روتا

چھوڑ گیا۔ میں اس کے سے بڑھے ہوئے خلوص کو دیکھ کر کہا کرتا تھا۔ "دیکھ لینا یہ شخص ایک ن ایک دن ایسا دھوکا دے گا کہ بلہا تے ہی رہ جاوے گا۔" دیکھ لیا؟ بستیں سال کے تعلقات کا اتنا سا بھی خیال نہیں کیا اور اکیس لاکھ سدا ہار گیا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ ساتھ ہی چلتا۔ ہر کام میں جلدی، زندگی میں بھی جلدی، مرے میں بھی جلدی۔

شوکت تھانوی کا نام پہلی بار اس وقت سنا جب ادھر کسی نے بتایا کہ "نیرنگ خیال" کے سالنامہ میں ان کا ایک مضمون "سودیشی ریل" پڑھنے کے لائق چھپا ہے۔ رسالہ منگا کر پڑھا، واقعی طبیعت پھڑک گئی۔ اب بھی جب کبھی وہ مضمون یاد آ جاتا ہے، تو ہنسی، آ جاتی ہے۔ پیدا ہمارس میں ہوئے، پہلے بڑے بھوپال اور لکھنؤ میں۔ اصلی نام تھا محمد عمر، مختص شوکت اختیار کیا اور اپنے بزرگ بھائی کی دیکھا دیکھی تھانوی کا لاکھ حصہ اس میں ٹانگ لیا۔ اسی لاکھ کی وجہ سے پطرس کہا کرتے تھے کہ "اللہ جانے کس تھانہ سے ان کا تعلق ہے؟" بڑوں کی بھول چوک پر پردہ ڈال دینا تین سعادت ہندی ہے۔ محمد عمر کو اب کوئی نہیں جانتا شوکت تھانوی کو سب جانتے ہیں۔

اگر پندر نتواند پسر تمام کند

۱۹۳۲ء کے اوائل میں ایک دن صبح ہی صبح اطلاع ملی کہ دو صاحب ملے آئے ہیں۔ نام پوچھتے تو نہیں بتاتے۔ ان کی یہ بد اخلاقی طبیعت کو ناگوار گزری۔ میں نے کہا، مردانہ گھسری ڈھٹک میں انھیں بٹھاؤ۔ میں اسی وقت اٹھا تھا۔ دل میں سوچا کہ انھیں اتنے سویرے آنے اور نام نہ بتانے کی سزا دینی چاہیے۔ چنانچہ منہ ہاتھ دھو کر ناشا کیا اور آدھ گھنٹے بعد مردانے میں آیا۔ دونوں انتظار میں سوکھ گئے تھے۔ میرے داخل ہوتے ہی سرو قد کھڑے ہو گئے۔ یہ دونوں جوان تھے انھیں دیکھ کر پٹی نذیر احمد کے مرزا ظاہر دار بیگ یاد آ گئے۔ دونوں چھپلا بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک۔ جو زیادہ چرباک تھے، ذرا آگے بڑھ کر بولے۔ "ہمیں پہچانیے۔"

میں نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا: آڑھی ناگنگ نکلی ہوئی، کسی قدر رنگ پیشانی، گول چہرہ، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، شریسی بے قرار آنکھیں، لبوں پر پان کی سرخی، ترشی ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی گھٹی ہوئی، بے شکن اچکن، چست پا جامہ، وارنش کا پمپ شو، داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھتری۔ ان کی تصویر میں دیکھ چکا تھا میں نے کہا "شوکت تھانوی"۔

مسکرا کر بولے۔ "آپ نے ٹھیک پہچانا۔" یہ کہہ کر معاف کیا پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "اور یہ؟"

میں نے انھیں بھی سر سے پیر تک جانچا۔ تقریباً ایک ہی سا حلیہ تھا دونوں کا، سوائے یہ کہ ان کے چہرے پر عینک نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ "آپ کے نفس نا طبقہ نسیم انہونی ہو سکتے ہیں۔" شوکت نے کہا "بھی خوب اندازہ لگا گیا۔"

نسیم صاحب بھی آگے بڑھ کر گلے ملے۔ ان کا پرچہ "حزیم" نکلتا تھا اور "ساقی" کے تبادلہ میں آتا۔ اب شوکت اور نسیم دونوں نے مل کر ایک مزاحیہ اخبار "سریش" (جفتہ دار) نکالنا شروع کیا تھا۔ نسیم صاحب بھی مضامین لکھتے تھے مگر

کوئی مضمون ان کا مشہور نہیں ہوا تھا۔ تختی آدمی تھے۔ ان کی محنت اور شوکت کی ذہانت نے مل کر بڑا کام کیا۔

جاڑوں کے دن تھے۔ میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ کل صبح ہمارے ساتھ نہاری کھائیے۔ یہ دلی کی ایک خاص چیز ہے۔ دلی والے ہی اس کا اہتمام کرتے ہیں مگر اس کے کھانے کا لطف علی الصبح ہے۔ اس لیے آپ حضرات چھ بجے آجائیے۔ ان کے جانے کے بعد مسیں نے اپنے ماموں چشتی صاحب سے کہا کہ کل صبح نہاری کا انتظام کر دیجیے۔ میں خود چونکہ رات کو دیر سے سوتا ہوں اس لیے صبح دیر سے اٹھا ہوں۔ اس دن الارم لگا کر اٹھا۔

چشتی صاحب نہاری کا بیگ پر دو دوسرے لوازمات لیے چھ بجے سے پہلے پہنچ گئے۔ انگلیشی دھکائی گئی۔ اس پر گھی کر کڑایا گیا۔ نہاری پر سے تار اٹار کر الگ کر دیا گیا اور جب گھی میں پیاز سرخ ہو گئی تو پیاز ایک الگ پیالے میں نکال لی اور گھی سے نہاری کو داغ دیا۔ چھ بجے، ساڑھے چھ بجے، سات بجے۔ چشتی صاحب نے کہا۔ "بھئی تمہارے مہمان نہیں آئے۔"

میں نے کہا۔ "لکھنؤ والے ہیں۔ تکلف میں کہیں رہ گئے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔"

لو صاحب، سات بھی بج لیے، ساڑھے سات ہونے کو آئے۔ اس انتظار میں طبیعت بڑی بد مزہ ہوئی۔ جوانی کی ترنگ تھی۔ اس زمانے میں میں ناک پر منکھی نہیں بیٹھتا تھا۔ جب آٹھ بجے تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے چشتی صاحب سے کہا۔ "ماموں جان یہ سارا سامان زنانہ میں بھیج دیجیے۔"

وہ گھبرا کر بولے۔ "کیوں میاں کیوں؟ تھوڑا سا انتظار اور کرلو۔"

مگر میرا پارہ چڑھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "اب اگر وہ

قاضی جی

شوکت تھانوی



شوکت تھانوی کا مشہور کردار ”قاضی جی“

آئیں گے بھی تو میں نہیں کھلاؤں گا۔

ماموں جان نے کہا۔ ”یہ بڑی نامناسب بات ہوگی۔“
مگر میں نے سارا سامان اٹھوا کر اندر بھیج دیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ نو بجے دونوں حضرات تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ مہمان آگئے۔ میں نے بیوی سے کہا۔ ”چائے اور پان بھیج دینا۔“

انھوں نے پوچھا۔ ”اور نہاری؟“

میں نے کہا۔ ”اب وہ نہاری کہاں رہی، وہ تو باسی تورمہ ہو گیا۔ اسے مت بھیجنا۔“

انھوں نے سر کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہوں۔ ”عجب اونٹنی مت کا آدمی ہے۔“ اور باورچی خانہ میں چلی گئیں۔

میں مردانے میں آیا تو شوکت صاحب نے کہا: ”ہمیں

کچھ دیر ہوگی۔“

میں نے کہا ”جی ہاں“ اب چڑیاں کھیت بھی چگیں۔

بولے۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ سے ملانے کے لیے جن احباب کو بلایا، انھوں نے دو گھنٹے تک آپ کا انتظار کیا۔ اس کے بعد کھا پی کر رخصت ہو گئے۔“

”یعنی نہاری ختم؟“

”جی ہاں۔ دلی کے شرفا سورج نکلنے سے پہلے ہی نہاری کھا چکے ہیں۔ ویسے بازاروں میں مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کے لیے دن چڑھے تک کبھی رہتی ہے۔“

”یو برا ہوا۔“

”وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ برائی ہوتا ہے۔ اب آپ کچھ اور باتیں کیجیے۔ کیپل کس کس سے ملے؟“

ہم پھر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں چائے آگئی۔ شوکت صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا ”تو کیا واقعی نہاری نہیں ملے گی۔“

میں نے کہا ”نہاری اب آئندہ کسی اور موقع پر۔ اب تو آپ چائے پیچھے اور پان کھائیے۔“

اس واقعے کے بعد شوکت صاحب میری طبیعت سے واقف ہو گئے۔ مجھ سے وہ عمر میں دو تین سال بڑے تھے مگر وہ مجھے ہمیشہ شاہد بھائی ہی کہتے رہے۔ بڑے بڑوں پر فقرے کس جاتے تھے مگر انھوں نے میرے ساتھ کبھی مسخرا پن نہیں کیا۔ مذاق البتہ ہوتا رہتا تھا۔

شوکت تھانوی سے میرے تعلقات بحیثیت ایڈیٹر اور مضمون نگار کے بھی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بلا معاوضہ نہیں لکھتے لہذا جب کبھی ان سے مضمون لکھوانا ہوتا تو انھیں معاوضہ مئی آرڈر سے بھیج دیا جاتا۔ اس زمانے میں معاوضہ

ہی کیا ہوتا تھا۔ منشی پریم چند پندرہ روپے فی افسانہ لیتے تھے اور کچھتے کسی نے پندرہ روپے انھیں دیے ہیں تو ان پر بڑا احسان کیا۔ سودو سو روپے میں شوکت تھانوی اپنا ناول دینے پر تلتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ آغا سرخوش کو زبردستی اپنا مسودہ دے کر کچھ روپے لے گئے۔ دہلی کے مشہور ناشر، آغا صاحب نے ہانچا۔ ”اس کا نام کیا ہے؟“

کہا ”جو جی چاہے نام رکھ لو۔“

آغا صاحب کو شوخی سمجھی۔ کتاب کے ٹائٹل پر ایک گیڈر بنادیا۔ اس گیڈر کا چہرہ شوکت تھانوی کا بنوا یا۔ گیڈر کو بکھرے میں بند دکھایا اور کتاب کا نام رکھا ”مجھے خرید لو“۔ یہ ادب کے عروج اور ادیبوں کی بستی کا وہ زمانہ تھا کہ اچھے خاصے مشہور ادیب اپنے مسودے کے ساتھ دو دو سو روپے بھی دیتے تھے کہ لکھنے والی کتاب اپنے ملکیت سے چھاپ دو۔

ان کے کسی کام میں استوا تو نہیں تھی۔ وہ اتنے بڑے آدمی تو تھے نہیں کہ زمانے کو اپنے ساتھ کر لیتے، اس لیے زمانے کے ساتھ ہو جایا کرتے۔ جب دلی سے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام ہونے لگے تو ایک دفعہ شوکت صاحب کو بھی تقریر کرنے بلایا گیا۔ اسے انھوں نے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ اس زمانے میں احمد شاہ بخاری (پطرس) اسٹیشن ڈائریکٹر تھے اور ذوالفقار بخاری ڈائریکٹر پروگرام۔

شوکت صاحب دونوں بھائیوں سے مرعوب ہو گئے۔ ایک ایک سے ان کی تعریف کرتے پھرتے تھے۔ لکھنؤ واپس پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک اردو اخبار میں (جس سے وہ وابستہ تھے) دونوں بھائیوں کا نثری تصدیق لکھا اور اس کا تراشا انھیں بھیج دیا۔ صلہ میں انھیں دلی مزید پروگراموں کے لیے بلایا گیا اور جب لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انھیں مسودہ نویسی کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔

ریڈیو میں انھیں اخبار کے مقابلے میں دینی بلکہ منگی تنخواہ مل گئی اور ان کے دلزدہ رو رہ گئے۔ اخبار نویس نے انھیں زود نویس بنا دیا تھا۔ ذہین آدمی تھے، فچر اور ریڈیو ڈرامہ کی تکنیک سمجھ لینے کے بعد انھوں نے لکھ کر مسودوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور صلاحیت کا بھی انکشاف ہوا کہ ریڈیو کی اداکاری اچھی کر سکتے تھے۔

نقلی کا مادہ تو ان میں شروع ہی سے تھا۔ کئی طسرح کی آوازیں بنانے پر بھی قادر ہو گئے تھے۔ لکھنے میں انھیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، قلم برداشت لکھتے۔ اچھا لکھتے اور خوش خط تھے۔ میں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کاٹتے تھے اور سطر میں موتی کی لڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لکھنؤ سے انھوں نے اپنا ایک ہفتہ وار فچر ”منشی جی“ شروع کیا جس میں کسی معاشرتی خرابی یا وقت کے کسی اہم موضوع پر بڑی دلچسپ بحث ہوتی۔ کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور نہایت کامیابی کے ساتھ۔ جب پاکستان بن گیا تو ”منشی جی“ نے ”قاضی جی“ کا روپ دھار لیا۔

یہ فچر لاہور سے شروع ہوا۔ پھر شوکت صاحب کراچی آ گئے تو یہاں سے نشر ہونے لگا۔ اس ہفتہ وار فچر کے روح رواں قاضی جی تھے جن کا پارٹ خود شوکت صاحب ادا کرتے۔ مدتوں تک اکثر سننے والوں کو معلوم نہیں ہوا کہ قاضی جی کی صداکاری کون کر رہا ہے۔ قاضی جی ایک کھوسٹ بڑے میاں تھے جو حقوق کی جنت میں رہتے تھے مگر ہر معاملے میں اپنی رائے ضرور دیتے۔ ان کے پو پلے منہ سے جو باتیں نکلتی تھیں، بھولی بھالی اور مسکھکے خیز ہوتیں۔ شوکت صاحب کو قاضی جی کی آواز بنانے میں کمال حاصل تھا۔ ثبوت یہ ہے کہ اس کے انتقال پیدا ہو گئے تھے۔ محفلوں میں جو مسخرے نقلیں پیش کرتے تھے، وہ قاضی جی کی نقلیں بھی بنانے اور سنانے لگے۔ شوکت صاحب نے منشی جی اور قاضی جی کے سیکڑوں

مسودے لکھے۔ میں نے بھی ان کے میسوں براڈ کاسٹ سنے۔ ان میں سے ایک کو بھی بھرتی کا فچر نہیں پایا۔ سب میں ایک ہی جیسی شگفتگی اور تازگی پائی۔

نبی کیفیت ان کی کالم نویسی کی تھی۔ مجید لاہوری کے انتقال کے بعد شوکت صاحب اخبار ”جنگ“ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں روزانہ ایک مزاحیہ ”کالم وغیرہ وغیرہ“ لکھنا ہوتا اور ہفتہ میں دو ایک ادارے بھی۔ نواب سعادت علی خاں نے انشاء اللہ خاں سے فرمائش کی تھی کہ دو لطیفے روز سنا دیا کرو۔ چند روز میں انشاء کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک ایک سے کہتے ”کوئی نقل، کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ۔ میں نمک مرچ لگا کر نواب کو خوش کر لوں گا۔“



شاہد احمد دہلوی

سگریٹ تک نہ پیتے۔ سینما، تھیٹر، کلب، میر سپانا، دعوتیں، ہوٹل بازی یا کوئی اور بازی، کچھ نہیں البتہ بڑے آدمیوں کے ساتھ لگے رہنے کا شوق تھا اور انہی کے ساتھ ان کے شوق پورے ہو جاتے۔

باتوں کے طوطا بینا بنا یوں تو سبھی یوپی والوں کا شیوہ ہے مگر شوکت صاحب کو اس میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی اسی صلاحیت کے بل بوتے پر بڑے بڑے جنوں کو شیشے میں اُتار رکھا تھا اور ان سے کما حقہ فائدہ اٹھاتے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ تم بے ہڈی کے آدمی ہو۔ اپنے سے زبردست کے سامنے جاتے ہو تو سوائے جی جی ہاں کی کرنے کے اور کچھ کر نہیں سکتے۔ وہ کہتے تھے ”نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔“

ایک دفعہ میں شوکت تھانوی کے پاس ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے شوکت صاحب ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور بولے ”ایک لطیفہ یاد آ گیا، ذرا لفظی صاحب (اسٹیشن ڈائریکٹر) کو سنا آؤں۔“ وہ لطیفہ سنانے چل دیے۔

میں نے ان کے دوست سے کہا۔ ”اس نے تو خوشامد

شوکت کا شگفتہ رقم قلم روزانہ چلتا ظرافت کے پھول کھلاتا رہا۔ پنڈی جانے کے بعد پورے اخبار کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہو گئی تھی مگر وہ ”پہاڑتے“ کے عنوان سے کالم برابر لکھتے رہے۔ ادارے کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ مثلاً انھوں نے آپ بیتی لکھی شروع کر دی تھی۔ انھوں نے اس کی چند قطیں ہی چھپنے پائی تھیں کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ”یک درگیر و خاتم گیر“ کے شوکت صاحب قائل نہیں تھے، جس کام میں پیسہ زیادہ ملتا یا دکھائی دیتا اسی کو اختیار کر لیتے۔ کالم نویسی سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہاں سے ریڈیو میں آئے۔ ریڈیو چھوڑ کر پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں ساک پبلسٹی کے محلے میں چلے گئے۔ وہ محکمہ حتم ہوا تو پنجولی فلم کمپنی میں آ گئے۔ وہ بند ہوئی تو پھر ریڈیو میں آ گئے۔ پھر ”جنگ“ اخبار میں چلے گئے۔

پیسہ انھوں نے خوب کمایا۔ مضامین، کتاہوں، ریڈیو، اخباروں اور مشاعروں سے، مگر کبھی انھیں حشر سچ کرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو تنگ دست ظاہر کرتے۔ پانوں کی ڈیا تو وہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ

شوکت صاحب بڑے فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ریڈیو اسٹیشن لاہور پر اپنے چہرا کی آواز دی۔ وہ آیا تو اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگے۔ ”آپ کو دیکھیے، نبی کسٹ سگریٹ پر آپ کی تصویر ہے“ اور واقعی اس غریب کی عین میں وہی شکل تھی جو نبی کسٹ کی ڈیا پر ہوتی تھی۔ پھر اس سے کہا۔ ”جائیے، جا کر چائے لائیے۔“

اس کے چند روز بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ مسین ان کے کمرے میں داخل ہوا تو سلام کے بعد شوکت صاحب نے پہلی بات یہ کہی۔ ”یہ جو بیٹھے ہوئے ہیں، میرے صاحبزادے ہیں۔“

اور ان صاحب سے کہا۔ ”انھیں تم جانتے ہی ہو گے، شاہد احمد دہلوی ہیں۔“ انھوں نے اٹھ کر سلام کیا۔ میں ”علیکم السلام“ کہہ کر بیٹھ گیا۔

وہ صاحب ”اچھا، میں چلتا ہوں“ کہہ کر چلے گئے تو میں نے ہنس کر کہا۔ ”جس بھلے آدمی کو دیکھتے ہو کسی کو پانا پینا اور کسی کو پانا پنا بنا لیتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟“

بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ”نہیں یہ واقعی میرا بڑا لڑکا تھا۔

پی اے ایف“ میں نوکر ہے۔ مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اتنے میں عشرت رحمانی آ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا

”ان کا کوئی لڑکا ان سے بھی بڑا ہے؟“ انھوں نے کہا۔ ”قدم بڑا ہے۔ آپ ان کی عمر کیا سمجھتے ہیں؟ یہ مجھ سے، آپ سے بڑے ہیں۔ یہ حضرت پچاس سے اوپر ہیں۔ تیس بتیں کا ٹولہ کا ہی ہے۔“

اس وقت شوکت صاحب کی صحت اتنی اچھی تھی کہ چالیس سے زیادہ کے نظر نہ آتے۔ بال خوب گھنے اور کالے تھے۔ سفید بال نہ تو سر میں تھے نہ مونچھوں میں۔ چہرے پر کوئی جھری نہیں تھی اور نہ آنکھوں کے کونوں میں ”کوئے کے پاؤں۔“

کرنے کی حد ہی نہیں رکھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟“ انھوں نے کہا۔ ”بھیا، یہاں اسی طرح کام چلتا ہے۔ یہ پال سنگ ہے۔“

”یعنی؟“

”ارے بھئی بٹرنگ۔“

بٹرنگ یعنی مکھن بازی کرنا۔ یہ سارے محاورے اسی زمانے میں وضع ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے اسی زمانے میں کہا تھا ”آج بازار میں مکھن ہی غائب ہے۔“

”کیوں؟ کیا مکھن بھی چور بازار میں چلا گیا؟“

”نہیں، فلاں صاحب نے فلاں افسر کے لگا دیا سارا۔“

ایسی باتوں پر ہنسی آتی تھی جی بھی جلتا تھا۔ مگر یہ عام دستور تھا اور شوکت صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انھوں نے اس کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہو گئے تھے۔ جب عام مقولہ یہ ہو کہ سچ تو یہ ہے کہ خوشامد اللہ راضی ہے تو پھر کسی ایک کو ہدف ملامت کیوں بنایا جائے؟ ایسا ہی خودی اور خود داری کا اگر خیال ہے تو اپنے گھر بیٹھو یا دنیا چھوڑ دو۔

یہ آخر تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی کمائی خرچ کہاں کرتے تھے۔ صرف دو دم میں ایسی دکھائی دیں جن مسین انھیں ضرور اپنی گرد وھیلی کرنی پڑتی تھی: ایک۔ پان اور دوسرے لباس۔ پان وہ کھاتے کم کھکھلاتے زیادہ تھے۔ انھوں نے ایک بڑی ڈبیا کتاب کی شکل بنوائی تھی جس میں پان کا پورا لوازم ہوتا۔ یہ ڈبیا تقریباً ہر ملاقات، بطور بہت کامیاب تھی۔ جو اس سے بچ نکلتا اس پر ہنوسے سے وار کیا جاتا۔ اس میں چھالیا، الا پچی، لوگ، جاوتری، ممتھال کی نضی سی شیشی، سب کچھ ہوتا۔ کہاں تک کوئی بچتا، ماری کھا جاتا۔ اس پر غضب ان کی سخن سازی۔ نو وار درام ہو کر ان کا کلک بڑھنے لگتا۔

دس بارہ سال بعد یعنی ۱۹۶۱ء میں بالکل ایسے ہی تھے۔ عمر کے ساتھ مزاج میں بربادی اور سنجیدگی آ جایا کرتی ہے مگر شوکت صاحب کی بات حقیقت کا انداز بالکل نہیں بدلاتی۔ جوانی کا وہی چلبلا پن قائم تھا، بلکہ مسخر اپن کچھ بڑھ ہی گیا۔ مارچ ۱۹۶۱ء کے آخر میں پاکستان سے بھارت جو خیر گالی کا ثقافتی وفد گیا اس میں لاہور سے امرتسر اور امرتسر سے دلی تک ذوالفقار بخاری، سید محمد جعفری، شوکت بھٹا نوئی اور میں، ہم چاروں ایک ہی ڈبے میں تھے۔ بالعموم بخاری صاحب اپنی بذلتی اور چرب زبانی سے سب کو دبایا کرتے ہیں مگر اس سفر میں شوکت بھٹا نوئی نے سب کا ناٹھ بند کر دیا۔

پان خرچ کے علاوہ شوکت صاحب اپنے لباس پر بھی روپیہ صرف کرنے پر محسوس کرتے وہ روزانہ ایک جوڑا بدلتے اور ٹیپ ناپ سے رہتے۔ بعد میں سوٹ بھی سلوا لیے تھے۔ وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ آدمی کی عزت اس کے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ بڑھیا لباس والا خواہ مخواہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا۔

ایک دفعہ میرے پرانے ہم جماعت اور بے تکلف دوست ممتاز حسن صاحب نے مجھے کھلو بھیجا کہ کسی دن شام کو ۵ بجے میرے دفتر آ جاؤ، ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ممتاز صاحب اس وقت وفاقی سیکرٹری فنانس تھے۔ میں سیدھے سمجھاؤان کے دفتر وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ ان کا چہرہ اسی مرغ زریں بنا ہوا کھڑا تھا۔ میں نے پرچے پر اپنا نام لکھ کر اسے دیا کہ صاحب کو دے آئے۔ اس نے بڑی بے مہری سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”بچہ پر بیٹھ جاؤ۔ صاحب کام کر رہے ہیں۔“

میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی تھوڑی دیر بعد مجھ سے ذرا ہٹ کر اسی بچہ پر بیٹھا۔ دس منٹ گزر گئے۔ اس نے مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ میں نے کہا۔ ”آپ حب کر میرا پرچہ تو

دے آئے۔ مناسب سمجھیں گے تو بلا لیں گے۔“

بولا۔ ”اندر کسی بڑے افسر کے ساتھ ضروری کام کر رہے ہیں۔ ابھی ٹھہر جاؤ۔“

ہم ٹھہرے رہے۔ جب پھر کچھ وقت گزرا لیا تو میں نے کہا۔ ”صاحب نے مجھے بلایا ہے، میں اپنے کسی ذاتی کام سے نہیں آیا۔ آپ اطلاع تو کر دیجیے۔“

وہ میری چٹ لے کر اندر چلا گیا اور وہاں سے چائے کے خالی برتن لے کر باہر نکلا۔ میری چٹ اس کے ہاتھ ہی میں تھی۔ برتن لیے چلا گیا مجھ سے کچھ نہ بولا۔ جب واپس آیا تو آکر خاموشی سے بچہ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ”چٹ نہیں

”حیرت انگیز معلومات“

آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب چیونٹی بہت بلندی سے بھی زمین پر گرے تو فوراً سیدھی ہو کر چلتا شروع کر دیتی ہے۔ نہ تو اسے چوٹ لگتی ہے اور نہ ہی زخمی ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کا وزن بہت کم ہوتا ہے۔ دوسرے اس کا جسم گرتے وقت پیرا شوٹ نما بن جاتا ہے جس سے یہ آسانی سے زمین پر گر پڑتی ہے۔

☆ چیونٹی اپنے وزن سے بیس گنا زیادہ وزن اٹھا سکتی ہے۔

☆ چیونٹی کے کان نہیں ہوتے، یہ سگھ کر اور اپنے جسم کی مختلف حرکتوں سے دوسری چیونٹیوں تک اپنا پیغام پہنچاتی ہے۔

☆ چیونٹی کے پیٹ میں دو معدے ہوتے ہیں۔

☆ بڑی چیونٹیاں کوئی چیز نہیں کھاسکتیں بلکہ وہ چیزوں کا رس پی کر خشک خوراک پھینک دیتی ہیں۔

دی؟“

اس نے ”نہیں“ کہہ کر منہ پھیر لیا۔ میں جھلسا رہا۔ پون گھنٹے بعد جب ممتاز صاحب اپنے معزز مہمان کو رخصت کرنے دروازے پر آئے تو اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ چونک کر بولے۔ ”ارے! آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”جی ہاں پون گھنٹے سے اور آئندہ آپ مجھے کبھی اپنے دفتر بلا لیں، میں آنے والے پر رعت بھیجتا ہوں۔“

وہ آئے آئے کہہ کر گلے میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔ بولے۔ ”آپ اندر کیوں نہ آ گئے؟“

میں نے کہا۔ ”وہ جو باہر ایک جانور کھڑا ہے، اسے میں نے چٹ دے دی تھی مگر اس نے اندر نہیں پہنچائی۔ کیا آپ کے ہاں بھی اندر اطلاع پہنچانے کے دس پانچ روپے دیے جاتے ہیں؟“

ہنس کر کہنے لگے۔ ”نہیں، ایسا تو نہیں ہوتا۔“ پھر میرے گبڑے تیور دیکھ کر بولے۔ ”آپ چائے پیئیں گے؟ کچھ کھائیں گے؟“ اور بغیر میرے جواب کا انتظار کیے بھا کر اپنے مرغ زریں کو بلایا اور کہا۔ ”چائے لاؤ۔“

پھر خود ہی کہنے لگے۔ ”بھائی کیا پوچھتے ہو ان چہرہ سیوں کی حالت، بس کچھ کہنے کا مقام نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”جناب اس کی گرم شیر دانی میری شیر دانی سے دگنی قیمت کی ہے۔ میرے پاؤں میں چھ روپے کی جوتی ہے، وہ تیس روپے کا شو پیٹے ہوئے ہے۔ بھلا وہ مجھے کیوں خاطر میں لاتا۔ سمجھا ہوگا کہ کوئی غرض مند مہاجر، صاحب سے کچھ مانگنے آیا ہوگا۔“

ممتاز صاحب شرمندہ ہو کر بولے۔ ”نہیں بھائی، نہیں، تم مجھے معاف کر دو۔“

شوکت صاحب ہمیشہ دیسی یاو لاتی عمدہ لباس پہنتا کرتے ورنہ انھیں بھی ایسے ہی حادثات سے دوچار ہونا پڑتا۔ مثل مشہور ہے ”الانس بالانس“۔ یہ کوئی آج کا دستور نہیں قدامت سے یہی چلا آیا ہے۔

شیخ سعدیؒ کو دعوت میں داخل ہونے سے دربان نے روک دیا تھا۔ جب وہ جب قہ پابن کر آئے تو عزت و کرم کے ساتھ انھیں اندر پہنچایا گیا۔ جب کھانا سامنے آیا تو حضرت شیخ نے شور بے میں اپنی آستین ڈالتے ہوئے فرمایا ”اسی نے تو مجھے کھانے تک پہنچایا ہے۔“ سچ ہے لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں، باطن کو نہیں۔ لہذا مرزا ظاہر دار بیگ بننے میں ہی عزت ہے۔

شوکت صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ بھی کہ شاعروں کے ساتھ اور اونچی سوسائٹی میں رہنے کے باوجود شراب نہیں پیتے تھے۔ آئے دن غیر ملکی سفارت خانوں میں کاک ٹیل پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں۔ بلکہ ہمارے ”بڑے آدمیوں“ نے بھی اسے اپنی شان امارت میں داخل کر لیا۔ جب ان کے ہاں ”معزز مہمان“ آ رہے ہوں تو ایک ”بار“ کا بھی اپنے ہاں اہتمام کر لیں۔ مفت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے مگر ان ”قاضی جی“ نے اسے ہمیشہ حرام ہی سمجھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر میں نے ایسے ایسے ثقہ لوگوں کو چسکی لگاتے دیکھا ہے کہ بس دیکھ کر طبیعت خوش ہوگی۔

شوکت صاحب خواتین سے ملنے میں بڑی احتیاط ملحوظ رکھتے۔ یہ نہیں کہ ہمارے بعض شاعروں کی طرح جس عورت سے بھی تعارف ہوا، چھوٹے ہی سمجھ لیا کہ پوسلی ہی نظر میں وہ ان پر عاشق ہوگئی اور لگے اس کی فرضی داستانیں سنانے۔ شاید اس وضع احتیاط کی وجہ یہ ہو کہ شوکت صاحب کی شادی نو جوانی ہی میں ہوگئی تھی۔ وہ ایک طرح دار جوان تھے۔ اگر گبڑا چاہتے تو خوب پیٹ بھر کر گبڑاتے، مگر اللہ نے انھیں اس خرابی سے محفوظ رکھا۔

سنائی دی۔ ”ہمارے گھر کے حالات پہلے ہی خراب ہو رہے ہیں۔ پھر آپ نے ماہ نور کو اتنے بڑے اور مہنگے سکول میں داخل کروا رکھا ہے۔ اوپر سے آپ کی ماں کی دوائیوں کا ماہانہ خرچ۔ اس طرح گھر کب تک چلے گا؟ اپنے کاروبار کا حال تو آپ خود بھی جانتے ہی ہیں۔“

”تو کتنی ہوں کہ اپنی والدہ کو کسی اولاد ہاؤس میں داخل داد۔ مجھ سے نہیں ہوتی اب ان کی دیکھ بھال۔“
زبیدہ بیگم اپنے کمرے میں لیٹیں بہور خسانہ کے بولنے کی ہلی آواز با آسانی سن رہی تھیں۔
”آہستہ بولو... امی جان سن لیں گی۔“ انھیں اپنے لوتے بیٹے باسط کی آواز سنائی دی۔
”سن لیں، مجھے کوئی پروا نہیں۔“ رخسانہ کی جلی کئی آواز

560 روپے

کی غیر معمولی بچت پائیے
اس قیمت میں نسخہ نمبر
بھی حاصل کیجیے

0300-4005579

urdudigest.pk

www.urdudigest.pk

subscription@urdudigest.pk

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر



اردو سے محبت کریں..... اردو ڈائجسٹ پڑھیں

اردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھرئیے
دلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُر لطف بنائیے

قیمت فی پرچہ 12 شماروں سالانہ جسطرہ کل رقم سالانہ سالانہ بدل بچت
100/- روپے کی قیمت ڈاک خرچ
سالانہ خریداری 1200 روپے 360 روپے 1560 روپے 1000 روپے 560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام..... فون نمبر.....
پتا..... ای میل.....
میں ماہ 20..... سے اردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریداری چاہتا ہوں۔ مجھے اردو ڈائجسٹ ارسال کرو دیجئے۔
1۔ بذریعہ پی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ میں کواد کروں گا۔ یا
2۔ میں مطلوبہ رقم..... روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا
3۔ میں نے..... روپے اردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر IBAN#-PK18 BPUN 6010 0527 0140 0011
بینک آف پنجاب منمن آباد میں آئن لائن جمع کروائے ہیں۔ یا
4۔ ہماری ویب سائٹ پر چاکر سبکچان فارم پر کریں اور میں ای میل کروں۔ یا
5۔ سالانہ خریداری کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں 0333-4713631۔
دستخط..... تاریخ.....

اردو ڈائجسٹ - سرکولیشن مینجر - 325, G-III، جوہ ٹاؤن لاہور پاکستان

فون نمبر: +92-42-35290734-8, +92-42-35290707

نئی نسل کو ایک قیمتی درس دیتی پرانے لوگوں کی و نشیں کتنا

”میں جیسے تیسے کر کے گھر کے اخراجات پورے کر رہی رہا ہوں پھر تمہیں کیا مسئلہ ہے جو ہر بات پر لڑنا شروع کر دیتی ہو۔“ باسط کی بھانٹی ہوئی آواز سنائی دی۔

”بہر حال میں نے کہہ دیا ہے کہ اپنی ماں کا کوئی بندہ بست کر لیں۔“ رخسانہ کا لہجہ دھوکہ تھا۔ ”میں اب ان کی مزید دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔“

”وہ تمہاری ساس ہونے کے ساتھ ساتھ اس گھر کی بزرگ بھی ہیں۔ ان کی دعاؤں کی بدولت ہی ہمارا یہ خاندان قائم و دائم ہے۔ تمہیں ان کی عزت کرنی چاہیے۔ باسط نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔“

”ان کا کوئی ایک فائدہ ہوتا ہوتا۔“ رخسانہ کی آواز پہلے سے بھی اونچی ہو گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی حیثیت اب ایسے کھوٹے سکے کی سی ہے جو ہمارے کسی کام کا نہیں۔ پھر میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ آپ انہیں گھر سے نکال دیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ انہیں بوڑھوں کے کسی ادارے میں داخل کروا دیں۔ وہاں ان کی دیکھ بھال بھی زیادہ اچھے طریقے سے ہو سکے گی۔“

اپنے لیے کھوٹے سکے کا خطاب سن کر زبیدہ بیگم کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو تیرنے لگے۔ وہ ذہن ماضی کے دھندلکوں میں کہیں کھوسا گیا۔

زبیدہ بیگم کا خاندان ہندوستان کا رہنے والا تھا۔ پاکستان معرض وجود میں آیا تو ہندوستان میں فسادات پھوٹ پڑے۔ کسی مسلمان کی جان و مال آبرو محفوظ نہ رہی۔ زبیدہ بیگم کے شوہر جمشید خان نے اپنے دیگر رشتے داروں کے ہمراہ پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا۔ زبیدہ بیگم اپنے شوہر، میکے اور سسرالی رشتے داروں کے ہمراہ نئی زندگی کی امید لیے پاکستان روانہ ہوئیں۔ اس وقت تک اندازہ نہیں تھا کہ یہ سفر کتناں پر طے ہوگا۔

ان کے خاندان کا شمار بھارت کے نواب خاندانوں میں ہوتا تھا مگر پاکستان آتے وقت سب کچھ وہیں رہ گیا۔ جو قیمتی سامان ساتھ تھا، وہ بھی سکھوں نے لوٹ لیا۔ حتیٰ کہ سربراہ شوہر

بھی لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ غنیمت تھا کہ زبیدہ بیگم بڑی لکھی غاتوں تھیں ورنہ شاید مشکلات میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ انھوں نے ایک سرکاری سکول میں ملازمت کر لی اور اپنے بیٹے کی محبت میں سارے غم بھلا دیے۔ انھوں نے باسط کو پوسا، اعلیٰ تعلیم دلوائی اور پھر بڑے مان سے شادی بھی کر دی۔

بہو گھر میں آئی تو انھیں لگا کہ اب ان کے آرام کرنے کے دن شروع ہو گئے مگر اس نے تو ان کی بے آراہی میں اضافہ کر دیا۔ رخسانہ کو بات بے بات جھگڑا کرنے کی عادت تھی۔ وہ منہ پھٹ اور بد زبان واقع ہوتی تھی۔ جھگڑے وقت اس بات کا بھی لحاظ نہ کرتی کہ زبیدہ بیگم رشتے میں ساس تھیں۔ بس جو منہ میں آتا بولے چلی جاتی۔

زبیدہ بیگم اپنی بہو کے اس ناروا سلوک پر دل ہی دل میں خاصی غمزدہ رہنے لگیں۔ انھیں سب سے زیادہ رنج اپنے بیٹے پر تھا جو جان بوجھ کر انجان بنا رہتا۔ کبھی کبھی بیوی کے دے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کرتا مگر پھر رخسانہ کا کوئی سخت جواب اسے خاموش ہونے پر مجبور کر دیتا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بیوی کو سخت لہجے میں تنبیہ ہی کر دیتا۔

جب ان کی پوتی ماہ نور کی پیدائش ہوئی تو انھیں لگا کہ انھیں زندہ رہنے کی وجہ مل گئی۔ وہ ہر وقت اپنی پوتی کو گود میں اٹھائے رہتیں۔ اس بات پر رخسانہ کو کبھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ اسے تو بیٹی کی دیکھ بھال کے لیے مفت کی آیا مل گئی تھی۔ زبیدہ بیگم نے ان دنوں اپنی سرکاری نوکری سے بھی استعفا دے دیا۔ اب ان کا زیادہ تر وقت اپنے گھر پر ہی گزارنے کا ہوتا۔ ان کے ہاں ماہ نور کے بعد کوئی اور اولاد نہ ہو سکی۔ اس لیے وہ سب کی بے حد لاڈلی تھی۔ بڑھاپا، کمزوری، تکلیف وہ ثابت ہوتا ہے۔ زبیدہ بیگم بھی جوڑوں کے درمیان میں مبتلا ہوئیں اور زیادہ تر وقت بستر پر گزارنے لگیں۔

ماہ نور طبیعت اور مزاج میں اپنی ماں کے بالکل برعکس تھی۔ وہ اپنی دادی سے بہت پیار کرتی اور ان کا بے حد خیال

بھی رکھتی۔ روزانہ اسکول جانے سے پہلے دادی کو ناشتا کروا کر جاتی اور واپسی پر اس وقت تک دوپہر کا کھانا نہ کھاتی جب تک دادی کو نہ کھلا لیتیں۔ ماہ نور سمجھتی تھی کہ اس گھر میں سب سے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت اس کی دادی کو ہی ہے۔ وہ جوڑوں کے درمیان وجہ سے چل بھی نہ پاتیں۔

وہ بہت حساس اور زور درخ طبیعت کی مالک تھی، اس لیے زبیدہ بیگم کی حالت دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتی۔ اسے گھر میں دادی کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کا بہت دکھ تھا۔ جب اس کی ماں زبیدہ بیگم کو اکثر اوقات کھوٹے سکے کے خطاب سے نوازتی تو اس کے اندر شدت غم سے تلامطم سا رہا ہو جاتا۔ تاہم وہ ایک باادب بچی تھی اس لیے اپنی ماں کے آگے بول نہ پاتی۔ اسے اپنے والد پر بھی بہت افسوس ہوتا۔ ان کی خاطر زبیدہ بیگم نے دوسری شادی تک نہ کی تھی۔ نہ جانے کس قدر مشکلات و مصائب برداشت کیے مگر وہ اب بیوی کے ڈر سے ماں کے کمرے کا رخ کرنا بھی بھول گئے تھے۔ بس تنہی میں ایک آدھ بار ان کے کمرے میں آتے اور رسمی طور پر پوچھ لیتے کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

ماہ نور اکثر اوقات دادی سے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی سبق آموز داستان سنتی۔ وہ ان کی باتوں میں کھوسی جاتی۔ ایک بار اس نے پوچھا:

دادی آپ کا خاندان ہندوستان میں بہت امیر تھا۔ آپ کی شادی بھی امیر خاندان میں ہوئی۔ شادی کے دن دادا جان نے آپ کو سونے کے چار کڑے بھی تحفے کے طور پر دیے تھے۔ وہ کہاں گئے؟

زبیدہ بیگم اس کا سوال سن کر مسکرائیں اور بولیں ”ہاں، وہ بہت وزنی کڑے تھے۔ ایک کڑا تقریباً ڈیڑھ دو پاؤ کا تھا۔ میرے لیے تو انھیں پہننا بھی مشکل تھا۔ اب تو اس طرح کے کڑے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ہجرت کے وقت وہ کڑے میرے پاس ہی تھے مگر جب سکھوں نے حملہ کیا تو کہیں کھو گئے۔“

زبیدہ بیگم کے رشتے دار کبھی کبھی جب ان سے ملنے آتے تب بھی کڑوں کا ذکر ضرور ہوتا۔ زبیدہ بیگم سب کو بڑے فخریہ لہجے میں بتاتیں کہ ان کے مرحوم سسر نے شادی پر کس قدر مہنگا تحفہ دیا تھا۔ وہ ان کڑوں کے کھوجانے پر افسوس اور غم کا اظہار کیا کرتیں کہ تحفہ سنبھال کے نہ رکھ پائی۔ ایسے میں ان کے رشتے دار انھیں تسلی دینے کہ جو شے کھو گئی اس پر غم نہ کریں۔ جان بچ گئی اور ایک علیحدہ وطن مل گیا، کیا یہ کم ہے؟

زبیدہ بیگم جواب اس مسکرا کر رہ جاتیں۔ ان کی بہو رخسانہ اسے وقت بھی طے کرے تیر برس آنے سے باز آتی اور اونچی آواز میں کہتی ”سونے کے کڑے کھو گئے تو ان کی حیثیت ہمارے نزدیک کھوٹے سکے کی مانند ہی ہے جو کسی کام کے نہیں۔“

زبیدہ بیگم کے عزیز واقارب نہیں جانتے تھے کہ کھوٹے سکے سے رخسانہ کا کیا مطلب ہے مگر ماہ نور، باسط اور زبیدہ بیگم اس کا مطلب بخوبی سمجھ جاتے۔ اس وقت زبیدہ بیگم بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھتیں۔ وہ عام طور پر رخسانہ کے طعنے سن کر ان کی آنکھیں جھلک پڑتیں تھیں۔ بہر حال رخسانہ کے طعنے سہتے ہوئے وہ اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔

اگلے چند مہینوں میں گھر کی پریشانیوں میں زبیدہ بیگم باسط کا کاروباری نقصان دگنا ہو گیا۔ اس نے بینک سے گھر کی ضمانت پر قرضہ لے کر کاروبار پر پیسا لگایا تھا مگر فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہو رہا تھا۔ رخسانہ پہلے ہی خاصی منہ پھٹ تھی، اب معاشی ٹھکرات نے اسے مزید چڑچڑا اور ہمزاج بنا دیا۔ وہ ہر وقت باسط سے لڑتی رہتی جبکہ زبیدہ بیگم اپنے بستر پر لیٹی جھگڑنے کی آوازیں سن کر دل ہی دل میں کراہتی رہتیں۔ ان کی جوڑوں کے درمیان دو ابھی ختم ہو چکی تھی۔ باسط باقاعدگی سے ہر مہینے دوائی لے کر آتا تھا۔ اس بار گھر کی پریشانیوں اور رخسانہ کے طعنے کے تیر سہ سہ کر وہ بھی بھول بیٹھا کہ ماں کی دوا ختم ہو چکی۔

بیٹا شاید ماں کو بھول جائے مگر ماں بیٹے کو کبھی نہیں بھولتی۔ زبیدہ بیگم کو ماہ نور سے تمام باتوں کا علم ہو جاتا تھا۔ انھیں علم تھا کہ کاروبار کا دیوالیہ نکل چکا اور بینک نے

قرض کی وصولی کے لیے آخری ٹوکس بھیج دیا ہے۔ بصورت دیگر بینک گھر کی بنیادی کے لیے قانونی چارہ جوئی کر سکتا تھا۔ اس گھر کے لیے پلاٹ زبیدہ بیگم نے ایک ایک باقی جوڑ کر خریدا تھا جبکہ مکان کی تعمیر بیٹے نے کی تھی۔ اس گھر کی بنیادی زبیدہ بیگم کو کسی صورت بھی گوارا نہیں تھی۔ انھوں نے گھر کو بنیادی سے بچانے کے لیے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اگرچہ یہ فیصلہ ان کے لیے بہت مشکل تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ ماہ نور کمرے میں ناشتا لے کر داخل ہوئی تو دادی کی آنکھیں بند دیکھ کر چونک پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ دادی فجر کی نماز کے بعد جاگتی رہتی تھیں۔ جوڑوں میں درد کے باوجود زبیدہ بیگم کوئی نماز قضا نہیں کرتی تھیں۔ اگرچہ بستر سے اٹھتے اور رکوع و سجود میں جاتے وقت انھیں خاصی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ ماہ نور جب بھی ان کے کمرے میں داخل ہوتی تو وہ مسکراتی جاگ رہی ہوتیں۔ یہی وجہ تھی کہ آج خلاف توقع اپنی دادی کی آنکھیں بند دیکھ کر ماہ نور کو کچھ تشویش لاحق ہوئی۔ ”دادی، آپ ابھی تک سوکیوں رہی ہیں؟“ ماہ نور نے یہ کہہ کر ناشتے کے برتن ایک طرف رکھ کر زبیدہ بیگم کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اچھل پڑی۔ ان کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ دادی کیا ہوا ہے آپ کو؟ اس نے گھبرا کر زبیدہ بیگم کو بلایا جلا یا۔ آواز سن کر زبیدہ بیگم نے آنکھیں کھول دیں اور پھر ماہ نور کو دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک محبت بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”کچھ نہیں بس ذرا سا بخار ہو گیا ہے۔“ انھوں نے نفاہت زدہ لہجے میں کہا۔ ”تم ذرا الطاف اور ہوسے کہو کہ میں نے انھیں اپنے کمرے میں بلایا ہے۔ جاؤ فوراً انھیں میرا پیغام دو۔“

دادی کی بات سن کر ماہ نور فوراً ہی اپنے امی ابو کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ ”ابو جان، دادی نے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا ہے اور امی جان آپ کو بھی۔“ داخل ہوتے ہی اس نے والدین سے کہا۔ ”کیوں کیا ہوا؟“

”دادی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ آپ دونوں ان کے کمرے میں آجائیں۔ انھیں کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”امی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں؟“ یہ کہتے ہوئے باسط فوراً اپنی کرسی سے اٹھا اور ماہ نور کے ہمراہ زبیدہ بیگم کے کمرے میں آ گیا۔ رخسانہ نے بیٹی کی بات سن کر کسی خاص رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور وہ خاموشی سے بستر پر لیٹی رہی۔

”امی جان کیا ہوا آپ کی طبیعت کو؟ کمرے میں داخل ہو کر باسط نے ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔“

”بڑے دن بعد میرے کمرے میں آئے ہو اور وہ بھی میرے بلانے پر!“ زبیدہ بیگم نے جواب دینے کی بجائے اٹنا سوال کر دیا۔

”بس آپ تو جانتی ہیں کہ کام کی مصروفیت ہی کچھ ایسی ہے۔ فرصت ہی نہیں مل پاتی۔“ باسط نے کھیانے لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ میں ابھی ٹیکسی منگواتا ہوں تاکہ آپ کو اسپتال لے جایا جاسکے۔“

”نہیں میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ مجھے ضروری بات کرنی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میرا وقت ہی پورا ہو جائے۔“

”آپ مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہیں امی جان!“ باسط نے ماں کے سر ہانے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو معمولی سا بخار ہے۔ دوانی کھانے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے وہ کون سی ضروری بات ہے؟“

زبیدہ بیگم نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ انھوں نے بیٹے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ رخسانہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ”کیا ہوا ہے امی جان کو؟“ اس نے زخمی سے لہجے میں پوچھا۔

اس کی آواز سن کر زبیدہ بیگم نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی حیرت پھیل گئی۔ شاید انھیں توقع

نہیں تھی کہ بلانے پر رخسانہ بھی کمرے میں آجائے گی۔ وہ ان کی بات کو غلط فہم نہیں سمجھا لاتی تھی۔

”رخسانہ دل کی بری نہیں امی!“ باسط فوراً بیوی کی حمایت میں بول پڑا۔ ”بس آپ تو جانتی ہی ہیں کہ یہ بلند فشار خون کے مرض میں مبتلا ہے، اس لیے غصے میں آ کر جو منہ میں آئے بول دیتی ہے۔“

زبیدہ بیگم نے شکوہ بھری نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا تو اس نے بے اختیار ماں سے نظریں پٹرائیں۔

”ابو جان، دادی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا چاہیے۔“ ماہ نور نے کہا تو وہ چونک پڑا۔ زبیدہ بیگم نے دوبارہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لگتا تھا کہ ان کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ باسط نے فوراً موبائل فون نکالا اور ایک جاننے والے ٹیکسی ڈرائیور کو فون کر کے جلد از جلد اپنے گھر پہنچنے کا کہا۔ ”میس پیکیس منٹ میں ٹیکسی پہنچ جائے گی۔“ اس نے

ماہ نور کی استفسار طلب نگاہوں کے جواب میں کہا۔ اسی لمحے زبیدہ بیگم نے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا۔ ”باسط بیٹے، ماہ نور نے بتایا ہے کہ کاروبار بالکل ختم ہو گیا ہے۔“ ”جی امی جان، کاروبار کا دیوالیہ نکل چکا۔“ اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ میں اب گھر کا خرچ چلانے کے لیے نوکری کر رہا ہوں۔ تنخواہ اچھی ہے، بس سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ گھر بنیادی سے کیسے بچاؤں۔“

”میری ایک خواہش پوری کرو گے؟“ زبیدہ بیگم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے کہا۔ ”جی ضرور امی جان۔“ زبیدہ بیگم آخرا اس کی ماں تھیں۔ ماں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اس کے اندر سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی تھی۔ آج اسے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ زبیدہ بیگم نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اسے نہ صرف پال پوس کر بڑا کیا بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی تھی اور اس کی خاطر دوسری شادی بھی نہ کی۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم کمرے کے اس کوٹے کا فرش کھود ڈالو۔“ زبیدہ بیگم نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا فرش ٹیڑھا تھا۔ اسے اپنی ماں کی فرمائش پر تاقیم چہرے سے عیاں تھا کہ اسے اپنی ماں کی فرمائش پر

ماں کی عجیب و غریب فرمائش پر باسط نے حیرت بھرے انداز میں انھیں دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے لگا جیسے پیاری کی وجہ سے والدہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ ”مگر کیوں امی جان؟“ اس نے استفسار کیا۔

”جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔“ زبیدہ بیگم کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

”ابو جان! دادی کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ ماہ نور نے بے چین لہجے میں کہا۔

”ہاں“ باسط نے فکر مند سی ماں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”بس چند منٹ تک ٹیکسی پہنچ جائے گی۔“ رخسانہ بھی آگے بڑھ کر زبیدہ بیگم کی حالت کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساس کی مخدوش حالت دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی ہمدردی کے تاثرات اُمٹ آئے۔ اگرچہ وہ خاصی بد مزاج تھی مگر انسانیت کے جذبے سے بالکل نااہل بھی نہیں تھی۔

”باسط، کیا تم اپنی ماں کی اتنی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے؟“ زبیدہ بیگم نے اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا۔ ماں کی بات سن کر باسط کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں انھیں دیکھتا رہا پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے محسن میں پڑی ایک پرانی کدال اٹھائی اور وہاں کمرے میں آگیا۔ اس دوران زبیدہ بیگم کی اکھڑی سانسیں کچھ حد تک بحال ہو چکی تھیں۔

اس جگہ کا فرش توڑ ڈالو اور پھر زمین کھود دو۔“ زبیدہ بیگم نے دوبارہ کوٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں تمہاری ایک امانت دفن ہے۔“ انھوں نے بڑی عجیب بات کی تھی۔ باسط نے انجمن آمیز نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ نہ جانے وہ کس امانت کا ذکر کر رہی تھیں۔ رخسانہ اور ماہ نور کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات عموماً آتے۔ باسط نے مزید بحث مناسب نہ سمجھی اور کدال سے فرش کا وہ حصہ توڑ ڈالا جس طرف زبیدہ بیگم نے اشارہ کیا تھا۔ پکا فرش ٹوٹنے ہی کی بجائے زمین نمودار ہو گئی۔ اس نے زمین کھودنا شروع کر دی تاہم چہرے سے عیاں تھا کہ اسے اپنی ماں کی فرمائش پر



پچھلی اقساط کا خلاصہ
ہندوستان میں مالابار کے ایک ہندو
راجا نے سب سے پہلے اسلام قبول
کیا۔ خلفائے راشدین کے دور میں
اسلامی لشکر برصغیر کے نزدیک آپہنچا۔
ساتویں صدی میں سندھ کے حکمران،
راجاداہر نے عرب جہازرانوں کے
بحری جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ محمد بن قاسم
مسلمانوں کو رہا کر دے اپنے اور انیس
کامیابی نصیب ہوئی۔ اسی طرح جنوبی
ایشیا میں مسلمانوں کے قدم جم گئے اور
دس اسلام کی اشاعت ہونے لگی۔ محمد
بن قاسم کے بعد ہندو راجاؤں اور محمود
غزنوی کی جنگ ہونے لگی۔ راجاؤں کو
سبق سکھانے کی خاطر پھر محمود غزنوی
ہندوستان پر حملے کرنے لگے۔

اب آگے بڑھیے

سومناٹھ کی فتح

ہندوؤں کا مقدس ترین مندر
گرا کر جب محمود غزنوی نے
بُت پرستوں کی اکٹوفوں کا فور کر ڈالی

سونا زمین میں دفن ہو کر خوب محفوظ ہو گیا مگر رات میں نے بہت
سوچا۔ مجھے لگا کہ میں اپنے مرحوم شوہر کی نشانی کے بارے میں
خاصی خود غرض ہو گئی ہوں۔ اس پر تمہارا بھی حق بنتا ہے۔ ویسے
بھی میرے مرحوم شوہر کی اصل نشانی تو تم ہو اور تمہیں ان
دونوں بیویوں کی بھی سخت ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں
نے سینے میں برسوں سے مدفون اس راز کو تم پر آشکارا کر دیا
کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ یہ گھربنام ہو۔ اب یہ کڑے سچ کر تم
اس گھر پر واجب قرض اتار سکتے ہو۔ آئندہ کوئی بھی کاروبار
اچھی طرح سوچ کر کرنا اور ہاں کچھ پیسے ماہ نواری شادی کے
لیے بھی بچا رکھنا۔ بات کرتے ہوئے زبیدہ بیگم کی سانسیں
اکھڑنے لگیں تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔

”امی جان! آپ نے آج ہمیں یہ سونادے کہ ہمارے
گھر کو بکھرنے سے بچا لیا۔ میں نے ہمیشہ آپ کے ساتھ
ابانت امیر رویہ اپناتے رکھا۔ مجھے معاف کر دیں۔“ رخسانہ
نے بے اختیار سراسر کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ شاید اُسے بھی
اپنی غلطی کا کچھ نہ کچھ احساس ہو گیا تھا۔

رخسانہ کے معافی مانگنے پر زبیدہ بیگم کے چہرے پر
گہرے اطمینان کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔ وہ اکھڑی
سانسوں کے درمیان بولیں ”ہو شاید نئے زمانے کے
باسیوں کے لیے ہم بوڑھے واقعی کھوٹے سکے کی حیثیت
اختیار کر چکے مگر یاد رکھنا کبھی کبھی کھوٹے سکے بھی کام آجاتے
ہیں۔“ یہ سن کر رخسانہ کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات
عود کر آئے۔ زبیدہ بیگم نے ایک بار پھر انھیں موند لیں۔
اُن کے سینے کا اتار چڑھاؤ یکدم ختم ہو گیا تھا۔ ”امی جان کیا
ہوا آپ کو؟“ رخسانہ اُن کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ باسط بھی
والدہ کے قریب آیا اور اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ سانسوں کی
گرمابٹ محسوس کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

”دادی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ ماہ نور نے زبیدہ بیگم کو
روتے ہوئے کہا۔ مگر دادی نے انھیں نہیں کھولیں۔ اس
بار انھوں نے ہمیشہ کے لیے انھیں موند لی تھیں۔ ♦♦♦

بہت حیرانی ہے۔ ایک فٹ کھدائی کے بعد کدال کسی سخت
چیز سے ٹکرائی تو اُس نے اپنے ہاتھ روک دیے۔ پھر کدال
ایک جانب رکھ کر ہاتھوں سے مٹی نکالنے لگا۔ اب اُس کے
چہرے پر تجسس کے تاثرات در آئے تھے۔ رخسانہ اور ماہ نور
بھی مبہوت ہو کر یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

مٹی نکالنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر باسط زمین سے ایک
چھوٹی سی فولادی صندوقچی برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔
اُس نے صندوقچی پر لگی مٹی صاف کی اور پھر اسے لیے اپنی
ماں کے پاس آ گیا۔

”اے کھولو“ زبیدہ بیگم نے عجیب لگا ہوں سے صندوقچی
دیکھتے ہوئے کہا۔ باسط نے وہ صندوقچی کھول دی۔

”ارے اس میں تو چار درہنی کڑے ہیں۔ غالباً یہ سونے
کے ہیں۔ اس کے حلقے سے تیر خیر آواز برآمد ہوئی۔ کڑے
دیکھ کر ماہ نور اور رخسانہ بھی ششدر رہ گئیں۔

ہاں، یہ سونے کے وہی کڑے ہیں جو میرے مرحوم شوہر
اور تمہارے والد نے شادی کے وقت مجھے تحفے میں دیے
تھے۔“ زبیدہ بیگم نے جواب دیا۔

”مگر امی جان وہ سونے کے کڑے تو ہجرت کے دوران
کہیں کھو گئے تھے۔“ باسط نے حیرت سے سوال کیا۔

”نہیں بیٹا یہ ہمیشہ سے میرے پاس تھے۔ جب سکھوں
نے ہم پر حملہ کیا تھا تو انھیں میں نے اپنے لباس میں ایک تھیلی
کے اندر چھپا رکھا تھا۔ قسمت اچھی تھی جو قیمتی کڑے بچ گئے۔
میں نے پھر یہ سوچ کر انھیں محفوظ کر دیا کہ بڑے وقت میں کام
آئیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں کڑے ہمیشہ اپنے پاس
رکھنا چاہتی تھی۔ شاید میں اپنے مرحوم شوہر کی اس نشانی کے بارے
میں بہت حساس ہو گئی تھی۔ مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ
کہیں کوئی مجھ سے انھیں چھین نہ لے۔ اس لیے میں نے
انھیں صندوقچی میں بند کر کے زمین میں دبا دیا۔

”تمہیں یاد ہوگا کہ جب ہم اُس گھر میں منتقل ہوئے تھے تو
اس کا فرش کچا تھا۔ بعد میں تم نے اسے پکا کر دیا۔ اس طرح یہ

باپ جے پال کی طرح آئند پال نے بھی دہلی، گوالیار، اجیر، کانہر، اجین اور تونج وغیرہ کے راجاؤں اور وحشی کھوکھروں (گلکھڑوں) کو ساتھ ملا کر زیر دست فوج محمود غزنوی کے خلاف تیار کر لی۔ اس کے ساتھ مقابلے کی خاطر محمود نے جہانگیر ۱۰۰۸ء کو ساتھ لایا۔ سب راجاؤں کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر محمود آئند پال کے استحصال میں کامیاب ہو گیا تو پھر پورے ہندوستان یعنی دہلی اور موجودہ یوپی، بہار اور دکن کے درمیان کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔

اس لیے پورا ہندوستان متحد ہو کر اپنے تمام وسائل اور مذہبی و عوامی جوش و خروش کے ساتھ محمود کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ بالخصوص کھوکھروں میں شدید جذبہ مخالفت تھا۔ ان کی عورتوں نے زور پٹخ کر لشکریوں کی مدد کی اور جو غریب تھیں، انھوں نے چرخہ کات اور مزدوری کر کے پیسے بچائے اور ان سے چیزیں خرید کر لشکریوں کو روانہ کیں۔

انک کے قریب جنگ ہوئی۔ ہفتوں گھمان کی لڑائی ہوتی رہی۔ کشتوں کے پٹھے لگ گئے۔ لڑائی کے آغاز میں کھوکھروں نے سخت حملہ کیا اور محمود کے خیمے تک پہنچ گئے، لیکن جلد ہی لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔ آئند پال کا ہاتھی بگڑ کر بھاگ گیا۔ دوسرے راجاؤں نے یہ سمجھا کہ آئند پال نے ان کے ساتھ دغا بازی کی ہے۔ وہ سب بد دل ہو گئے۔ فوج میںیں افراتفری پھیل گئی۔ یوں میدان محمود کے ہاتھ رہا۔ اس شاندار فتح کا ہندوستان پر غیر معمولی اثر پڑا۔ تنہا محمود نے کئی بڑے بڑے راجاؤں کے قدم اکھاڑ دیے۔ ہندوستان بھر میں محمود کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ خیال عام ہو گیا کہ محمود کا مقابلہ بے سود اور اسے شکست دینا محال ہے۔

اس بڑے معرکے سے فارغ ہو کر محمود نے نگر کوٹ (کاگلہ) کا رخ کیا۔ یہاں زمانے کا اہم تیرتھ تھا اور اسے

ہندوستان میں وہی حیثیت حاصل تھی جو قدیم یونان میں ڈیلفی کی تھی۔ مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے کہ ہندو بڑے اور کٹھن کام شروع کرنے سے پہلے نگر کوٹ کے بت سے مشورہ لیتے تھے۔ اگر اجازت ملتی تو اس کام کو شروع کرتے، ورنہ اس سے دست کش ہو جاتے۔ فرشتہ تو یہاں تک لکھتا ہے کہ اس زمانے میں بعض لوگ، جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، وہ بھی اس بت سے مشورہ کرتے۔ بت خانے میں ثواب کی غرض سے بڑے چڑھاوے اور نذرانے پیش کرتے۔ بہر حال تین دن کے محاصرے کے بعد نگر کوٹ کا مضبوط پہاڑی قلعہ فتح ہو گیا۔ یہاں کے بت خانے سے بے شمار مال غنیمت محمود کے ہاتھ آیا۔

ساتواں حملہ ۱۰۰۹ء

محمود نے ساتواں حملہ نارائن یا نار دین نام کے مقام پر کیا، جس کے بارے میں بعض مورخین کے درمیان اختلاف ہے اور بعض نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ بھی تحقیق نہیں کی جا سکی کہ آج کے جغرافیائی نقشے میں اس مقام کا کیا نام ہے۔ لیکن یہ جگہ حملے کے وقت سیاسی اور فوجی نقطہ نظر سے اتنی اہم تھی کہ اس کے فتح ہونے سے ایسا معاہدہ امن ہوا جس کے نتیجے میں ہندوستان خراسان تک کے تجارتی راستے کھل گئے۔ بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ نارائن پور ریاست اور مسین ہے۔ اسی سال محمود نے غزنی واپس جا کر ایک خاص عسکری چال سے غور پر بھی قبضہ کر لیا۔

آٹھواں حملہ ۱۰۱۰ء

محمود نے ہندوستان میں آٹھویں مہم ملتان کے شہر پندار بدعتیہ قرامطہ کے خلاف انجام دی اور ان کی خدا دغا گیری و دشواری دیکھتے ہوئے ان کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہاں کے

حکمران ابونعیم داؤد کو گرفتار کر کے عمر قید کی سزا دی اور دوسرے قرامطیوں کو بھی سخت سزائیں دیں۔ ملتان کو سلطنت غزنی میں شامل کر لیا، تاکہ مسلم حکومت کے علاقے میں مسلسل فتنہ پرداز یوں کا مکمل سد باب ہو جائے۔ ملتان میں اپنا گورنر مقرر کیا۔ محمود غزنوی نے محمد بن قاسم کی ہوائی ہوئی جامع مسجد اصر نو آبادی، جس کو قرامطی حکمرانوں نے مسمار کر دیا تھا۔

نواں حملہ ۱۰۱۱ء

نواں حملہ تھانیس پر ہوا جو ہندوؤں کی ایک بہت بڑی زیارت گاہ تھی۔ وہاں کے مندر کا بت قدیم ترین تصور کیا جاتا تھا۔ مندروں میں دولت کے انبار لگ گئے تھے۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ تھانیس کا بت ہمیشہ ان کی پشت پناہی کرتا رہے گا۔ راجاؤں کی شرارت رک نہیں رہی تھی اور وہ اپنی بدعہدیوں اور جنگ بازیوں سے بار بار محمود کو پریشان کر رہے تھے۔ چنانچہ محمود نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس مقام کی طرف رخ کیا۔ لشکر میں کثیر تعداد میں ہندو سپاہی بھی تھے، اس لیے کہ راجا آئند پال نے نہ صرف کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ سامان رسد بہم پہنچایا اور فوج بھی فراہم کی۔ اس نے یہ استدعا کی کہ اگر تھانیس کے مندروں کو سالم چھوڑ دیا جائے تو وہ اس کے عوض خطیر رقم پیش کرے گا۔ محمود نے یہ پیشکش نامنظور کر دی۔ تھانیس کے راجا نے دوسرے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملانا چاہا، لیکن اس نے یہ کوشش اس وقت کی جب محمود کی فوجیں سر پر آ چکی تھیں۔

راجا نے محمود کو دولت کی رشوت پیش کی، مگر محمود کا مقصد ہر قسم کے سیاسی فتنے کو دبانا تھا۔ خاص کر وہ جو مذہبی جذبات ابھار کر پیدا کیے جاتے، زیادہ خطرناک معلوم ہوتے تھے۔ راجا نے مایوس ہو کر راہ فرار اختیار کی۔ بت خانوں، مندروں اور شہروں سے بے شمار مال غنیمت حاصل ہوا۔ ۱۰۱۲ء میں غزنی واپس آ کر محمود نے خلیفہ بغداد کو بدادھ کا کر سر قند پر قبضہ کر لیا۔

یہ حملہ شوالک کے علاقے پر ہوا، جہاں آئند پال کے جانشین ترلوچن پال نے حاکم کشمیر کے ساتھ مل کر بڑا زور باندھا تھا۔ یہ علاقہ محمود کے ان عزائم کی راہ میں حائل ہو رہا تھا، جو ہندوستان کے شورش پسندوں اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے سلطان کے ذہن میں تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جب تک تمام فتنوں کا سد باب نہ کیا جائے، سلطنت غزنی کو ہندوستان سے لاحق ہونے والا خطرہ دور نہیں ہوگا۔ ہندو شاہی کا آخری تاجدار ترلوچن پال کا لڑکا بھییم پال تھا جو "نڈر بھیم" کے نام سے مشہور تھا۔ بھییم نے اپنے دادا آئند پال کی راہ اطاعت چھوڑ کر شدید مخالفت پر کمر باندھی۔ محمود فوج لے کر بڑھا تو بھییم پال نے جہلم کے مقام پر اس کا راستہ روکا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ بھییم کو شکست ہوئی اور محمود نے اس علاقے کو بھی سلطنت غزنو میں شامل کر لیا۔

گیارہواں حملہ ۱۰۱۵ء

یہ حملہ کشمیر پر کیا گیا جہاں کی سرحدوں تک، دو سال پہلے محمود آ کر لوٹ چکا تھا، لیکن ترلوچن کی شکست کے بعد جب دشمن نے کشمیر میں پناہ لی اور وہاں بیٹھ کر سازشیں کرنے لگا تو محمود کو اس کی طرف رخ کرنا پڑا۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا اور غزنوی فوج علاقے کے اندر دور تک نہیں جا سکی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان کئی ماہ تک قلعہ لوہ کوٹ کا محاصرہ کیے رہا مگر جب موسم خراب ہونے لگا اور ناقابل برداشت ہو گیا تو وہ اپنا لشکر لے کر واپس ہو گیا اور اسی میں اس نے قدرتی مشکلات کے سبب بہت نقصانات اٹھائے۔

یہ ہندوستان میں محمود کی پہلی ناکامی تھی۔ اس کے باوجود کشمیر کی بڑی مہم کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہاں کے امن پسند، سادہ لوح مظلوم عوام نے جب مسلمانوں کے حسن کردار اور اسلام کی برکتوں کو دیکھا تو وہ نہایت متاثر ہوئے اور فطری طور پر دین حق کی طرف راغب ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری اکثریت مسلمان ہوئے اور وہاں تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔

غزنی واپس جا کر محمود نے خوارزم کا علاقہ اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیا۔

بارہواں حملہ۔ ۱۰۱۸ء

اب قنوج کی باری تھی، اس لیے کہ یہ شمالی ہندوستان کی مرکزی ریاست تھی اور تب سب سے بڑی طاقت سمجھی جاتی۔ محمود غزنوی نے ارادہ کیا کہ ایک فیصلہ کن حملہ کر کے ہندوستان میں بار بار پاپا ہونے والی شورشوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے، تاکہ ہندوستان اور سلطنت غزنہ میں مکمل امن و امان قائم ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے محمود نے ایک زبردست فوج کے ساتھ غزنی حکمت عملی ترتیب دی اور پیش قدمی کا وہ پرانا راستہ بھی بدل دیا جس میں قدم قدم پر خون ریز مقابلے کرنے پڑتے تھے۔

اس سلسلے میں ہندوستان کے بعض راجاؤں نے بھی اس کی مدد کی، خاص طور پر راجا کشمیر نے راہنمائی کی۔ غزنوی کی فوج انتہائی شمالی علاقوں میں کوہستان ہمالیہ سے نکلنے اور دامن ہمالیہ میں پہنچنے والے دریاؤں کے کنارے کنارے سپل کر گیا۔ ایک قنوج پہنچ گئی۔ وہاں پہنچتے ہی اس کی فتوحات کا آغاز ہو گیا۔ اس کے گزشتہ عسکری کارناموں کا وہ بدیاس درجہ طاری تھا کہ نہ تو قنوج کے راجا کو جنگ کرنے کا حوصلہ ہوا اور نہ دوسرے راجے اس کی مدد کے لیے آنے کی ہمت کر سکے۔ راجا نے ہتھیار ڈال دیے۔

محمود نے بڑی فیاضی سے کام لے کر اسے نہ صرف امان دی بلکہ معاہدہ امن پر قائم رہنے کی صورت میں اپنی جانب سے پورے تحفظ کی یقین دہانی بھی کروائی۔ قنوج کی ہم کے دوران متھرا، میرٹھ اور بلند شہر وغیرہ میں محمود غزنوی کو فتوحات حاصل ہوئیں۔ لگتا ہے، پورا شمالی مغربی ہندوستان (موجودہ پاکستان) اس کا اطاعت گزار ہو گیا۔ اس مہم میں مال غنیمت اور اسیران جنگ تو بہت بڑھ آئے، مگر خون ریزی نہیں ہوئی۔ متھرا کے مندروں کی طرح تعمیر محمود کو اس قدر پسند آئی کہ اس نے ان کی تعریف اپنے ”فتح نامہ“ میں بھی کی۔ اس حملے اور

کامیابی کی خبر سارے عالم اسلام میں پہنچی۔ خلیفہ بغداد نے محمود کا ”فتح نامہ“ وصول کرنے کے لیے خصوصی دربار منعقد کیا۔

تیرہواں حملہ۔ ۱۰۱۸ء

یہ حملہ کالنج پر اس لیے ہوا کہ وہاں کے راجا نند رائے نے محمود کے خلاف ہندو شاہی خاندان کے راجا ترلوچن پال اور دوسرے راجاؤں کو مل کر زبردست متحدہ لشکر ترتیب دیا تاکہ محمود سے پچھلی شکستوں کا انتقام لیا جائے۔ اس سازش میں وفاداری کے عہد کے باوجود پنجاب کا راجا جے پال دوم بھی شریک ہو گیا۔ البتہ قنوج کا راجہ سازش سے الگ رہا، جس کی سزا سے یہ دی گئی کہ دوسرے راجاؤں نے اس کے خلاف بھی مجاذ بنالیا۔ ان واقعات کی اطلاع راجا قنوج نے محمود غزنوی کو بھیجی۔

وہ اور اپنی فوج نے کرباشی راجاؤں کو ایک بار پھر ان کی شورش پسندی کا مزہ چکھانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ پنجاب کے بے وفار راجا نے اس کا راستہ روکنا چاہا، جس کے سبب محمود کو منزل تک پہنچنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ قنوج پر راجاؤں نے قنوج کے راجا کا کام تمام کر دیا۔ جب محمود کالنج پہنچا تو تقریباً ایک لاکھ کے عظیم الشان لشکر دیکھ کر ہندو متحدہ لشکر کالنج کے میر لشکر راجا پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ محمود نے اتنے دور دراز علاقے میں مزید قیام پالشکر کشی محفوظ نہ سمجھی، کیونکہ پنجاب ابھی تک اس کے زیر نگیں نہ تھا، اس لیے کسی مزید فوجی کارروائی کے بغیر وہ واپس آ گیا۔

چودھواں حملہ۔ ۱۰۲۱ء

محمود غزنوی کو پنجاب پر مکمل قبضہ کرنے کی ضرورت و اہمیت کا احساس پہلے ہی بارہو چکا تھا، لیکن اس مرتبہ شدت سے ہوا۔ پنجاب کے بغیر اس کی دور دراز کی مہمیں خطرے سے خالی نہ تھیں، اس لیے اس مرتبہ محمود اسے مکمل فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ اس مرتبہ معیت میں صرف فوج ہی نہیں، بلکہ ساتھ انجینئر، بڑھئی، لوہار اور سنگ تراش بھی

تھے۔ یہ اس لیے کہ اس بار وہ صرف حملہ کرنے نہیں آیا تھا، بلکہ اس کا مقصد پنجاب کو فتح کر کے وہاں منظم حکومت قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے پنجاب کے خاندانی غدار بچے پال دوم کو موت ناک شکست دی۔ وہ فرار ہو گیا۔ محمود غزنوی نے کلاں کو صاف کر دیا اور سردار خواجہ ایاز کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ پنجاب کے مختلف حصے اپنے افسروں کے سپرد کیے اور اہم مقامات پر چھاؤنیاں مقرر کیں۔ پنجاب زیر نگیں کر کے محمود کو اپنی آئندہ مہمات کے بارے میں ذرا اطمینان ہوا۔ چنانچہ اس کی اگلی دو مہمیں دور دراز علاقوں میں ہوئیں۔

پندرہواں حملہ۔ ۱۰۲۲ء

کالنج کا راجا نند رائے اب بھی محمود کے خلاف مسلل رہا۔ چنانچہ محمود ایک بار پھر کالنج روانہ ہوا۔ راستے میں گوالیار کا شہر آتا تھا جہاں کے راجا نے نند پال کی مدد کی تھی۔ محمود کے حملے سے گوالیار کا راجا خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے باقی حصے کی پیش کش کی۔ محمود نے قبول کی اور محاصرہ اٹھالیا۔ اب محمود نے آگے بڑھ کر کالنج کے مضبوط قلعے کا محاصرہ کر لیا اور سرد کے ساتھ بند کر دیے۔ آخر راجا نند رائے صلح کی درخواست کی۔ اس نے سوہاگہ پیش کیے اور سالانہ خراج دینے کا یقین دلایا اور محمود کی زبان میں ہندی زبان میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔

محمود نے ایک بار پھر عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راجا کو معاف کر دیا۔ کالنج کا راجا محمود کی بلند سیرت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے محمود کے انتقال کے بعد بھی سرکشی نہیں کی اور کالنج کا قلعہ کئی سال تک غزنی کی حکومت کے زیر نگیں رہا۔

سولہواں حملہ۔ ۱۰۲۵ء

سومنا تھ اور کچھ کے شہر بحری بیڑوں کے اڈے تھے۔ زمانے میں وہاں اکثر عرب جہازوں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ اس لیے اس علاقے میں آکر زیادہ سرگرم ہو گئے تھے۔ مہرات میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کی جا رہی

تھیں۔ سومنا تھ میں مسلمان تاجروں کی ایک بستی تھی، جہاں ایک بڑے متقی بزرگ محمد بن حسن عراقی مقیم تھے۔ وہ محمود شاہ شکر دلی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان سے مسلمانوں کی حالت زار دیکھی گئی اور انھوں نے محمود غزنوی کو خط لکھا کہ وہ آکر مسلمانوں کو مصیبتوں سے نجات دلانیں۔

تاریخ کی کتابوں میں یوں بھی آیا ہے کہ ایک نئے مہنت کی جانشینی کے جھگڑے میں کسی فریق نے سلطان محمود سے مدد مانگی اور اس کو اپنی فوج کے ساتھ آنے کی دعوت دی۔ اس کے علاوہ عہد وسطی کے ہندوستان میں مندر ایک طرف مال و دولت اور عیش و عشرت کے مراکز بن گئے تھے، دوسری طرف مظلوم عوام کے مقابلے میں ہمیشہ ظالم راجاؤں اور سرداروں کی حمایت کرتے تھے، نیز اصحاب اقتدار مندروں کو اپنے اقتدار کے لیے بے دریغ استعمال کرتے۔ چنانچہ عبادت گاہوں کو ہر قسم کی سازشوں کا اڈہ اور فتنوں کا سرچشمہ بنا دیا گیا۔

سومنا تھ کے متعلق بافق الفطرت کرامات کے ادا ہام و خرافات نے اس کو ان عقائد کا سب سے بڑا مرکز بنا دیا جن کا سہارا لے کر اور ان کی دہائی دے کر ہندوستان کے راجے، مہاراجے عوامی جذبات مشتعل کرتے تھے۔ ان کی اس اشتعال انگیزی کے نتیجے میں بار بار سلطنت غزنی کے خلاف شورشیں برپا ہوتی تھیں۔ جنگوں میں ہارے ہوئے راجے، مہاراجے، جن کو محمود معاف کر دیا کرتا تھا اور وہ اس کی اطاعت کا بھی عہد کر لیتے تھے، بہت جلد بغاوت پر آمادہ ہو جاتے۔ یہ خیال عام تھا کہ سومنا تھ نا قابل شکست ہے اور جب تک وہ باقی ہے، محمود ہندوستان فتح نہیں کر سکتا۔ سومنا تھ کو سومات بھی لکھا جاتا ہے، لیکن پیشتر مؤرخین کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ سومنا تھ ہی صحیح ہے۔ یہ دو الفاظ کا مرکب ہے، سوم یعنی چاند اور نا تھ یعنی دیوتا۔

محمود غزنوی تمام حالات کا گہری نظر سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کو یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ سومات تھ کے مندر

میں مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر عالمی سازشیں ہو رہی ہیں۔ سومناٹھ پر حملے کی غرض سے محمود نے راجپوتانے کا راستہ اختیار کیا تاکہ گجرات کے راجا کو اس کی آمد کا پہلے سے علم نہ ہو سکے۔

۲۲ شعبان ۴۱۶ھ یعنی ۱۸ اکتوبر ۱۰۲۵ء کو محمود اپنے دارالحکومت غزنی سے روانہ ہوا۔ ملتان میں قیام کیا، جس کے دوران صحرائی سفر کی تیاریاں کیں۔ ہر سپاہی کو صرف پانی لے جانے کے لیے دو اونٹ دیے۔ دیگر سامان کے لیے الگ اونٹ تھے۔ اس کے علاوہ ہنگامی ضرورت کے لیے مزید بیس ہزار اونٹوں پر پانی کا ذخیرہ جمع کیا۔ فوج میں تیس ہزار باقاعدہ سپاہی موجود تھے۔ ۲۶ نومبر ۱۰۲۵ء کو محمود کی فوج نے ملتان سے کوچ کیا اور راجستھان کا صحرا عبور کر کے وہ لاروہ پہنچے جو اس زمانے میں جیسلمیر کا دارالحکومت تھا۔ لاروہ کا قلعہ فتح کر کے وہ اٹھلوارہ جا پہنچے (دریائے سرسوتی کے کنارے یہ شہر اب چین کہلاتا ہے) جہاں کا راجا بھاگ گیا۔

محمود یہاں سے مندرہ فتح کرتے دیوڑہ کے راستے ۶ جنوری ۱۰۲۶ء کو سومناٹھ پہنچ گیا، جہاں کے مضبوط مندر میں بیٹھے پجاری مسلمانوں پر ہنس رہے تھے۔ ان کا خیال تھا

کہ مسلمانوں کی موت انھیں یہاں کھینچ لائی ہے اور سومناٹھ کا دیوتان سب کو برا کر دے گا۔

محمود کی فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مندر میں موجود ہندوؤں کی فوج بڑی بہادری سے لڑی، لیکن شام کے سائے دراز ہو گئے اور جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ اسلامی فوج کی جانب سے تیروں کی زبردست بارش کے آگے ہندو سینا جم نہ سکی اور قلعے کی تفصیل سے ہٹ گئی۔ مسلمان سپاہی تفصیل پر چڑھ گئے اور ان کے دل ہلا دینے والے نعرہ ہائے تکبیر سنائی دینے لگے۔ ہندوؤں نے اپنی پوری قوت جمع کر کے حملہ کیا اور مسلمانوں کو تفصیل چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ تیسرے دن پھر مسلمانوں نے قلعے کی تفصیل پر قبضہ کر لیا اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ہندو پجاریوں کی حالت دیدنی تھی۔ اب انھوں نے طرح طرح کے شعبدے دکھا کر، کبھی لالچ، کبھی خوف دے کر محمود کو بڑے مندر پر حملہ کیے بغیر لوٹ جانے کی کوشش کی، لیکن جب وہ اپنے مندر سے سومناٹھ کے ارادے پر قائم رہا تو تشویش بڑھی۔ وہ بھاگ بھاگ کر مندر جاتے اور دیوتاؤں کے آگے گڑگڑاتے۔ پھر لوٹ کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے لگتے۔ پروہتوں نے بڑی

وش کی کہ محمود کو زیادہ سے زیادہ دولت دے کر بتانے سے باز رکھا جائے، خصوصاً اس بڑے بت کو بچا لیا جائے جس کے اندر زرو جواہر کا ایک خزانہ محفوظ تھا۔ اسی موقع محمود غزنوی نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: ”میں بت فروشوں کو بت شکن کہلانا چاہتا ہوں۔“

اس اعلان کے ساتھ محمود نے ہندوستان کے سب سے بڑے بت کو توڑ ڈالا۔ یوں اس نے بت پرستی کی شدہ پر ہونے والی تمام سیاسی فتنہ پروازیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب ملک میں کوئی ایسا باقی بت نہ رہا جس کے بل پر ہندوستان کا کوئی راجا ہندو سلطنت غزنی کے خلاف محمود کی زندگی میں کوئی سازش و شورش برپا کرنے کی ہمت کرتا۔ اس کے ٹوٹ جانے سے ہندوستان محمود کے ہاتھوں مفتوح ہو گیا۔ فتح سومناٹھ ہندوستان کی تاریخ کا وہ اہم ترین سنگ میل ہے جس نے

اسے عہد قدیم کی تاریکیوں سے نکال کر درجہ بد کی روشنی کی طرف مائل کر دیا۔

محمود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان پر حملے دولت کے لالچ میں کیے۔ لیکن یہ سراسر غلط الزام اور تہمت ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو محمود سومناٹھ کے بڑے بت کو نہ توڑتا، کیونکہ اسے بت نہ توڑنے کے بدلے میں بڑی رقم کی پیشکش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سومناٹھ فتح کرنے کے بعد محمود کھسبایت اور بیڑوچ جیسے دولت مند شہروں کی طرف بھی نہیں گیا، حالانکہ وہ چاہتا تو وہاں پہنچ کر بے تحاشا دولت اکٹھی کر سکتا تھا۔ محمود نے سومناٹھ میں رکنا تک گوارا نہیں کیا۔ وہ کچھ اور منصوبہ کے راستے ملتان پہنچا اور واپس غزنی چلے گیا۔

سومناٹھ کی فتح ایسا واقعہ تھا جس نے دنیا بھر میں دھوم مچا دی۔ خلیفہ بغداد نے محمود کو ظلم اور خطا بیجا جس میں اُسے

سومناٹھ مندر از سر نو تعمیر کے بعد



سومناٹھ مندر کے پرانے تصویر جب وہ ٹکڑا تھا

خراسان، ہندوستان، نیم روز اور خورازم کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اسے ”کھف الدولہ“ اور ”جمال الملک“ کے خطابات دیے گئے۔ اس وقت سلطنت غزنویہ بے حد وسیع اور مستحکم ہو چکی تھی۔ اس میں خراسان، طبرستان، پورابنجا، موجودہ افغانستان، اصفہان، عراق، ہمدان، مشرق میں لنگہ کا کنارہ، شمال میں دریائے آمونک اور جنوب میں بلوچستان کے ساحل تک کے علاقے شامل تھے۔

جدید بھارت مورخ، رومیلا تھاپر نے حال ہی میں سوسنا تھ کی تاریخ لکھی ہے، جس میں محمود غزنوی کے حملے کو تاریخ کے مختلف ادوار کے تناظر میں دیکھا ہے، اور یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں لوگوں کی یادداشت کیا رہی ہے۔ سوسنا تھ مندر گجرات کے صوبے میں واقع ہے۔ زمانہ قدیم میں گجرات کی اہمیت یہ تھی کہ اس کی بندر گاہیں بیرون تھی تجارت کے لیے کھلی تھیں۔ آٹھویں عیسوی میں یہاں عرب تاجرانے شروع ہو گئے تھے، سوسنا تھ کے مندر کی حیثیت اس وجہ سے زیادہ اہم تھی کہ اس کے قریب درول کی بندرگاہ واقع تھی۔ اس وجہ سے مسند اور تاجروں کا ایک تعلق تھا۔ مندر کی دولت کو تجارت میں لگایا جاتا تھا اور تاجر عقیدت کے طور پر مندر کو چڑھاوے اور نذرانے دیتے، جس کی وجہ سے مندر میں دولت اکٹھی ہو گئی تھی۔

رومیلا تھاپر نے فارسی اور عربی ماخذوں کے علاوہ انگریز مورخوں کی تالیفات سے بھی مدد لی ہے۔ انگریزوں کے وقت میں سوسنا تھ کے واقعے کو کس زاویے سے پیش کیا گیا، مصنف نے لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں گورنر جنرل ایلیں بروئے افغانستان پر حملے کے وقت یہ اعلان جاری کیا کہ برطانوی حکومت یہ تہیہ کر چکی کہ وہ سوسنا تھ کے وہ دروازے غزنی سے واپس ہندوستان لانا چاہتی ہے جو محمود حملے کے بعد اپنے ساتھ لے گیا تھا اور جو اب اس کے مقبرے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس اعلان کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو ہوا دینا تھا۔ بہر حال

دروازے واپس آئے، مگر جلد ہی یہ ثابت ہو گیا کہ یہ ہندوستانی دستکاروں کے بنائے ہوئے نہیں تھے، اس لیے انھیں آگرہ کے ایک گودام میں رکھ کر فراموش کر دیا گیا۔

اٹھارویں صدی میں یورپی مورخوں نے محمود کے حملوں کو خراسان اور وسط ایشیا کے تناظر میں دیکھا تو ہندوستان کے متعلق حملے تاریخی طور پر زیادہ اہم سمجھے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران ہندوستان میں محمود کے حملوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جنگوں کے نقطہ نظر سے دیکھا گیا۔ ایک نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ جنگیں مذہبی نہیں تھیں، بلکہ کھلے لوٹ مار، ہوس، زور اور مال غنیمت کے حصول کے لیے کی گئیں۔

۱۹۲۰ء کی دہائی میں جب ہندوستان میں ہندو مسلم فرقہ آرائی زوروں پر تھی، اس وقت مسلمانوں نے محمود کو اپنا بھائی بنایا، جبکہ ہندوؤں نے اُسے لیر اور ڈاکو قرار دیا۔ نتیجے میں ہندو قوم پرستوں نے تمام مسلمانوں کو غیر ملکی قرار دیا اور ان کے حملوں کو ہندوؤں کے لیے باعث ذلت۔ اس ماحول میں سوسنا تھ کا مندر ہندو قوم پرستوں کے لیے مذہبی علامت کے طور پر ابھرا۔ چنانچہ اسی مذہبی جذبے کے تحت ۱۹۵۱ء میں آزادی کے بعد دوبارہ تعمیر کروائی گئی تاکہ شکست کے داغ کو دور کیا جائے جو ان کی تباہی سے لگا تھا۔

سوسنا تھ کا حملہ۔ ۱۰۲۷ء

آخری حملہ سلطان محمود نے ہندوستان کے ان جاٹوں پر کیا، جنہوں نے سوسنا تھ سے واپسی میں بلاوجہ اس کی مزاحمت کی تھی۔ محمود نے اسی وقت اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کسی وقت وہ سندھ کے ان جاٹوں کا مصلح قیض ضرور کرے گا، تاکہ سندھ میں پھر کسی مخالف طاقت کے سر اٹھانے کا موقع باقی نہ رہے۔ چنانچہ ۱۰۲۷ء میں محمود ایک کثیر لشکر لے کر ملتان پہنچا اور اس نے حکم دیا کہ ایک ہزار چار سو کشتیاں اس قسم کی تیاری جائیں کہ ہر ایک کشتی میں تین تین لوہے کے بڑے برچھے ہوں۔ ہر ایک کے اگلے حصے میں ایک برچھا اور

دائیں بائیں ایک برچھا لگا یا جائے اور وہ اس قدر تیز ہوں کہ اگر سخت سے سخت چیز بھی ماری جائے تو وہ اس کو چیر دیں۔ جب وہ کشتیاں تیار ہو گئیں تو محمود نے انھیں دریائے سندھ میں ڈال کر حکم دیا کہ ہر ایک کشتی پر بیس بیس سپاہی سوار ہوں جو تیر و کمان، ڈھال اور نقطہ اندازی کے تمام سامان سے مسلح ہوں۔ اس طرح اس نے اٹھائیس ہزار فوج کو ان کشتیوں میں سوار کر دیا اور باقی فوج کو دریائے سندھ کے دونوں بازوؤں سے پیدل روانہ ہونے کا حکم دیا۔

سندھی جاٹوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے بال بچوں کو کشتیوں میں بٹھا کر کسی جزیرے میں محفوظ کر دیا اور خود چار ہزار یا آٹھ ہزار کشتیاں لے کر محمود کے مقابل ہوئے۔ جیسے ہی ان کی کشتیاں محمود کی کشتیوں کے مقابل ہوئیں تو سلطان محمود کی بحری فوج نے ان پر تیروں کی بارش شروع کر دی اور مٹی کے تیل سے ان کی کشتیوں میں آگ لگا دی۔ اس پر بھی جواگے بڑھے، ان کی کشتیوں کو تیز آہنی شاخوں نے چیر کر دریا میں غرق کر دیا۔

سندھی جاٹ بہادری کے باوجود کثرت سے مارے گئے۔ ان کی کشتیاں غرق کر دی گئیں۔ جو بھاگ کر دریائے کنارے پر اترے، محمود کی بری فوج نے ان کا صفایا کر دیا۔ محمود کی فوج ان جاٹوں سے لڑتی بھڑکتی اس جزیرے میں پہنچ گئی جہاں انھوں نے اپنے بال بچوں کو محفوظ کر رکھا تھا۔ محمود کی فوج نے حسبِ زیرے میں داخل ہو کر سندھی جاٹوں کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا۔ بہت سا مال غنیمت لے کر سلطان محمود اس جزیرے سے ملتان واپس آیا اور ۱۰۲۸ء میں غزنی واپس چلا گیا۔

محمود کی وفات

جاٹوں کی اس مہم کے دوران محمود کو ملیر یا ہو گیا، جس نے رفتہ رفتہ دق کی شکل اختیار کر لی۔ محمود نے بیماری کا مقابلہ بہادری سے کیا اور اسے شہرِ شہر میں خلل نہ آنے دیا۔ حتیٰ کہ اپنی سلطنت کا دورہ بھی ترک نہ کیا مگر اس کی صحت خراب ہوتی چلی

گئی۔ جب اسے محسوس ہوا کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا تو اس نے شاہی خزانے کے تمام ہیرے جواہرات، قیمتی اشیاء یہاں تک بے گھوڑے اور ہاتھی بھی نکلا کر رکھے۔ جب ساری اشیاء اس کے سامنے جمادی گئیں تو انھیں دیکھ کر محمود غزنوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بقول مؤرخین، شاید انھیں دیکھ کر لڑائیوں کے ہولناک منظر، زندگی اور موت کی کشمکش، عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار کے نقشے، جو اس کے ذہن پر نقش تھے، اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اس نے یہ قیمتی اشیاء کچھ تو لوگوں میں تقسیم کر وادیں اور باقی بیت المال میں جمع کر وادیں۔ اس موقع پر محمود آب دیدہ ہو گیا اور رقت کی حالت میں یہ عبرت انگیز اشعار اس کی زبان پر آ گئے:

بزار قلعه کشادم بہ یک اشارت دست
بسے مصاف شکستم بہ یک اشارت پائے
چومرگ تاختن آورد، بیچ سود نہ داشت
بقا بقائے خدا است و ملک ملک خدا ہے
(”میں نے ہاتھ کے ایک اشارے سے ہزار قلعے فتح کیے اور پاؤں کے ایک اشارے سے بہت سے محاذ جنگ جیت لیے لیکن جب موت نے مجھ پر حملہ کیا تو کچھ بھی کام نہ آیا۔ بے شک بقا صرف اللہ کی ذات کو ہے اور تمام ملک اسی کا ہے۔“)

رفتہ رفتہ مرض نے شدت اختیار کر لی۔ ایک ہفتے تک بسترِ علالت پر رہنے کے بعد اس عظیم سپہ سالار نے ۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ یعنی ۱۳۰۰ء کو اپنے رب کے بلاوے پر لیک کہا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ اسی شام کو نمازِ عشاء کے وقت اسے اپنی پندیرہ فریقہ ”غزنی“ (فسیروز یا باغ) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اس کا مزار موجودہ غزنی شہر سے دو میل شمال کی جانب ہے۔ آج کل اسے ”روضہ“ کہتے ہیں۔ اس کے فرزند سلطان مسعود نے اپنے نامور والد کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کر دیا جو جلد ہی خاص وعام کی زیارت گاہ بن گیا۔ ♦♦♦

میری نماز کا وقت ہو گیا



معمول کا مجلس کی سماعت سے ٹکرا کر اسے کوفت میں مبتلا کر گیا۔ وہ ابھی کلاس ختم کر کے اسٹاف روم میں آئی تھی۔ بریک ختم ہونے کو تھی۔ وہ چونک کر فیل ہو جانے والے طلباء کی اضافی کلاس لیا کرتی تھی اس لیے جب تک وہ اسٹاف روم میں پہنچتی، بریک کا وقت تقریباً ختم ہو چکا ہوتا۔ دس منٹ نماز کے لیے مختص تھے۔ اس سمیت زیادہ تر لوگ بیٹھے رہتے اور پھر اگلی کلاس کے دس منٹ میں نماز پڑھتے۔ مس فہیدہ یہ جملہ باقاعدگی سے ادا کرتیں۔ وہ چالیس یا پچاس سال کی غیر شادی شدہ اور نماز روزے کی پابند انتہائی امانت دار خاتون تھیں۔ کبھی اسٹاف کہیں مل کر چلا جاتا تو وہ یہی راگ الاہی رہتیں۔ عجائبات کیوں اُسے ہمیشہ گنتا جیسے وہ اپنی عبادت کی نمائش کرنا چاہتی ہوں۔ وہ کوئی بار اس سوچ پر اپنے آپ کو سرزنش بھی کرتی کہ کسی کی نیت کا حال ہم کیسے جان سکتے ہیں؟ پر نرا ہوشیطان کا جو کبھی اچھی سمت چلنے نہیں دیتا۔ آج اس کا دماغ اتنا گرم تھا کہ اس جملے پر تو جیسے پھٹ ہی پڑی۔

”مس فہیدہ اس اسکول میں کیا صرف آپ مسلمان ہیں یا صرف آپ کو ہی اپنی نماز کی فکر رہتی ہے۔ باقی بھی تو پڑھتے ہیں، لیکن آپ ہر وقت ”میری نماز کا وقت ہو گیا“ کا راگ آلا پتی رہتی ہیں۔ ایک لمحے کو ان کا چہرہ جیسے پھیکا پڑا لیکن پھر فوراً ہی انھوں نے خود پر قابو پا لیا ”آپ ٹھیک کہتی ہیں روشنائی۔ سب مجھ سے زیادہ اچھے مسلمان اور پابند صلوٰۃ ہیں۔ بس میں اپنی نماز کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آئے کہ جب کوئی دوسرا کہے

حبیبہ انجم

مس فہیدہ کی نماز کا وقت ہو گیا۔ تب میں ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں گی۔“ اپنی بات مکمل کر کے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے چلی گئیں۔

”پتہ نہیں کیا فلاں جھاڑ کر گئی ہیں۔“ روشنائی بڑبڑاتے ہوئے اپنا کچھ کرنے لگی۔ باقی سب بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

موسم بدل رہا تھا۔ سردی کا زور ٹوٹنے ہی اسکول کے اوقات کا رائج تبدیل ہو گئے۔ اب کسی کو بھی اسکول میں نماز ادا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج صبح روشنائی کو اسکول پہنچتے ہوئے دیر ہو گئی۔ اس لیے وہ اسٹاف روم جانے کے بجائے سیدھی جماعت میں چلی گئی۔ بریک ہونے پر اسٹاف روم آئی تو پتہ چلا کہ آج خلاف معمول مس فہیدہ چھٹی پر ہیں۔ ابھی وہ وجہ پوچھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ آجی نے آکر ان کے انتقال کی خبر دی اور کہا کہ پرنسپل نے چھٹی کے بعد سب کو جانے کے لیے کہا ہے۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔ خاموشی اور بوجھل دل کے ساتھ سب کلاس کی طرف چل پڑے۔ چھٹی کے بعد سب جب ان کے گھر پہنچے تو ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ مس فہیدہ کو غسل دیا جا چکا تھا۔ سفید کفن میں خاموش پرنسکون چہرہ۔ وہ کتنی دیر تک ان کے چہرے کو خاموشی سے دیکھ گئی۔

”سب آخری دیدار کر لیں۔ نماز جنازہ کا وقت ہو گیا۔“ کسی نے آواز لگائی۔

”اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جب کوئی دوسرا کہے گا مس فہیدہ کی نماز کا وقت ہو گیا اور میں ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں گی۔“ آگاہی کا درد ادا اور ساتھ ہی روشنائی کو یاد آیا

”میری نماز کا وقت ہو گیا۔“



سوال: مجھے نفسیات کے مختلف موضوعات پر آپ کے مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مسئلہ سمجھ کر کوئی مفید مشورہ دے سکیں گے۔ میں سوچتی ہوں کہ اپنی کہانی کا آغاز کہاں سے کروں کیونکہ میری زندگی کا المیہ پوری پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ میرے والد اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ دادا کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے بہن بھائیوں کو بالائے سب اُن کا احترام کرتے اور گھر میں اُن کا حکم والد کی طرح ہی چلتا تھا۔ میرے چھوٹے چچا اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اولاد کی کمی کی وجہ سے بہت دلگرفتہ اور اُداس رہتے تھے۔ جب میں نے پانچ بہن بھائیوں کے بعد دنیا میں

لے پالک بچوں کا المیہ گود لینا بچوں کا کھیل نہیں

بعض اوقات اولاد ہی نہیں والدین کو بھی شدید ذہنی تنہاؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے

آنکھ کھولی تو والد صاحب نے فوراً چچا کی ٹھوکی کا زلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میری حقیقی والدہ اور میری چچی دونوں اس فیصلے کے حق میں نہیں تھیں۔ چچی کا ارادہ تھا کہ اگر گود لینا ہی ہے تو کسی یتیم بچے کو لیا جائے۔ ان کا کمزور احتجاج کسی نے نہ سنا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو چچا کے گھر میں اُن کی بیٹی کی حیثیت سے پرورش پا رہی تھی۔

بچپن کے چند برس پر مشتمل میری زندگی کا سنہرا دور تھا۔ میں چچا چچی کو ابوائی کہتی اور حقیقی ماں باپ ہی سمجھتی۔ چچا مجھے دل و جان سے چاہتے اور میری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ چچی نے بھی یہ فیصلہ ناچار قبول کر لیا۔ اُن کا عمومی رویہ خاصا مناسب تھا۔

چچا ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے اور ان کی پوسٹنگ دور دراز علاقوں میں رہی۔ قریبی رشتہ داروں سے ملنے کا اتفاق سال میں ایک دو دفعہ عیدوں اور تقریبات پر ہی ہوتا۔ بارہ برس کی عمر تک میں چچا چچی کوئی اپنے حقیقی والدین سمجھتی رہی۔ پھر ایک روز یہ انکشاف میرے سر پر کسی ایٹم بم کی مانند گر کر میرے حقیقی والدین کون ہیں؟ مجھے سے تین چار برس بڑی ایک کزن سے میری ہر وقت مخفی رہتی تھی۔ مجھے یہ لگتا تھا کہ وہ مجھ سے اس لیے حسد کرتی ہے کیونکہ میں والدین کی اکلوتی اولاد اور ان کی آنکھ کا تارا ہوں۔ ایک روز اس کے سامنے جب میں سے بچکانہ انداز میں شچی ماری کہ والدین میری کوئی فرمائش نہیں ماننے تو اس نے یہ کہہ کر میرے ہوش اڑا دیے کہ تمہارے اصل والدین تو وہ ہیں جنہیں تم بتایا تو اور تائی اماں کہتی ہو۔

شروع میں، میں نے اس کی بات کو جھوٹ سمجھا حتیٰ کہ جب میرے بار بار اصرار پر چچی نے اس بات کی تصدیق کر دی، تب بھی مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اصل مسئلہ تب شروع ہوا جب اگلے چند برس میں مجھ پر بھڑانے پر چچا کے ہاں کیے بعد دیگرے بیٹا اور بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ بس اس کے بعد گھر کے حالات بدل گئے۔ چچی کا رویہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ تلخ اور توہین آمیز ہوتا گیا۔ چچا یہ سب دیکھ کر کڑھتے لیکن اپنی نرم طبیعت کے باعث گھر کے ماحول پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔

چچی نے پھر مجھے اپنے حقیقی والدین کے ہاں بھجوانے کے لیے چچا پر باؤ ڈالا۔ آخر چچا بھی مجبور ہو گئے۔ انھوں نے پہلے مجھ سے اور پھر اپنا سے بات کی۔ سو ادھر مسین نے گر بجاویشن مکمل کی، ادھر میں کسی کٹی پٹنگ کی طرح اپنے حقیقی والدین کے گھر واپس آ گئی۔

جب سے مجھ پر اپنے حقیقی والدین کا انکشاف ہوا تھا میرے اندر ہر وقت کلک اور ایک خلش کی لہریں چلتی رہتی۔ کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا کہ شاید اپنے خونی رشتوں میں اگر میرے اندر کا خلا بھر جائے اور میری بے قرار روح کو سکون آ جائے۔ البتہ یہاں

آنے کے بعد مجھ لگتا ہے کہ یہ میری خام خیالی تھی۔

آپ یقین کیجیے مجھے اپنے حقیقی والدین کے گھر مسین اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ والدین کا مجھ سے اور دوسرے بچوں سے لگاؤ میں واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ میری دلجوئی کریں لیکن مجھے ان کی یہ کوششیں مصنوعی لگتی ہیں۔ میں اکثر اپنی والدہ سے جھگڑتی ہوں کہ انھوں نے مجھے دوسروں کے سپرد کیوں کیا؟ وہ اپنی بے چارگی کا اظہار کر رہی ہیں۔

مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میری شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور یہ دونوں حصے ہی مجھے اجنبی لگتے ہیں۔ کبھی ایسا لگتا ہے، جیسے پوری دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں۔ رشتوں پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ جنہوں نے مجھے پالا، انھوں نے مجھے چھوڑ دیا اور جنہوں نے جنم دیا، وہ پوری طرح قبول نہیں کر پار ہے۔

ڈاکٹر صاحب، کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مجھے کب اور کیسے سکون ملے گا؟

خالہ جمیل
جواب: خالہ بی بی، آپ کا طویل خط میں عنین اس لیے شائع کیا گیا تا کہ تمام قارئین یہ اندازہ کر سکیں کہ بعض دفعہ خاندان کے بزرگ حضرات مناسب سوچ بچپا اور مشورے کے بغیر جو فیصلے کر لیتے ہیں، ان کی وجہ سے کس قدر تکلیف دہ نتائج جنم لے سکتے ہیں۔

بظاہر ایسے حالات میں بزرگوں کی طرف سے یہ جواز سننے کو ملتا ہے کہ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے فطرت کا اچھا ہونا کافی نہیں، ضروری تحقیق، سوچ، بچپا اور مشورہ لینا بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ضروری تحقیق و تفتیش کے بغیر کیا فیصلہ اچھی نیت کے باوجود غلط ثابت ہو سکتا ہے۔

آپ نے بڑی ہمت کی کہ اپنے خیالات و احساسات

ظہر عام پر لائیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ کام کرنے سے پہلے آپ کو اپنے آپ سے جنگ لڑنا پڑی ہوگی۔ ممکن ہے آپ کی اس کوشش سے شاید چند لوگوں کی زندگی المیہ بننے سے بچ جائے۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند باتیں قارئین کے گوش گزار کرنا چاہوں گا۔

۱۔ بچہ گو دلینا بظاہر اچھا عمل ہے اور اس سے کسی انسان کے احساس محرومی کی تفتیش ہو سکتی ہے لیکن پہلے اس کے نتائج و لواحق ضرور مد نظر رکھنے چاہئیں۔

۲۔ ایسا فیصلہ کرنے والے دونوں میاں بیوی کا اس فیصلے

بچے کو اپنے حقیقی ماں باپ میں بھی قدرتی کشش محسوس ہو سکتی ہے جبکہ جن لوگوں نے اس کی پرورش کی ہو ان سے بھی لگاؤ ہو سکتا ہے۔ سو اس صورت حال میں بچے میں تقسیم شدہ شخصیت (Split personality) یا متضاد جہانات پر مبنی اچھی شخصیت (Complexed personality) پیدا ہونے کے قوی امکانات ہیں جو ساری عمر کے لیے روگ بن سکتے ہیں۔

۳۔ نفسیاتی تحقیقات میں دیکھا گیا ہے کہ بچہ گو دلینے کے عمل کو اختیار رکھنے کی کوشش کرنا اور تمام عمر یہ ثابت کرتے رہنا کہ ”بچہ ہمارا ہے“ مختلف نفسیاتی پیچیدگیاں پروان چڑھا سکتا



پر دل سے مطمئن ہونا ضروری ہے۔ مجبوری کے عالم میں کیا گیا فیصلہ بعد میں نپھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

۳۔ ایسا بچہ گو دلینا جس کے والدین نہ صرف حیات بلکہ صاحب استطاعت بھی ہوں اور اس پاس بھی زندگی گزار رہے ہوں، بچے کی زندگی پر گہرے منفی اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

ہے۔ اگر صورت حال کو واضح اور صاف انداز میں قبول کیا جائے تو اس سے بچے کے اپنے سوتیلے والدین (Adoptive parents) اور دوسرے لوگوں سے تعلقات میں ابہام (Confusion) پیدا نہیں ہوتا۔ بچے کو واضح انداز میں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے حقیقی والدین کون تھے یا ہیں۔ اس نکتے

کو محبت آمیز انداز میں آجا کر کیا جائے۔ اس نکتے کو کسی دانائے بہت خوبصورت انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ

“Family Is Made By Love.... Not DNA”

۵۔ بچہ گود لینے کو چند والدین اس لیے بھی چھپا رہے کھتے ہیں کیونکہ انہیں یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر بچے کو حقیقت معلوم ہوگی تو وہ انہیں چھوڑ کر اپنے حیاتیاتی والدین (Biological Parents) کے پاس چلا جائے گا۔ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ خوف بے بنیاد ہے کیونکہ بچوں میں اپنے حیاتیاتی والدین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے یا انہیں ملنے کا جیس تو ضرور ہوتا ہے لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ بالغ ہونے پر وہ ان کے پاس مستقل رہنے کو ترجیح دیں۔

۶۔ گود لیے گئے بچے کا اپنے حیاتیاتی والدین کے بارے میں جیس ہونا فطری عمل ہے۔ بسا اوقات اس فطری جیس کے نتیجے میں پوچھے گئے سوالات پر والدین غلط فہمی کا شکار ہو کر اسے ناشکر گزاری پر مبنی ردیہ سمجھ سکتے ہیں۔ اگر والدین فطری رد عمل کا شکار ہو جائیں تو وہ بچے سے ایسی ناگوار باتیں کر سکتے ہیں جیسے ”تمہیں ان کو یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ تمہاری پرورش اس سے بہت بہتر انداز میں ہو رہی ہے جیسی وہ تمہاری کر سکتے تھے۔“

اگر اس کے برعکس والدین اس موضوع سے گریز کرنے کے بجائے خود اُسے ضروری معلومات فراہم کر دیں (جو ان کے علم میں ہوں) یا اگر بچہ اپنے حیاتیاتی والدین کو ڈھونڈنے یا ملنے کی خواہش کا اظہار کرے تو خود اُس کی حوصلہ مند سازی کریں۔ بچہ کچھ عرصے کی تلاش و جیس کے بعد اس مرحلے سے خود بخود دبی باہر نکل آتا ہے۔

خالہ دی بی بی، آپ سمجھتی ہوں گی کہ ایسے حالات میں انسان کی طبیعت میں کس طرح کے منفی رجحانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ شخصیت کی ان پیچیدگیوں کو حل کرنے کی کوشش کرنا بلاشبہ طویل عمل ہے لیکن ان رجحانات کو درست طریقے سے پہچان لینا بھی حل کی طرف ایک مثبت اور بڑا قدم ہے۔ اس

حوالے سے درج ذیل نکات ذہن نشین کر لیجیے۔

(الف) آپ کی کہانی سے عیاں ہے کہ آپ پیشتر وقت شدید احساس محرومی میں مبتلا رہی ہیں۔ اس وجہ سے آپ نے اندر خود تری (Self Pity) کا جذبہ جڑ پکڑ چکا۔ یہی وہ منفی جذبہ ہے جو آپ کی شخصیت اور صلاحیتوں کو گھٹن کی طرح کھرا رہا ہے۔ ایک صحت مند زندگی گزارنے کے لیے سب سے پہلے آپ کو زندگی کے بارے میں اپنا زاویہ نظر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

(ب) بہترین لائحہ عمل یہ ہے کہ آئندہ زندگی میں ہمدردی اور توجہ حاصل کرنے کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں۔ اپنے آپ کو دوسروں کی ذہنی اور جسمانی محتاجی سے نکالیں۔ مسلسل شکوہ و شکایت کرتے رہنے سے شاید انسان کو کچھ ہمدردی اور توجہ مل جائے مگر اس سے تسلی و تسکین ملتی ہے اور نہ ہی شخصیت کا خلا پُر ہوتا ہے۔

(ج) حد سے زیادہ توجہ کی خواہش بھارڈ ہمن کی علامت ہے۔ آپ خود کو مظلومیت اور خود تری کی منفی لذت سے نکال کر اپنی زندگی کے لیے کوئی مثبت لائحہ عمل تیار کیجیے۔

(د) آپ ہر وقت سوچتی رہتی ہیں کہ دوسروں نے آپ کے لیے کیا کیا۔ اس سوچ سے نکل کر اپنے آپ سے پوچھیے کہ آپ خود زندگی میں اپنے لیے کیا کرنا چاہتی ہیں۔ گزریے وقت کا ماتم کرنے کے بجائے سوچیں کہ آپ آنے والے وقت سے کیا خوشیاں اور کامیابیاں کشید کر سکتی ہیں۔

(ه) آپ جن حالات سے گزاری ہیں ان میں طبیعت میں مختلف طرح کے منفی جذبات مثلاً درد کیے جانے کا احساس، احساس کمتری، احساس محرومی، غم و غصہ وغیرہ پیدا ہونے کا قوی امکان ہوتا ہے۔ یہ سب منفی جذبات آپ کی زندگی کے راستے کی اصل رکاوٹ ہیں۔ ان سے نجات کے لیے اپنا ارادہ مضبوط کرنا چاہیے۔

(و) درج بالا مقاصد حاصل کرنے کے لیے آپ کسی

کے دوران پورے جسم کو جھٹکتے لگتے ہیں جو اکثر ۱۰ سے ۱۵ منٹ تک جاری رہتے ہیں۔ اس دوران اُس کی سانس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکلتی ہیں، لیکن پوچھنے پر کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ کبھی کبھی تو یہ اتنے شدید ہوتے ہیں کہ اُس کا جسم چار پائی پر دو فٹ تک اچھلتا ہے اور تین چار لوگ بھی بمشکل اُسے کنٹرول کر پاتے ہیں۔ میرے گھر والوں کا خیال ہے کہ بہن پر جنات و اشرا کا



اثر ہے۔ ملنے ملانے والے بھی مختلف عاملوں اور بیرونی کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ گھر والے لچند عاملوں کے پاس لے کر بھی گئے، جنہوں نے کافی خرچ کروانے کے بعد درودوں کو شیاطین کی کارستانی ہی قرار دیا۔ ان کے عمل کے بعد اگر وہی طور پر دورے کریں بھی تو چند دن بعد پھر شروع ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب، میں نے بی اے میں نفسیات کا مضمون پڑھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے دوروں کی نوعیت ذہنی دباؤ

کا ٹیکنیکل سائیکالوجسٹ سے سائیکوتھراپی کے سیشنز دوائے۔ اس طریقہ علاج میں بات چیت کے ذریعے ماہان کی شخصیت کے منفی اور اُلجھے پہلوؤں کا تعین کیا جاتا اور ان کے ذہنی و جسمانی ورزیشن سے ان کے اثرات کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ علاج اگرچہ طویل بھی ہو سکتا ہے مگر اس میں چند ماہ سے لے کر ایک دو برس کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ ان آپ ماضی کے غم بار سے چھٹکارا پا کر اپنی زندگی کو نئی

بنیادوں پر شروع کرنے کے قابل ہو سکیں گی۔ سوال: ڈاکٹر صاحب، میں پنجاب کے ایک پسماندہ دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اپنے خاندان میں پہلا فرد ہوں جس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ ہمارے علاقے میں قابل ماہرین نفسیات کی شدید کمی ہے۔ اس لیے اپنی بہن کا مسئلہ ای میل کے ذریعے آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ میری بہن کی عمر ۲۸ سال ہے۔ اُسے گزشتہ دو برس سے دن رات فوٹا بے ہوشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ بے ہوشی

اثر ہے۔ ملنے ملانے والے بھی مختلف عاملوں اور بیرونی کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ گھر والے لچند عاملوں کے پاس لے کر بھی گئے، جنہوں نے کافی خرچ کروانے کے بعد درودوں کو شیاطین کی کارستانی ہی قرار دیا۔ ان کے عمل کے بعد اگر وہی طور پر دورے کریں بھی تو چند دن بعد پھر شروع ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب، میں نے بی اے میں نفسیات کا مضمون پڑھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے دوروں کی نوعیت ذہنی دباؤ

سے متعلق ہے۔ اصل میں دو برس قبل میرے والدین نے بہن کا رشتہ اُس سے چودہ برس چھوٹے ایک کزن سے ٹھہرا دیا۔ بہن نے اس رشتے پر ظاہری طور پر تو کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا، البتہ میرا اندازہ یہی ہے کہ وہ اس رشتے کی وجہ سے ناخوش ہے۔ آپ ہماری راہنمائی کیجیے کہ کیا میرا اندازہ درست ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہمیں اُس کے علاج کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

محمد عبدالسلام
جواب: آپ نے اپنی بہن کے دوروں کی جو تفصیلات لکھی ہیں وہ نفسیاتی دورے (Psychogenic fits) کی طرف ہی اشارہ کرتی ہیں۔ ان دوروں کو کسی زمانے میں ہسٹیریا (Hysteria) کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ موجودہ نفسیاتی سائنس میں اس کا نام ”اضطراب تعارفی“ (Dissociative disorder) ہے۔ ان دوروں کا علاج کیسے کیا جائے؟ اس پر بات کرنے سے پہلے ان کی وجوہ وضاحت سے سمجھ لیجیے۔

(۱) نفسیاتی دورے مرگی (Epileps) کے دوروں سے الگ بیماری ہے۔ مرگی کے دورے کے دوران مریض مکمل طور پر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا اور اُس پاس کی آوازیں سننے اور ان پر ردِ عمل دینے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کے برعکس نفسیاتی دوروں میں مریض گہری بے ہوشی میں نہیں جاتا اور آوازیں بھی سن سکتا ہے۔

(۲) نفسیاتی دوروں کا علاج عام طور پر مرگی کی نسبت آسان اور مختصر ہے۔ اگر درست طریقے سے علاج کیا جائے تو چند ہفتوں میں ہی مکمل صحت یابی کا امکان ہوتا ہے۔ البتہ اگر علاج معاملے میں غلط طریقے استعمال کیے جائیں تو مرض طوالت کا شکار ہو سکتا ہے۔

(۳) نفسیاتی دوروں کو بیماری سمجھنے کے بجائے جنات و اشراک کا اثر سمجھنا عامے معاشرے کا جالنا تو ہم ہے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ آخر جنات و شیاطین کا اثر فقط مکمل تعلیم یافتہ اور غریب طبقوں پر ہی کیوں ہوتا ہے؟ معاشرے کے اعلیٰ

محاصرہ

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اُس کے فصیل شہر کے ہر برج، ہر منارے پر کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش وجود خاک میں آتش فشاں چھاتی تھی بچھا دیا گیا بارود اس کے پانی میں وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی

سبھی دریدہ وہن اب بدن دریدہ ہوئے سپرد دار و رن سارے سرکشیدہ ہوئے تمام صوفی و سالک، سبھی شیوخ و امام امید لطف پہ ایوان کج کلاہ میں ہیں

معززین عدالت حلف اٹھانے کو مثال سائل مہرم نشستہ راہ میں ہیں اسی لیے تو جو لکھا تپاک جاں سے لکھا جھپی تو لوج کماں کا، زباں تیر کی ہے

میں کٹ گروں یا سلامت رہوں، نہیں ہے مجھے کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا تمام عمر کی ایذا نصیبوں کی قسم مرے قلم کا سفر رائگاں نہ جائے گا

احمد فراز

ہم یافتہ طبقات اس اثر سے محفوظ کیوں رہتے ہیں؟

(۴) ماضی میں چھوٹ کی بیماریوں (Communicable Disease) مثلاً طاعون، چچک، سب دن وغیرہ کی وجوہ معلوم ہیں نہیں، لہذا انھیں بھی بدردھوں اور شیطان کے اثرات کا نتیجہ سمجھا گیا۔ البتہ جب جراثیم دریافت ہوئے تو تصور یکسر بدل گیا۔ آج ایک عام دیہاتی بھی ٹی بی کو بدردھوں کی کارستانی کے لئے بیماری ہی سمجھتا ہے۔

(۵) نفسیاتی دورے جنم لینے کا بنیادی سبب حد سے زیادہ ذہنی دباؤ ہے۔ ذہنی دباؤ جب انسان کی قوتِ داہشت سے بڑھ جائے اور وہ اپنے اظہار کے لیے کوئی مناسب راستہ نہیں پائے تو مختلف جسمانی علامتوں کے ذریعے اپنے اظہار کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔

(۶) اپنے خیالات و جذبات کا مناسب اظہار نہ کر پانا اور رے دہی اور کم تعلیم یافتہ علاقوں کے رہائشی افراد میں نمایاں ہے، خصوصاً خواتین کے طبقے میں۔ اس لیے نفسیاتی دوروں کی بیماری معاشرے کے اس طبقے میں نظر آتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں یہ بیماری خال خال ہی نظر آئے گی اور وہ بھی فقط کچھ مخصوص حالات کے زیر اثر۔

(۷) نفسیاتی دباؤ مختلف جسمانی علامتوں کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے، مثلاً جسم کا ایک حصہ چانک مفلوج ہو جانا، مریض کی جینائی یا خسِ سماعت کا چانک ہو جانا، بے ہوشی کے دورے، کم و بیش دھچکنے لگانا، عرصہ یا قوتِ گویائی متاثر ہونا وغیرہ۔

(۸) نفسیاتی علامات کے بارے میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ انھیں مریض خود اپنے ارادے سے پیدا نہیں کرتا بلکہ بالاشعور کی سطح پر خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ایسے مریض کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو بیمار کے طور پر پیش کر رہا ہے، لاعلمی پر مبنی ردِ یہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس بیماری کی نوعیت کافی حد تک سمجھ گئے ہوں گے۔ اب ایسے چند اقدامات ہیں جن سے اس

بیماری کے علاج میں مدد ملے گی۔

۱۔ دورے کے دوران مریض کے گرد زیادہ لوگوں کا مجمع نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے نفسیاتی دوروں کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مریض کے گرد فقط ایک یا دو لوگوں کا بیٹھنا کافی ہے۔

۲۔ دورے کے دوران مریض کو جوتا نگھانا، ناک دبانے یا منہ میں پانی، دودھ، شہد وغیرہ ڈالنا مضر اثرات پیدا کر سکتا ہے اور اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

۳۔ نفسیاتی دورے کا دورانیہ عام طور پر چند منٹ سے چند گھنٹوں تک بھی ہو سکتا ہے۔ اس دوران مریض کو بار بار ایمر جنسی لے جانا یا ڈاکٹروں کے پاس لے جا کر انجکشن یا ڈرپ وغیرہ لگوانے یا فائدہ عمل ہے۔ اس سے اس مرض کے علاج میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ دورہ اپنا دورا نشیب پورا کر کے خود بخود ختم ہو جاتا ہے، اس لیے اس دوران بے فائدہ بھاگ دوڑ کے بجائے دورہ ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔

۴۔ آپ نے جس خاندانی مسئلے کا ذکر کیا ہے، اُس حوالے سے مریض کو اعتماد میں لے کر علیحدہ گفتگو کیجیے اور اُس کے خدشات پر تفصیلاً بات کیجیے۔ اگر اس عمل سے ظاہر کوئی حل نہ بھی نکلے تو اُس کے ذہنی دباؤ میں کمی آسکتی ہے۔ اُس کے لیے یہ احساس ہی کافی تسلی بخش ہو سکتا ہے کہ گھر کے کسی فرد کو اس کی پرادہ ہے۔ اس سے بیماری میں بہتری کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

۵۔ آپ نے امی میل میں ذکر کیا کہ دورے دو برس سے جاری ہیں۔ کئی مدت کے دوروں کی وجوہ میں ذہنی دباؤ کے علاوہ ڈپریشن کی بیماری کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا علاج بھی ضروری ہے۔

۶۔ اگر مریض کے دوروں یا ڈپریشن میں کوئی افادہ نہ ہو تو بہتر ہے کہ اُسے کسی بڑے شہر کے اسپتال میں، جہاں نفسیاتی شعبے کی سہولت موجود ہو، چند دن کے لیے داخل کروا دیں تاکہ مکمل نفسیاتی علاج ہو سکے۔ ♦♦♦

حکیم سید مجاہد محمود برکاتی

سفید زیرے میں دو سے چار فیصد تک ہلکے سبز اور زرد رنگ کا خوشبودار اڑنے والا تیل پایا جاتا ہے۔ اسی لیے سفید زیرے میں خاص ذائقہ اور خوشبو ہوتی ہے۔ اس تیل میں ۵۰

”ای“ آج کیا پکایا ہے؟“ فرہاد نے کالج سے آتے ہی بانک لگائی۔

”آج زیرے والے آلو پکائے ہیں۔“ اُٹی نے بتایا، تو فرہاد کے منہ میں پانی بھرا آیا۔ اس نے فوراً ہاتھ دھوئے اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ اُسے زیرے والے آلو بہت پسند تھے، خاص طور پر جب وہ مسالے دار بھی ہوں۔

زیرہ خوشبودار لکھ کے

علاوہ بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ زیرہ سفید و سیاہ سونف کے مشابہ بیج ہیں لیکن اس سے قدرے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ جہاں کھانا پکانے میں بکثرت استعمال کیا جاتا ہے وہاں اس کے دیگر فائدے بھی بے شمار ہیں۔ یہ خوشبودار مسالا اپنی ادویاتی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔

سفید زیرے کا پودا تقریباً ۳۰ سینٹی میٹر بلند ہوتا ہے۔ پتوں کا رنگ نیلگوں ہوتا ہے۔ شاخیں بے شمار ہوتی ہیں جن میں سفید یا لکڑی پھول چھتر بناتے نظر آتے ہیں۔ زیرہ سیاہ کا پودا ایک

سے تین میٹر تک بلند ہوتا ہے۔ جز

موٹی ہوتی اور سفید رنگ کے پھول آتے

ہیں۔ دونوں زیروں کا جب کیسیاوی جائزہ لیا گیا تو ان میں ضروری روغنیات پائے گئے جن پر ان کی خوشبو کا انحصار ہوتا ہے۔

وزن گھٹانے کی قدرتی دوا

انسان کو تندرست رکھنے والے ہر فن مولا کا مفید تذکرہ



لیسڈ کیویمک ایلڈی ہائیڈ (Cumic Hldehyde) ہوتا ہے، یہ دوسرے کیسیائی عناصر ہوتے ہیں۔ اس تیل کو مصنوعی طور پر تھائی مل (Thympl) یعنی اجوائن کے سمت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جو جراثیم کش اور کیڑے مار شے ہے۔ سفید زیرے میں ۱۰ فیصد تک اڑنے والا تیل اور ۶.۷ فیصد ہینڈو سان نامی مادہ پایا جاتا ہے۔ علاوہ ان میں سفید زیرے میں تقریباً ۱۲ فیصد رطوبت، ۶.۵ فیصد کاربوہائیڈریٹ، ۱۸ فیصد پروٹین، ۱۲ فیصد ریشہ اور ۳.۸ فیصد معدنیاتی مادہ ہوتا ہے۔ معدنیاتی عناصر میں خاص طور پر کیشیم، فاسفورس اور فولاد اہم ہے۔ ان کے علاوہ وٹامن اے اور سی ہوتے ہیں۔

زیرے میں اینٹی آکسیڈینٹ پائے جاتے ہیں۔ یہ مادہ جسم میں لیسٹروئل کم کرنے میں مددگار ہے۔ زیرے کا استعمال کینسر بھی بہت فائدہ مند ہے۔ اس کے علاوہ فیولاد کی کمی دور کر کے انسانی مدافعتی نظام مضبوط بناتا ہے۔

زیرے میں فیولاد کی اچھی خاصی مقدار پائی جاتی ہے، اس لیے یہ نظام ہاضمہ بہتر بناتا، مدافعتی نظام کی قوت بڑھاتا اور شمسی شعاع ریزی کے مضر اثرات دور کرتا ہے۔ سفید زیرے میں تانبا، کیشیم، پوٹاشیم، میگنیشیم، زنک، سیلیسیم پائے جاتے ہیں۔ تانبا خون میں سرخ خلیات بنانے میں مدد دیتا ہے۔

اس کے علاوہ زیرے میں وٹامن بی کا پیلیکس کی بھی اچھی مقدار پائی جاتی ہے جیسے کہ (Thiamin)۔ وٹامن بی ۱۲ (Niacin) اور دوسرے اینٹی آکسیڈینٹس وٹامن جیسے وٹامن سی، اے، ایف بھی موجود ہوتے ہیں۔ کالا زیرہ میں ۱۰۰ قسم کے کیمیکل کمپائونڈ ملتے ہیں جن میں وٹامن، پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، معدنیات اور فٹیش ایسڈ شامل ہیں۔

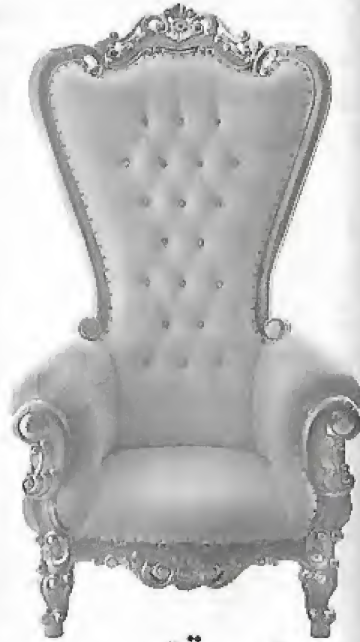
آپ چاہیں تو زیرے کو مختلف طریقوں سے استعمال کر سکتے ہیں جیسے دی میں ڈال کر یا سبزیوں کے اوپر چھڑک کر! چاہیں تو کھانا بناتے ہوئے زیرے کا دافر استعمال کر سکتے ہیں۔ چاولوں میں زیرہ ڈال کر کھایا جائے تو کھانے کا ذائقہ لا جواب ہو جاتا ہے۔

ایک ایرانی یونیورسٹی میں کی گئی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ زیرہ جسم کی چربی پھیلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تحقیق میں زائد وزن والی ۸۸ خواتین کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک گروہ کو تین گرام زیرہ (تقریباً ایک چمچی) ملا کر دی میں دی گئی جبکہ دوسرے گروہ کو صرف دی کھانے کا کھا گیا۔ دونوں گروہ کو خواتین نے ایک دن میں ۵۰۰ حرارے کھائے۔ تین مہینے بعد تحقیق کا یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جو تین خواتین زیرہ کھاری تھیں، انھوں نے تین پاؤنڈ وزن کم کیا جبکہ دوسرے گروہ کا وزن زیادہ کم نہ ہوا۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ زیرہ کھانے والی خواتین نے نہ کھانے والوں کی نسبت تین گنا زیادہ وزن کم کیا۔ یہ بات بھی دیکھنے کو ملی کہ زیرہ کھانے والی خواتین میں کولیسٹرول کی مقدار بھی کافی کم ہو چکی تھی اور ان کا باڈی ماس انڈیکس (BMI) بھی کم تھا۔

زیرہ چہرے پر پڑنے والی بھیریاں اور لکیریں بھی کم کرتا ہے، کیونکہ اس میں وٹامن ای پایا جاتا ہے جو صحت مند جلد کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ زیرے میں اینٹی آکسیڈینٹ اور اینٹی بیکٹیریل صلاحیت پائی جاتی ہے جس سے جلد خوبصورت، تازہ اور جوان نظر آتی ہے۔

ہضمیہ اور پاؤں کے تلوے میں ہونے والی جلن کے خاتمے کی خاطر ایک چمچی زیرہ چار لیٹر پانی میں ابال لیں اور ٹھنڈا کر کے پیئیں۔ کھانے کے بعد اگر آپ کو بہت زیادہ پیاس محسوس ہو رہی ہے تو تب بھی زیرے سے ملے پانی کا استعمال کیجیے۔ چہرے کی جلد چمکدار اور خوبصورت بنانے کے لیے زیرے کا فیس ماسک بنائیے۔ ہلدی ایک چمچی اور زیرہ پاؤڈر تین چمچے شہد اور پانی کے ساتھ ملا کر پیسٹ بنالیں۔ خشک ہونے تک چہرے پر لگا رہنے دیں اور پھر دھو لیں۔ اس ماسک سے آپ کی جلد ہموار اور چمکدار ہو جائے گی۔ اگر سن برن یا ایکٹی کی شکایت ہے تو خالص دی زیرہ پاؤڈر میں ملا کر چہرے پر لگائیں۔ خشک ہونے کے بعد دھو لیں۔ دھونے کے بعد چہرے پر موشچر ایئر کا استعمال کریں۔

اللہ کے بعد اس سے ڈریئے!



جولوگ اسے تعظیم نہ دیں،
یہ اُن سے خوفناک انتقام لیتی ہے

ہے۔ سیاسی لیڈر کے ذہن میں وہ کرسی آتی ہے جس پر صرف ایک بار بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ افسر کے ذہن میں جو کرسی آئے وہ انتہائی آرام دہ، قیمتی اور گھومنے والی ہوتی ہے۔ یعنی جب افسر گھومتا ہے تو ساتھ کرسی بھی گھومتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جدھر افسر کا رخ ہو، اُدھر ہی کرسی کا رخ ہو جاتا ہے۔ کلرک کے ذہن میں اگرچہ معمولی سی لکڑی کی کرسی آئے گی لیکن کارکردگی، طاقت اور دب دے کے اعتبار سے وہ افسروں کی کرسی پر بھی بھاری ہوتی ہے۔ کلرک کی کرسی اگرچہ خود نہیں گھومتی لیکن زمانے بھر کو گھما سکتی ہے۔ وہ کام جو افسروں کی کرسی کے بس میں نہیں ہوتے، کلرک کی کرسی کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتے ہیں۔

اسکول اور کالج کے اساتذہ کے ذہن میں اولاً تو کرسی کا لفظ من کر کوئی خاص تصور نہیں آتا۔ یہ لفظ ان کے سامنے دو چار بار دہرایا جائے تو ایک قسم کی کرسی ان کے ذہن میں آتی ہے۔ اس کی تین یا ساڑھے تین ٹانگیں ہوتی ہیں اور جو کبھی کبھار بی دکھائی دیتی ہیں۔ اس پر بیٹھنے کے لیے استاد کو نیچے اٹھنیں، ڈکشنری یا انسائیکلو پیڈیا قسم کی کوئی چیز رکھنی پڑتی ہے یا پھر یوں بیٹھنا پڑتا ہے کہ جسم کا بوجھ ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر نہ پڑے۔ اگر خدا خواستہ استاد نے بے خبری میں کرسی کی ٹوٹی ٹانگ پر بوجھ ڈال دیا تو استاد کی اپنی ٹانگ کے ٹوٹنے کے امکانات روشن ہو گئے۔

دندان ساز کے ذہن میں اس کرسی کا تصور ہے جس پر بٹھا کر وہ بڑے بڑے بڑوں کے دانت نکال دیتا ہے۔ جو شخص اس کرسی پر بیٹھ کر ایک بار دندان لگنی کروائے، وہ عمر بھر اس کرسی سے خائف رہتا ہے۔ قیمت کے اعتبار سے دندان

کرسی کا لفظ کان میں پڑتے ہی بے شمار اقسام کی کرسیاں ذہن میں آتی ہیں لیکن فوری طور پر ذہن میں وہی آتی ہے جس سے اس کا قریبی واسطہ ہے۔ مثال کے طور پر نانے کے ذہن میں وہ کرسی آتی ہے جس پر بیٹھ کر وہ لوگوں کی حجامت بناتا

نزلہ، زکام دور کرنے میں بھی زیرہ سے مدد ملی چاسکتی ہے۔ گلے کی خراش سے خجرات کے لیے زیرہ سے کی چائے میں برائے نام سوٹھ شامل کر کے استعمال کیجیے۔ زیرہ سے جراثیم کش خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ سیاہ زیرہ پیس کر اس کا لیپ، زخم اور پھوڑوں پر لگانے سے مرہم جیسے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بیماری نہ ہو تو بھی زیرہ کا عرق جسمانی طاقت کی بحالی میں ٹانگ کا کردار ادا کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زیرہ کے استعمال سے جسم کی گرمی بڑھتی ہے، جس سے جسم میں غذا کے انجذاب کا عمل بہتر ہوتا ہے۔ اس جڑی بوٹی سے گردے اور نگر کے افعال بہتر ہوتے ہیں اور بیماری کے خلاف جسم کی مدافعتی قوت بڑھ جاتی ہے۔ سیاہ زیرہ کے بارے میں اطبا کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس سے دسے اور جوڑوں کے درد کا علاج بھی ممکن ہے۔ زیرہ کے دانوں پر تحقیق سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ اس میں دافع سرطان کی خوبیاں پائی جاتی ہیں جس سے معدے اور جگر میں رسولی بننے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

زیرہ، سونف، دھنیا، تینوں کا ایک ایک چمچ بھر لیں اور ان کو ایک گلاس پانی میں ابالیں۔ آدھا پانی رہنے پر چھان کر ایک چمچ دسی گھی ملا کر صبح و شام پینے سے بواسیر سے خون گرنابند ہو جاتا ہے۔ یہ حاملہ عورتوں کی بواسیر میں زیادہ مفید ہے۔

زیرہ اور مصری ہم وزن پیس کر ایک چمچ وزن میں تین بار ٹھنڈے پانی سے چھانک لیں اور زیرہ پانی میں پیس کر مقعد پر لیپ کریں۔ اس سے بواسیر کی سوجن اور درد میں آرام ملے گا۔ کچا پسا ہوا زیرہ ایک گرام اتنے ہی گلوں میں ملا کر تین بار روزانہ لیتے رہنے سے پرانا بخار ٹھیک ہو جاتا ہے۔

زیرہ سے ہاضمے کا چورن بنتا ہے۔ زیرہ، سوٹھ، سوندھا نمک، پیپل دراز، سیاہ مرچ، سب اشیاء ہم وزن مقدار میں پیس کر ایک چمچ کھانے کے بعد پانی کے ساتھ لینے سے کھانا جلد ہضم ہوتا ہے۔

بالوں کی نشوونما اور نگہداشت کے لیے پروٹین، چکنائی، پانی اور کاربوائیڈ ریٹ انتہائی ضروری ہیں۔ سیاہ زیرہ میں سو سے زیادہ غذائی عناصر (Nutrients) اور پروٹین پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کالے زیرہ سے کاسف کسی بھی بہترین تیل کے ساتھ ملا کر بالوں کی جڑوں میں لگائیں اور اچھی طرح مساج کریں۔ (نیز اس کا استعمال اپنے کھانوں میں مستقل رکھیں)۔

اگر بال تیزی سے گر رہے ہیں اور پتلے یا باریک ہو چکے ہیں تو سیاہ زیرہ پاؤڈر اور زیتون کا تیل ہم وزن ملا کر بالوں میں لگائیں۔ یہ تیل غسل کرنے کے بعد لگائیے۔ ہفتے میں تین بار اس تیل کا استعمال بہت جلد بال گرناروک دے گا۔ لمبے، گھنے اور چمکدار بال یقیناً ہر خاتون کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کے لیے کالا زیرہ ڈیڑھ چمچ ۳/۴ کپ پانی میں دس منٹ تک ابال لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اسے چھان لیں۔ اب اس پانی میں انڈے کی زردی اچھی طرح سے ملائیے۔ چائیں تو اس میں زیتون کا تیل بھی شامل کر سکتے ہیں۔

اس کچھر سے بالوں میں مساج کریں اور آدھے سے ایک گھنٹہ تک بالوں میں لگا رہنے دیں، پھر دھو لیں، بہترین نتائج کے لیے یہ عمل ہر ہفتے کر سکتے ہیں۔

ذیابیطس کے مریضوں میں زیرہ کا استعمال انتہائی مفید ہے۔ اس سے شوگر کیوں کنٹرول رکھنے میں مدد ملتی ہے، یعنی یہ خون میں شکر کی سطح متوازن رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

زیرہ میں فولاد بھر پور مقدار میں پایا جاتا ہے جس سے انیسا یعنی خون کی کمی کے شکار افراد کو مدد ملتی ہے۔ یہ خون میں ہیوگلوبن کی مقدار بڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا اور جسم میں آکسیجن کے غلیات کی عمر بڑھاتا ہے۔ زیرہ کا استعمال ہر دو طرح سے انسانی صحت کے لیے مفید ہے۔ زیرہ نظام ہاضمہ درست اور پیٹ سے متعلق بیماریاں دور کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ساز کی کرسی باقی تمام کرسیوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ خطرناک ایک اور کرسی ہے جسے الیکٹرک چیئر یعنی بجلی کی کرسی کہتے ہیں۔

یوں تو تھوڑی بہت بجلی ہر کرسی میں ہوتی ہے لیکن الیکٹرک چیئر کی بات ہی اور ہے۔ اس کرسی سے ہر شخص حتیٰ کہ سیاسی لیڈر بھی ڈرتے ہیں اور اس کے تصور سے ہی ان کا دم نکلنے لگتا ہے۔ عام کرسیوں میں جو ہلکی سی برقی رو ہوتی ہے، وہ بیٹھنے والوں کے جسم میں نشے اور سرور کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور ان کی گردن خود بخود اکر جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بیورو کریٹ کی کرسی، لیکن الیکٹرک چیئر پر بیٹھنے والوں کی گردن نہیں بلکہ سارا جسم اکڑ جاتا ہے۔ وہ کرسی سے اترنے کے قابل بھی نہیں رہتے بلکہ انھیں اتارنا پڑتا ہے جس طرح سیاستدان کو کھینچ کر کرسی سے نیچے لانا پڑتا ہے۔

چند ایک کرسیاں ایسی ہیں جن کی ایک یا ایک سے زیادہ چولیس ڈھیلی ہوتی ہیں۔ ان کی خاصیت یہ ہے کہ بیٹھنے والوں کی اپنی چولیس ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ اگر کرسی جسم کے بوجھ سے زمین بوس ہو جائے تو ساتھ ہی اوپر بیٹھنے والا سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔

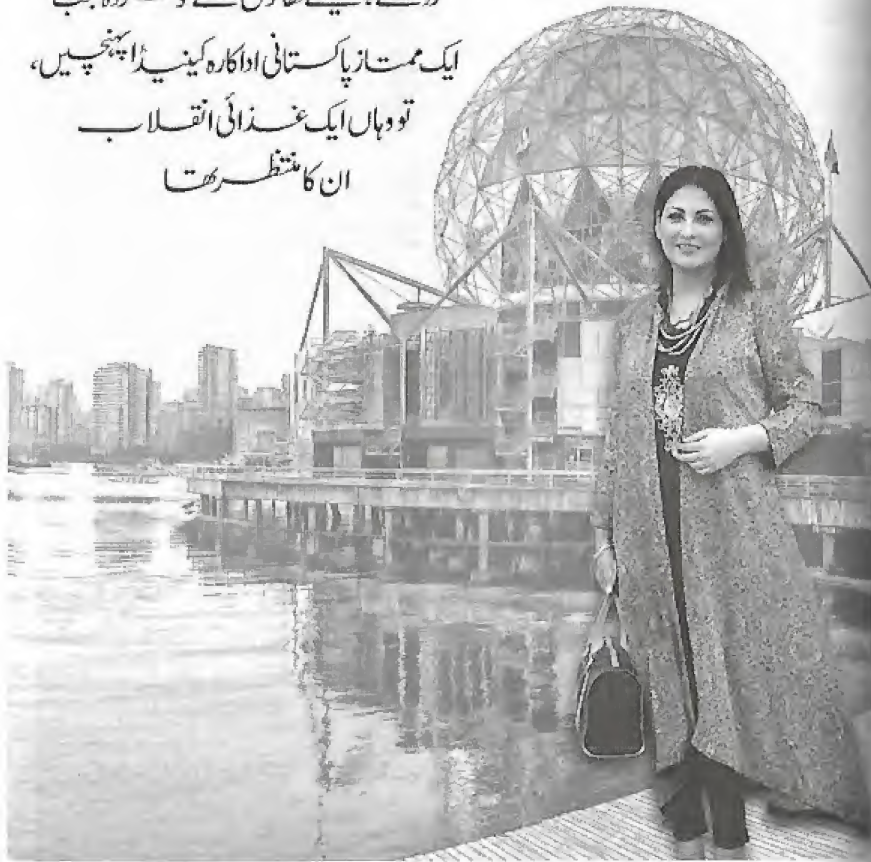
ڈھیلی چولیس والی کرسیاں عموماً وفاتوں میں ملاقاتیوں کے لیے یا تیسرے درجے کے ریسٹورانوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ مزدور پیشہ لوگوں کے گھروں میں اول تو کرسی ہوتی نہیں اور اگر ہو بھی تو ڈھیلی چولیس والی ہوتی ہے۔ مزے کی بات یہ کہ ہمارے معاشرے میں صبح الدماغ لوگوں کے حصے میں عموماً ڈھیلی چولیس والی کرسیاں آتی ہیں جب کہ مضبوط کرسیاں عموماً انھیں ملتی ہیں جن کے دماغ کی چولیس ڈھیلی ہوتی ہیں۔

کرسیوں سے بیٹھنے کے علاوہ اور بھی کئی کام لیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض ممالک کی قانون ساز اسمبلیوں میں کرسی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی اسپیکر

پر دیسی میں دیسی کھانے



روکے پھیکے کھانوں سے خوفزدہ جب
ایک ممتاز پاکستانی اداکارہ کینیڈا پہنچیں،
تو وہاں ایک غذائی انقلاب
ان کا منتظر رہتا



میں اصلی زردے کا رنگ اور یہ سب اصلی گھی میں بنا ہوتا ہے۔ دہی، مٹی، پیاز اور اچار بھی ملتا ہے۔ اس مزیدار ناشتے کے ساتھ لسی پیچھے، چمکین یا تنگی اور بعد ازاں چائے۔

کینڈا میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ بازار کا کھانا ناقص نہیں ہوتا۔ یہاں، بوتلوں میں حفظان صحت کے اصولوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ سمو، بکڑے یا جلیبیاں گندی کڑاہی کے پرانے کالے تیل میں نہیں تلی جاتیں۔ دوپٹا رنگنے کے ککر کے بجائے مٹھائیوں میں کھانے کا ہی رنگ استعمال ہوتا ہے۔ تیل بھی معیاری ہے، کیونکہ دو نمبر یا تین نمبر چیزیں نہ بنتی ہیں نہ کپتی ہیں۔ نہ جانوروں کے سینگوں اور ہڈیوں سے جعلی تیل بننا ہے نہ غیر قانونی کارخانے ہیں۔

کھانا پکانے کے لیے سب سے اہم چیز تیل یا گھی ہوتا ہے اور کینڈا میں یہ دونوں ہی عمدہ ملتے ہیں۔ مسالا جات کی بات کریں تو لال مرچ پس پی ہوئی واقعی لال مرچ ہی ہوتی ہے، پس پی ہوئی اینٹیں نہیں۔ اسی طرح چائے کی پتی بھی چائے ہی ہوتی ہے چنے کے چھلکے نہیں۔ ویسے تو یہاں کھسلی پتی کاروان نہیں زیادہ تر تلی بیگ ہی استعمال ہوتے ہیں۔

ایک بات ہم فخریہ بنانا چاہتے ہیں کہ کینڈا کی مارکیٹ میں مسالوں، اچار اور پاکستانی چاول کے علاوہ پاکستانی چائے کی بھی بہت مانگ ہے۔ پاکستانی چاول دیگر چاولوں کے مقابلے میں دو یا تین گنا مہنگا ضرور ہے مگر معیاری ہونے کے باعث لوگ اسے فوقیت دیتے ہیں۔ باسستی چاول کے لمبے دانے اور پکتے وقت ان سے اٹھتی مہک۔ انھیں سب سے ممتاز بناتی ہے۔ اسی طرح پاکستانی اچار اور مسالے بھی خوب کتے ہیں۔

کینڈا سرد ملک ہے جہاں زیادہ تر ٹھنڈی رہتی ہے لیکن یہاں کی خزاں کا موسم دنیا بھر میں مشہور ہے۔ سیاح برفباری کے بجائے خزاں دیکھنے کینڈا آتے ہیں۔ خزاں ہمیں بھی بہت پسند ہے۔ ہمارا تعلق اسی طبقہ فکر سے ہے جو موسم خزاں کو بہار پر فوقیت دیتے، اس کے حسین رنگوں میں کھو جاتے اور اسے بہترین موسم گردانتے ہیں۔ تاہم جب سورج کی تراز کم ہو جائے، آسمان ہمہ وقت سیاہ بادلوں سے ڈھکا رہے، سرمئی شاموں میں سرمئی ہوا سوکھے پتے ہر جگہ کھیر دے تو دل اداس بھی ہو ہی جاتا ہے۔ جانے یہ اثر موسم کی ایک قسمت تہذیبی کا ہے یا گھر سے دوری کا لیکن انتاض ضرور ہے کہ پردیس میں تنہائی کیلئے پرستار کی طرح لگتی ہے۔

ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں کینڈا میں اچھے اور پُر خلوص دوست ملے۔ یہاں اکثر و بیشتر ادبی و ثقافتی محافل بھی منعقد ہوتی ہیں۔ ہمارائی وی شو بھی کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس سب کے باوجود کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس پاکستان چلے جائیں۔ اپنوں سے لاکھوں میل دور، سات سمندر پار، دیار غیر میں شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک اجنبی سرزمین پر ہیں۔ وطن عزیز کی یاد ہمہ وقت دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ کچھ بھی ہو، اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے۔

کینڈا میں لوگ سال کے بارہ مہینے کافی پیٹتے ہیں اور وہ بھی نہ ہمارے، تاہم سردیوں میں زیادہ پی جاتی ہے۔ ویک اینڈ پر دیسی ریسٹورانوں میں حلوہ پوری کے ساتھ پائے کا بھی ناشتا ہوتا ہے۔ نہایت عمدہ پائے اور گرما گرم نان، واہ امزہ ہی آ جاتا ہے۔ حلوہ پوری کا بھی جواب نہیں، کڑا ہی سے نکلے پھولی پوری، چنے کا سالن جس کے اوپر ہری مرچیں اور ہر ادھنی پڑا ہوتا ہے، آلو کی خشک ترکاری، اور ساتھ سوچی کا حلوہ جس

بیچاروں کو علم ہی نہیں کہ دودھ میں ٹیکم پاؤڈر اور کیمیکل یا دیگر زہر ملا کر بھی فروخت کر سکتے ہیں۔ ان کو سیب بھی نہیں معلوم کہ گائے کو ہارمون کے انجکشن لگا لگا کر زیادہ دودھ نکال سکتے ہیں، پھر یہ لوگ دودھ بھی گائے بھینسوں کا ہی پیٹتے ہیں خود ٹیکسٹری میں دودھ بنانے نہیں بیٹھ جاتے۔ یہاں گائے بھی تو سرسبز و شاداب کھلیاؤں میں چارہ کھاتی ہے۔ ہماری گائے کی طرح کچرے کے ڈھیر پر تو منہ نہیں مارتی۔ باڑے جا کے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مویشی کسی شاہانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارے غریب مویشی تو سڑکوں پر آوارہ پھرتے ہیں۔ بڑی سٹہراہوں پر جہاں ہوی ٹریفک ہو، وہاں بھی ادھر ادھر سے گائے بکریاں آ جاتی ہیں۔ مختصر آجمن جانوروں سے خوراک حاصل ہوتی ہے، چاہے گوشت یا مالچ، ان حسابوروں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

کینڈا میں انسانی زندگی کی قدر و منزلت تو ہے ہی لیکن جس طرح یہاں جانوروں، پھولوں، پودوں کی قدر ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ درخت کا ٹانگہ سنگین جرم ہے۔ یہاں ٹبر مافیا کا کوئی وجود نہیں حالانکہ لکڑی درختوں سے ہی حاصل کی جاتی ہے۔ درخت کٹنے بھی ہیں لیکن سارا کام قانون کے دائرے میں رہ کر ہوتا ہے۔ درختوں کی کٹائی کے لیے انتظامیہ سے اجازت لینا ضروری ہے۔

ویسے یہ بھی خوب ہے کہ کینڈا میں ہر کام کے لیے لائسنس یا اجازت نامہ لینا ضروری ہے۔ اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے اس کام کی تربیت لینی ضروری ہے جس کے لیے لائسنس لیا جا رہا ہے۔ کسی میلے میں پکڑے پیچھے ہیں تو اس کے لیے بھی یہی قانون لاگو ہوگا۔ میلے کا لفظ اس لیے برتا کہ یہاں سڑک پر چھاپڑی یا ٹھیلہ لگا کر کوئی چیز فروخت نہیں کی جاسکتی۔ فٹ پاتھ پر پر بڑھی والوں اور

عجیب بات ہے کہ یہی اچار جب پاکستان میں کھائیں تو ذائقہ الگ اور یہاں کھائیں تو بالکل جدا۔ معلوم نہیں کوالٹی کنٹرول اس کی وجہ ہے یا کوئی اور بات، تاہم یہ تو طے ہے ہمارے باورچی خانے میں پاکستانی مصنوعات ہی اپنی بہار دکھاتی ہیں۔ کینڈا میں گوشت اچھا اور تازہ ملتا ہے۔ حلال گوشت نسبتاً مہنگا ہے۔ یہاں نصاب کی دکانوں میں گوشت نفیس انداز سے رکھا ہوتا ہے۔ آؤل تو ٹرکوں پر کھلا گوشت لے جانے کا کوئی تصور نہیں پھر بکرے کے گوشت کے نام پر بکرا ہی ملتا ہے کوئی اور جانور نہیں۔ جانور کی بھی بڑی توقیر کی جاتی ہے۔ مسوں میں پانی ڈال کر وزن نہیں بڑھایا جاتا، نہ ہی بیمار جانور کا گوشت فروخت ہوتا ہے۔ اسی لیے بیف، چکن یا مٹن، سب کا ذائقہ ہی الگ ہوتا ہے یا ہمیں الگ شاید اس لیے بھی لگتا ہے کہ ہمیں تازہ گوشت کھانے کی عادت جو نہیں ماسوائے قربانی کے دنوں میں۔ نہاری کے لیے جو گوشت ملے، نہایت ملائم ہوتا ہے۔ ہم حیران ہی رہ گئے۔ کراچی میں نہاری کا گوشت ایسا ہوتا ہے کہ ہم تو خالی شورب ہی کھاتے تھے مگر یہاں صورت حال مختلف ہے۔ واقعی کھانے کا مزہ ملتا ہے۔ دیکھا حبابے تو اصولاً یہ خوبی مسلمان ملک ہونے کے ناتے پاکستان میں ہونی چاہیے اور دوسرے غیر مسلم ممالک میں اس خوبی کا فقدان ہو، الٹی ہی لگتا رہتی ہے۔ کاش کبھی پاکستانی بھی، بیرون ملک جا کر فخر یہ کہہ سکیں کہ جو بات پاکستان میں خوراک کے حوالے سے ہے وہ کہیں نہیں۔

کینڈا میں ہر چیز عمدہ اور معیاری ہے۔ چپاندی کا ورق جو کچھر یا دیگر ٹیکسٹ پکوان پر لگاتے ہیں وہ بھی پتی کے بجائے اصلی چاندی کا ملتا ہے۔ اسی طرح دودھ تو اتنا خالص ہے کہ دنیا کا بہترین مائع کینڈا میں ملتا ہے۔ ان



علامہ اقبال واقعات کے آئینے میں

شاعر مشرق کی غیر معمولی شخصیت
عیاں کرنے والے سبق آموز واقعات

مارے خاندان میں مشہور ہے کہ اقبال چھوٹی عمر ہی سے بے حد ذہین تھے۔ پڑھائی کا بڑا شوق تھا اور سخت محنت کرتے تھے، یہاں تک کہ رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ ایک دفعہ نصف شب کے قریب بے جی (والدہ) کی آنکھ کھل گئی۔

دیکھا کہ اقبال لیپ کے پاس بیٹھے اسکول کا کام کر رہے ہیں۔ بے جی نے انھیں دو تین مرتبہ پکارا لیکن کوئی جواب نہ پایا۔ پھر انھوں نے اٹھ کر بیڈ کو ہنچھوڑتے ہوئے کہا کہ اس وقت آدھی رات کو کیا پڑھ رہے ہو؟ سو جاؤ۔ اقبال نے اونگھتے ہوئے جواب دیا، بے جی، سویا ہوا ہی تو ہوں۔ وہ پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے۔

نبی کریم ﷺ کے اخلاق کی خوشبو

ایک دفعہ کوئی سال چھبک مانگت ہوا اُن کے گھر کے دروازے پر آکھڑا ہوا۔ اُسے کئی بار جانے کے لیے کہا گیا، وہ اذیل فقیر ٹٹنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اقبال ابھی عنوان شباب میں تھے۔ اس کے بار بار صدا لگنے پر انھیں طیش آگیا اور اسے دو تین تھپڑ دے مارے، جس کی وجہ سے جو کچھ اس کی جھولی میں بھتا، زمین پر گر کر منتشر ہو گیا۔ والد اُن کی اس حرکت پر بے حد آزرده ہوئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کہنے لگے:

”قیامت کے دن جب رسول اللہ ﷺ کے گرد غازیان اسلام، حکماء، شہداء، زہداء، صوفیاء، علماء اور صاحبانِ شرمسار جمع ہوں گے تو اس مجمع میں اس مظلوم گدا کی فریاد حضور ﷺ کی نگاہ مبارک کو اپنی طرف مرکز کر لے گی اور آنحضور ﷺ مجھ سے پوچھیں گے کہ تیرے پردائیک

پر اٹھوں میں ہے؟ کھانے پینے کی کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ہم نے کینیڈا آ کر استعمال کرنی شروع کیں۔ مثلاً گڑ، شکر کی چائے، مسالا چائے، گھر کی دہی یعنی گھر میں دہی بنائی اور کھائی۔ پراٹھے کے ساتھ دہی اور چار ایک ساتھ، نہاری کا گوشت (پہلے ہم صرف شوربہ کھاتے تھے) سبزی کی ترکاری میں اجوان اور اسی، بادام مکھن، سبزی پنچورین اور اصلی شہد۔ ایسا نہیں کہ پاکستان میں یہ چیزیں میسر نہیں دراصل کراچی کی تیز رفتار زندگی میں کھانے کا اسٹاک ہی الگ ہے۔

ہمیں تو اصلی شہد ملنے کی بہت خوشی ہے۔ ایک تو وہ شہد ہے جو اسٹور سے ملتا ہے۔ وہ بھی اصلی ہوتا ہے مسگر پاچرا اتر! ہم ایسی خاص دکان سے لاتے ہیں جو شہد کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں شہد کی مختلف درجہ کی ہے، یہ شہد مختلف پھولوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ہر شیشی پر اس کے پھول کا نام لکھا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ پاچرا اتر نہیں ہوتا یعنی کسی خاص درجے پر گرم نہیں کیا جاتا لہذا ذرا مہنگا ہے مگر بے مثال ہے۔ یہ دکان بی سینٹر (Bee Center) کہلاتی ہے۔ وہاں ایسا شہد بھی ملتا ہے جسے براہ راست چھتے سے نکالا جاتا ہے۔ اس شہد کو چھنا نہیں جاتا، یعنی انتہائی خالص شہد، واہ، واہ، واہ بھی کیا کہنے!

شہد ایک تو صحت کے لیے بہت مفید ہے پھر اسلامی نقطہ نظر سے بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ گڑ اور شہد کھانے کے باعث اب چینی کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ حیرت انگیز طور پر ہمارے کھانے پینے کا انداز تبدیل ہو چکا۔ ہم سوچتے تھے کینیڈا میں ڈبل روٹی انڈے ملیں گے۔ معسر بنی انداز کے پھیکے کھانوں کے تصور سے ہماری جان نکلی تھی مگر کمال یہ ہے کہ اب ہم مکمل دیسی کھانا کھا رہے ہیں۔ اتنا دیسی تو کراچی میں بھی نہ تھا جو یہاں دیکھو میں ہے۔ ♦♦♦

مڑک کنارے چھا بڑی والوں کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں۔ ”ابنٹی انکر وچٹس“ کا محکمہ غالباً یہاں نہیں ہوگا کیونکہ ضرورت ہی نہیں پڑتی یا اگر ہوگا بھی تو ہر وقت فارغ ہی رہتا ہوگا۔ سنا ہے پاکستان میں سب سے زیادہ مکائی اسی محکمے کی ہے۔

کینیڈا میں اکثر پاکستانی خواتین کیسٹرننگ کا کام کرتی ہیں۔ یہ کام وہ گھروں میں انجام دیتی ہیں۔ یعنی اگر آپ کو گھر پر دوست احباب کی دعوت کرنی ہے اور بریانی، قورمہ، نان، نہاری یا کباب وغیرہ بنوانے ہیں تو فون پر آرڈر کر سکتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں بازار سے خریدیں تو مہنگی ہوں گی اور وہ ڈالٹہ بھی نہ ہوگا جو گھر کا ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی دعوتوں کے لیے یہ انتظام بہتر ہے تاہم بڑی دعوتوں اور پارٹیوں کے لیے ہوٹل والے کیئرنگ کرتے ہیں۔ دعوت کے علاوہ بھی آپ اپنے لیے کیئرنگ کروا سکتے ہیں، مثلاً درجن بھرنان یا پراٹھے بھولیں اور فریڈر میں رکھ کے روز اند ایک ایک نکال کر کھاتے جائیں۔

جو لوگ زیادہ مصروف ہوتے ہیں اور باقاعدگی سے کھانا نہیں پکا سکتے وہ ماہانہ رقم دے کر روز اند وقت کے کھانے کا پکیج لے سکتے ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے دنیا کا بہترین کھانا اپنا دیسی کھانا ہے، برگراؤر پیزا اسے ہمارا گزار نہیں ہوتا۔ جانے دنیا یہ فاسٹ فوڈ کیوں اتنا پسند کرتی ہے؟ خیر پسند اپنی اپنی۔ ہمیں تو ناشتے میں پراٹھے ہی پسند ہیں۔

ہمیں یہی فکر تھی کہ کینیڈا میں پراٹھوں کا کیا ہوگا؟ والدہ کے ہاتھ کے بنے پراٹھے کھانے کو تو ہم ترس جائیں گے مگر وینکوور آ کر پتا چلا کہ یہاں ہر قسم کے پراٹھے لے جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے فریڈر میں خوب پراٹھے بھر رکھے ہیں جو ہم گرم کر کے کھاتے ہیں۔ تاہم فریڈر سے نکلے پراٹھوں میں وہ بات کہاں جو ماں کے ہاتھ کے گرم گرم، تازہ، چھچھے دار

مسلم نو جوان کیا گیا تھا تاکہ تو اس کی تربیت ہمارے وضع کردہ اصولوں کے مطابق کرے، لیکن یہ آسان کام بھی تجھ سے نہ ہو سکا کہ اس خاک کے تودے کو انسان بنا دیست، تو تب میں اپنے آقا و مولا کو کیا جواب دوں گا؟ بیٹا! اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید ازگی کی طرف دیکھ۔ یہ بھی دیکھ کہ مسیحا کی خوف اور امید سے کس طرح کانپ رہا ہوں۔ باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور میرے اللہ میرے مولا کے سامنے مجھے یوں ذلیل نہ کر۔ تو تو چن محمد مصطفیٰ کی ایک کٹی ہے۔ اس لیے اسی چن کی نسیم سے پھول بن کر مل اور اسی چن کی بہار سے رنگ و بو پکڑ، تا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی خوشبو تجھ سے آ سکے۔

یہودی کا خامی

کیمرج میں رہائش کے سلسلے میں اقبال کا ایک بڑا مسئلہ ذبیحہ گوشت کا انتظام تھا۔ اس معاملے میں ان کے محبوب استاد، آرنلڈ نے اُن کی مدد کی۔ اقبال بیان کرتے ہیں: ”جب میں انگلستان گیا تو میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میرے قیام کا انتظام ایسے گھر میں کروادیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یورپ میں محض یہودی اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ صرف اپنا ذبیحہ کھائیں۔ چنانچہ ایک ایسے یہودی کے گھر میں میری رہائش کا انتظام کروادیا گیا۔

ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اپنی نماز باقاعدہ پڑھتے۔ جب میں گھر میں ہوتا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ میرے بھی پیغمبر ہیں اور میں اُن کی روش پر چل سکتا ہوں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد میرا دل اُن کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہر اس چیز میں، جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں اُن کے ذریعے مستگوں تھا، یہ لوگ وکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے۔ اُن کی اسی ایک عادت نے اُن کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔“

بہس یہی مذہب ہے

لندن میں اقبال کا معمول تھا کہ وہ شہر سے رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے ریل استعمال کرتے۔ اس قسم کے ایک سفر کے متعلق وہ بیان کرتے ہیں: ”انگلستان میں طالب علمی کے زمانے میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا۔ گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گاڑی بلند آواز سے پکارتا ”آل چینج“، یعنی سب ریل بدل لو۔

”ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے ارد گرد اخبار بین مسافراں میں بد مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں، ان سے بد مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے۔ چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا میں نے کہا، ابھی جواب دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں چپ رہا۔ چند منٹوں کے بعد انھوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔ میں نے پھر کہا، ابھی جواب دیتا ہوں، وہ کہنے لگے، شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں۔ میں نے کہا، ہاں۔ اس دوران میں اسٹیشن آ گیا اور گاڑی ”آل چینج“ پکارنے لگی۔ میں نے کہا، بس یہی مذہب ہے۔“

ہامہا سے ملاقات

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی راجکمار صوفیہ جندال ہامہا اقبال سے ملنے کی بڑی خواہشمند تھیں۔ وہ جیل روڈ کی ایک کوٹھی میں رہتی تھیں۔ ۱۹۱۲ء کی ایک شام سر جوگندر سنگھ اقبال اور مرزا جلال الدین کو اُن کے ہاں لے گئے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں جانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ راجکمار کی فرمائش پر اقبال نے انھیں چند اردو اشعار سنائے۔ ہامہا اردو سمجھ لیتی تھیں، لیکن شعر سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتیں، اس لیے سر جوگندر سنگھ نے اشعار کا انگریزی ترجمہ کر کے ان کی شریعت کی۔

ہامہا کو معلوم ہو گیا تھا کہ اقبال حلقہ کے شوقین ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے ڈرائیور، چیری جی سے حلقہ بھردا کر پہلے ہی برآمدے کے ایک کونے میں رکھوا دیا تھا۔ جب اقبال بیٹھ گئے تو وہ خود آٹھ گز گئیں اور حلقہ لا کر ان کے آگے رکھ دیا۔ اقبال نے مرزا جلال الدین سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھ لو، رنجیت سنگھ کی پوتی نے اپنے ہاتھ سے ہمیں حلقہ پلا یا ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ

طالب علمی کے زمانے میں ایک مولوی صاحب یورپ کی سیاحت کرتے ہوئے لندن پہنچے۔ آرنلڈ ان دنوں لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ اس لیے مولوی صاحب جو انھیں علی گڑھ کی نسبت سے جانتے تھے، اُن سے ملنے گئے۔ آرنلڈ نے اقبال سے اُن کا تعارف کروایا اور اپنے شاگرد کو حکم دیا کہ انھیں لندن کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کروادیں۔

اقبال نے نہایت تندہی سے مولوی صاحب کو جگہ جگہ پھرایا اور شام کے قریب کبھی تہہ خانے میں جا بٹھایا۔ اس جگہ چند ستم پیشہ لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ اقبال کے اشارے پر یا خود اپنی جولا پی طبع سے وہ مولوی صاحب کے گرد جمع ہو گئیں۔ کوئی ان کو تہہ خانے لگی، کسی نے ان کی نورانی ڈاڑھی کو چھوا، اور ایک نے تو ان کے رخسار پر عقیدت کی چند مہریں بھی جڑ دیں۔

مولوی صاحب سخت پریشان ہوئے۔ جب اس مصیبت سے نجات ملی تو غصے سے بھرے ہوئے آرنلڈ کے پاس پہنچے اور اقبال کی شکایت کی۔ آرنلڈ سخت نادوم ہوئے۔ اقبال سے خشکی کے لہجے میں کہا: ”مولوی صاحب ایسے بزرگ کو تہہ خانے میں لے جاتے ہوئے تمہیں شرم نہ آئی؟“

اقبال نے نہایت متانت سے جواب دیا: ”آپ نے خود ہی تو حکم دیا تھا کہ انھیں لندن کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کروادوں۔ اگر میں مولوی صاحب کو صرف محلات، عجائب

گھر اور تاریخی عمارات ہی دکھلا دیتا تو وہ لندن کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہتے اور ہندوستان جاتے ہوئے ایک طرف خیالات لے کر جاتے۔ لندن کی زندگی میں تہہ خانے نہایت اہم ہیں، اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی صاحب کو تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھا دوں۔

دم دار ستارے کا دیکھنا

علامہ اقبال انگلستان میں ڈائری لکھتے تھے۔ ۱۵ مئی ۱۹۱۰ء کا اندراج آسمان پر دم دار ستارہ دیکھنے وقت اقبال کے ذاتی تاثرات کا نماز ہے:

”کل تقریباً چار بجے صبح میں نے کرۂ ارض کے اس عظیم الشان زائر کو دیکھا جو بیلی کا دم دار ستارہ کہلاتا ہے۔ فضا نے بسیدہ کا یہ پر شکوہ تیراک پچھتر برس میں ایک بار ہماری فضا نے آسانی پر نمودار ہوتا ہے۔ اب میں دوبارہ اُسے صرف اپنے بوتوں کی آنکھوں سے دیکھ سکوں گا۔ میری ذہنی کیفیت عجیب و غریب تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا کوئی چیز اپنی نافت بل بیان و ستون سمیت میرے وجود کی تنگ حدود میں مس آگئی ہے۔ تاہم اس خیال نے کہ میں اس آوارہ مسافر کو پھر نہ دیکھ سکوں گا، مجھے اپنی ذاتی ہستی کی اندوہناک حقیقت کا احساس دلایا اور حلقہ بھر کے لیے میرے تمام ولولے سرد پڑ گئے۔“

حالت سکریں

انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۶ اپریل ۱۹۴۲ء میں انھوں نے اپنی مشہور نظم، بخضر راہ کوئی تیس ہزار کے مجمع کے سامنے پڑھی۔ اقبال کو ان دنوں نہ صرف تنہائی کا شدید احساس تھا، بلکہ بیمار بھی تھے۔ اس لیے نظم کے انداز بیان نے سامعین کو زلادیا۔ نظم پڑھتے ہوئے اقبال نے یہ شعر پڑھا تو رو پڑے۔

بچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکان سخت کوش
اور جب اس شعر پر پہنچے تو خود بھی رورہے تھے اور سارا

جمع بھی اٹھکا تھا۔

ہو گیا مانند آپ ارزاں مسلمان کا لہو

مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

نظم خضر راہ کے متعلق بعض باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی یہ کہ جن دنوں اقبال نے یہ نظم لکھنی شروع کی، ان پر نفرس کے مرض کا شدید حملہ ہوا اور کئی راتیں لگا تار بیداری کے عالم میں گزاریں۔ وہ انارکلی والے مکان کی چھسک سے ملحق کمرے میں اٹھ آئے تھے اور رات کو عموماً علی بخش ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایک شب درد کی شدت کے سبب نیم بیہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کیفیت میں انھیں محسوس ہوا، گویا کوئی مرد بزرگ ان کے پاس بیٹھا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ مرد بزرگ اٹھتا اور چل دیتا ہے۔ اس کے رخصت ہونے کے فوراً بعد اقبال نے علی بخش کو آواز دے کر بلایا اور اس مرد بزرگ کے پیچھے دوڑا تا کہ اسے واپس لے آئے۔ علی بخش کا بیان ہے کہ وہ چھسک کے فرش پر لیٹا اس وقت جاگتے ہوئے اقبال کو تنہائی میں کسی کے ساتھ باتیں کرتے سُن رہا تھا۔ رات کے قریب تین بجے تھے۔ علی بخش تعمیل حکم میں پھرتی سے سیزھیاں اُتر لیکن نچلے دروازے کو اندر سے مقفل پایا۔

دروازہ کھول کر بازار میں نکلا مگر ہو کا عالم طاری تھتا اور بازار کے دونوں طرف دروازے تک اسے کوئی بھی شخص دکھائی نہ دیا۔ سوٹا ہرے کہ نظم تحریر کرتے وقت کسی مرحلہ پر اقبال حالت مسکے سے گزرے، کیونکہ وہ بیمار تھے اور شدت درد کا عالم ایسا تھتا کہ شعوری طور پر اس پر غالب آسکتا یا حالت صحو برقرار رکھ سکتا غالباً ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ علاوہ شدید تنہائی اور ہر طرف سے مخالفت کے سبب انھیں شاید اپنے آپ پر اعتماد نہ رہا تھا اور ان کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ان کا مؤقف غلط ہے یا وہ صحیح راہ سے چمک گئے ہیں اور انھیں راستہ دکھانے والے کسی راہبر کی ضرورت ہے۔

شرقیہ رکار سفر

اقبال اپنے محبوب صوفیہ کے مزاروں پر اکثر حاضری دیتے تھے۔ علماء و مشائخ کے طبقے میں جس گہمی کی بھی شہرت سننے، اس کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے۔ ان کے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام چند خطوط سے ظاہر ہے کہ بعض بزرگ ہستیوں یا مجذوبوں کے متعلق سن کر ملاقات کے شوق میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اسی طرح ایک دن لاہور سے چند میل کے فاصلے پر قصبہ شرق پور میں ایک نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ میاں شیر محمد کے متعلق سنا اور ان کی خدمت میں پہنچے۔ میاں شیر محمد ہمیشہ احترام شریعت پر اصرار کرتے تھے اور جو کوئی بھی انھیں ملنے آتا اسے ڈاڑھی رکھنے کی سخت تاکید کرتے۔ جب اقبال انھیں ملے تو وہ مسجد میں بیٹھے تھے۔ پوچھا: کیسے آئے ہو؟ جواب دیا: میرے لیے دعا کیجیے، منسرمایا: تم ڈاڑھی منڈواتے ہو، میں تمہارے لیے دعا نہیں کروں گا۔

اقبال یہ سن کر اٹھے اور مسجد سے نکل کر ٹانگوں کے اڈے کی طرف چل دیے۔ اسی اثنا میں میاں شیر محمد کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کہہ دیا کہ یہ اقبال تھے۔ یہ سن کر میاں شیر محمد کی عجیب حالت ہوئی۔ مولانا عبد المجید سائیکس تحریر کرتے ہیں:

”مسجد سے نکل کر ننگے پاؤں اڈے کی طرف دوڑے۔ علامہ تانگے پر سوار ہو ہی رہے تھے کہ یہ آن پہنچے۔ بے حد معذرت کی اور کہا کہ میں عام لوگوں کو ڈاڑھی رکھنے کی تاکید کرتا رہا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک آپ جیسے شخص پر جس نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں ایمان اور عمل کے چراغ روشن کر دیے ہیں، ڈاڑھی کے معاملے میں سختی کرنا مناسب نہیں۔ اس کے بعد علامہ کے لیے دعا کی اور علامہ مسرور و مطمئن واپس لاہور آئے۔“

(کتاب ”زندہ رود“ سے اشد شدہ واقعات)

شکاریات

مباہرات



زخمی شیر کے تعاقب میں

میں اپنے پرانے خستہ حال ریڈیو کی سویاں گھما رہا تھا۔ یہ میرا خوابوں کی دنیا سے رابطہ کا واحد ذریعہ تھا پھر بھی مجھے ایک وجہ سے ناپسند تھا۔ میرے جیسے جنگل کے باسی کی خوابوں والی دنیا بڑی سادہ تھی۔ جہاں صاف پانی ٹلکوں سے آتا تھا۔ جہاں نرم گدے والے بستر تھے اور گوشت کے لذیذ تازہ پکوان جن کی خوشبو بھوک بڑھا دیتی۔ زمبیا (افریقہ) کے

موت دے پاؤں ان بے خبر شکاریوں کا پیچھا کر رہی تھی کہ اچانک...

جنگلوں میں شکاری مہمات کی نگرانی پر مامور ایک افسر کے خواب شاید یہی ہو سکتے ہیں۔

میں بات کر رہا تھا اپنے قدیم ریڈیو کی جسے توجہ سے سننا بعض اوقات زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ اب بھی سونیاں گھماتے گھماتے شکاریات کے افسر کی آواز گونجی۔ ٹرانسمیشن نہایت خراب تھی اور میں صرف یہ سن پایا کہ شیر دریا کے پار چلا گیا ہے جلد از جلد وہاں پہنچو۔

آگے کچھ سمجھ نہ آیا۔ میں دوبارہ سونیاں گھمانے لگا۔ کھیلوں کی خبریں آنے لگیں۔ میں سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ آفیسر سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بار بار دہرا رہا تھا: ”سریہاں ٹرانسمیشن بالکل صاف نہیں آ رہی، میں آپ کا پورا پیغام نہیں سن پایا۔ براہ مہربانی اپنا پیغام دہرا دیں۔“

اچانک گہرے سانس کی آواز ابھری اور ساتھ ہی افسر کہنے لگا ”کپٹن، میں کہہ رہا ہوں کہ موبو کمپ کے علاقے میں ایک زخمی شیر دریا پار کر کے جنگل میں داخل ہو گیا ہے۔ عام لوگوں کو اُس علاقے میں جانے کی اجازت نہیں۔ تم وہاں جاؤ، تمام تفصیلات اکٹھی کرو اور اُس شیر کا خاتمہ کر دو۔ اس سے پہلے کہ وہ آدم خور بن جائے کیونکہ اب وہ شکار نہیں کر سکتا۔“

وہ علاقہ ایک نئی کینی کوٹھیکے پر دیا گیا تھا۔ کئی سوئیل پر پھیلے اس جنگلی علاقے میں سات سے آٹھ سفاری کیمپ تھے جو شکار اور علاقے میں سیر و تفریح کرنے کا پورا انتظام کرتے تھے۔ کبھی اُن میں سے ایک میرا بھی ہوا کرتا تھا۔ پھر میں نے حملہ شکاریات کا افسر بننے کا ایسا احقانہ فیصلہ کر لیا جو ایک افریقی ناول کا مرکزی کردار بن سکتا ہے۔ حالانکہ سفاری کیمپ سے میں نے انتخاب کیا کہ لیا تھا کہ چاہتا تو واپس امریکا جا کر پارک ایونیو میں شاندار حویلی لے سکتا

تھا۔ مگر میں نے سب چھوڑ کر اس ڈرائونی اور خوفزدہ زندگی کا انتخاب کر لیا تھا۔ شکار کا شوق ہی مجھے اس معمولی نوکری میں خوار کر دیا تھا۔

ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک ماہر شکاری تھا۔ میں نے کئی درندے شکار کیے اور بے شمار لوگوں کی ان سے جان بچائی تھی۔ خصوصاً دوسرے لوگوں کے زخمی کیے ہوئے بھگوڑے شیروں سے مقابلہ کرنا میری خاص مہمات مسیبن شامل تھا۔

”ہیلو! ہیلو! تم سن رہے ہو؟“ اتنے میں افسر کی آواز دوبارہ گونجی۔

”راجر، راجر..... چیف، میں نے سن لیا ہے اور اب تمام بات مجھے سمجھ آ گئی۔ میں کل صبح ہوتے ہی روانہ ہو جاؤں گا“

”نہیں..... نہیں کپٹن، تم آج رات ہی جاؤ۔ اپنی جمائیاں روکو اور تیار کرو۔“ چیف کی آواز دوبارہ گونجی۔

میں نے ناگواری سے آنکھوں کو کبکڑا کر بولا ”ٹھیک ہے جناب، میں سامان باندھتا ہوں۔ واپسی پر آپ سے بات ہو گی۔ اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر میں نے ریڈیو بند کیا اور اپنا سامان بیگ میں ڈالنے لگا۔

آدھی رات کا وقت تھا جب میں حبارج کے سفاری کیمپ پہنچا۔ جارج میرا پرانا دوست تھا۔ کیمپ کے باہر لائٹن جل رہی تھی۔ جارج نے ایک ملازم کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں نے جارج کو گلے لگا لیا۔ وہ شیر کے فرار ہو جانے پر شرمندہ اور رنجیدہ تھا۔ میں نے اُسے تھپکی دے کر تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں، شیر جلد مارا جائے گا۔

صاحب نے اُسی کا نشانہ باندھا مگر وہ چوک گیا۔ شیر ڈھیر ہونے کے بجائے کمر پر زخم لیے جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ جارج اُسے ختم کرتا وہ گھنے جنگل مسیبن مائب ہو چکا تھا۔

جارج ساری کہانی سنا کر چھڑی سے جلتی لکڑیوں کی آج تیز کرنے لگا جو ہم دم ہوتی ایک دم شرم ہو کر بھڑک اٹھی۔ دریا قریب ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد رات کی خاموشی میں دو گینگڈوں کی آواز گونجی جو شاید پانی پینے آئے تھے۔

جارج نے سگریٹ جلا لیا اور مزید کہنے لگا ”تم جانتے ہو یہاں زمینیاں قانون کا فیصلہ کرتی ہیں۔ شیر ممنوعہ علاقے میں داخل ہو گیا ہے اور میں اُسے مار کر غیر قانونی شکار کے جرم میں جیل نہیں جانا چاہتا۔“ میں نے گردن ہلا دی جیسے مجھے اُس سے اتفاق ہے مگر دل مسیبن سبھی سوچ رہا تھا، ہاں!..... تم خود مصیبت سے بچ گئے اور مجھے آذیت میں ڈال دیا۔

سچ یہ ہے کہ ایک زخمی شیر دنیا کی سب سے خطرناک اور ہولناک چیز بن جاتا ہے۔ وہ اپنے پیچھے آنے والوں کا عبرت انگیز حشر کرتا ہے۔ میں خود کو تسلی دینے لگا کہ شاید زخم گہرا ہو اور شیر دوسرے کنارے پر پہنچ کر مر چکا۔ یہ خیال کچھ سکون بخش تھا۔ مجھے نیند آنے لگی اور جلد ہی میں پرسکون دادی میں پہنچ گیا۔

صبح بہت جلد ہو گئی۔ میں اٹھ کر تیار ہوا، چائے پی اور جارج کی طرف چل پڑا۔ جارج نے عین اُس مقام کی نشاندہی کی جہاں سے شیر دریا پار گیا تھا۔ مجھے گزشتہ تجربہ بات سے علم تھا کہ دریا سے چند سو گز کے فاصلے پر ایک گھاٹی ہے۔ میں نے اپنی ۴۰ ماٹرو ڈبل رائفل تیار کی اور پانی کی تھر ماس اور دو پھر کا کھانا جارج سے لے کر

چل پڑا۔

جارج کا ملازم ہنس میرے آگے تھا۔ ہم نے گولی لگنے کے مقام کا دوبارہ معائنہ کیا۔ ہنس کے مطابق گولی شیر کی آنتوں میں لگی تھی اور زخم کافی گہرا تھا۔ اس کی بخشن گولیاں اور اندازے اکثر درست ثابت ہوتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ سو فیصد درست کہہ رہا ہے۔ شیر کو گولی ٹکٹم رائفل سے ماری گئی تھی۔ میرا تجربہ بتاتا تھا کہ اُس رائفل کی گولی جسم کے اندر ہی رہتی ہے۔

جارج نے مزید بتایا، جو مادہ شیر نیاں شیر کے ساتھ تھیں، وہ گولی چلتے ہی غائب ہو گئیں۔ اُس نے انھیں شیر کے ساتھ دریا پار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر ممکن تھا کہ وہ رات کو دریا پار چلی گئی ہوں۔ بہر حال خوش فہمی تو تھی کہ ہمیں شیر تنہا ہی ملے گا۔ حملہ کرنے میں شیر نیاں شیر سے زیادہ تیز اور پھر تسلی ہوتی ہیں۔ مشرقی افریقہ میں اگر نر اور مادہ اکٹھے نظر آئیں تو پہلے شیرنی کو گولی ماری جاتی ہے مگر یہاں وکیل صاحب شیر پر وار کر چکے تھے۔

میرے ساتھ ہنس کے علاوہ سنی بھی تھا، ایک ماہر کھوجی۔ وہ ماضی میں آدم خور شیر کو مارنے میں میری مدد کرتے ہوئے اپنے ایک بازو کی قربانی دے چکا تھا۔ آدم خور نے اُس کا بازو بری طرح چاڑا لالہ تھا۔ سنی دریا کے کنارے ریت پر نشاں ڈھونڈنے لگا۔ وہ مجھے کا ملازم نہیں تھا مگر مجھے اس کی صلاحیتوں پر پورا اعتبار تھا اس لیے میں اپنی تنخواہ میں سے اُسے کچھ رقم دے کر اپنے ساتھ شامل کر لیا کرتا۔

نشانات اچھی طرح دیکھنے کے بعد سنی نے ایک سمت اشارہ کیا اور مسکراتے ہوئے بولا ”چلو آؤ، اب اس قفسے کو تمام کریں۔“ اس نے اپنے جوتے اُتار کر گلے میں ڈال لیے۔ میں نے بھی اُس کی پیروی کی۔

دریا میں گھٹنے گھٹنے پانی تھا۔ دریا پار کرتے ہی شیر کے بچوں کے نشان دکھائی دیے۔ یہ چوہیں گھٹنے پرانے تھے مگر نئی والی جگہ ہونے کی وجہ سے بالکل تازہ لگتے تھے۔ کنارے سے تقریباً ۱۵۰ گز دور خون کے بڑے بڑے دھبے جھاڑیوں میں غائب ہوئے دکھائی دیے۔ نشان بتا رہے تھے کہ وہاں شیر نے اپنا بدن خشک کیا تھا۔

خون کے دھبے بتا رہے تھے کہ زخم کافی گہرا ہے اور شیر شدید تکلیف میں ہے۔ ایسا شیر وحشی اور پاگل ہو جاتا ہے۔ اب ہم پہلے سے چوکنے ہو گئے۔ عین ممکن تھ وہ سامنے ہی موجود کسی جھاڑی میں بیٹھا اپنے زخم چاٹتا ہمارا انتظار کر رہا ہو۔ ایک زخمی شیر کو شکار کرنا جان جوہم کا کام ہے۔ ذرا سی غلطی بھی مہنگی پڑ سکتی ہے اور اس کی سزا شرمندگی نہیں موت ہی ہوتی ہے۔

دریا سے ساٹھ گز دور آ کر شیر دوبارہ لیٹا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ پھر چل پڑا۔ اس کے بعد ایک بڑے گھنے درخت کے نیچے لیٹا۔ وہاں خون کا بڑا سادھہ ایک گھٹنے سے زیادہ پرانا نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ اب ہم شیر کے قریب ہی پہنچ چکے تھے۔ گرمی ایک دم ہی بڑھ گئی کہ یہ صرف سورج کی حدت نہیں تھی، یہ شیر کی قربت کا احساس تھا جس نے ہمارا خون گرمادیا۔ یہی لگا جیسے بھری محفل میں کوئی گھور رہا ہے۔ ہمارے اندازے درست

ثابت ہوئے۔ ۳۰ گز دور ہمارے عین سامنے موجود جھاڑیوں کے جھنڈے سے ایک خوفناک غراہٹ سنائی دی اور پھر ایک اور..... ہمیں لگا جھاڑیوں میں بہت سارے شیر موجود ہیں۔

شیر نیاں یقیناً شیر کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ اب مزید آگے بڑھنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ سنی نے اپنی جیب سے ایک سکہ نکال کر جھاڑیوں کی طرف اچھالا

شیر نیوں نے رات کو ہی دریا پار کر لیا تھا۔ واپسی پر ہمیں اُن کے بچوں کے نشان بھی مل گئے۔ یہ اس جگہ سے تقریباً سو گز دور تھے جہاں سے شیر نے دریا پار کیا تھا۔ اگر ہم نے دریا پار کرنے کے بعد کنارے کا پوری طرح جائزہ لیا ہوتا تو ہم اُن کی موجودگی سے یقینی طور پر باخبر ہوتے مگر زندگی شاید کیجئے کا نام ہے اور ہم ہر لمحہ تجربات ہی سے سبق سیکھتے ہیں۔



معرکہ بڈھ بیر کاہیرو



غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ایک دلیر
جوان کی ولولہ انگیز کہانی جس نے اپنی حبان ملک و قوم
پرست رہاں کر ڈالی مگر اس پر کوئی آنچ نہ آنے دی

پروفیسر محمد ظہیر قدیل

ان کے کمرے میں پہنچا تو انھوں نے مجھ سے کہا: ”شہزاد فوراً میری وردی تیار کرو، مجھے بہت جلد نکلنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں تشریف لے گئے۔ ان کے چہرے پر بہت زیادہ پریشانی کے آثار میں نے دیکھ لیے تھے۔ جتنی دیر میں وردی تیار ہوئی، صاحب شیوہ کے اور منہ دھو پاہر تشریف لا چکے تھے۔ اس دن انھوں نے غسل بھی نہیں کیا۔ فوراً وردی پہنی اور باہر کی طرف بھاگے۔

ناشتے کا میں پوچھتا رہا لیکن انھوں نے اتنا کہا: ”ناغم نہیں ہے...“ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
”صاحب باہر نکلے تو فونی گاڑی کھڑی تھی۔ باہر نکلنے ہی انھوں نے ڈرائیور سے چابیاں لیں اور ڈرائیور کو ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ نہایت تیزی کے ساتھ گاڑی موڑی اور یہ جاوہ جا۔ میں دیکھتا ہی رہا۔ کچھ ہی دیر بعد صاحب کافون آ گیا اور وہ مجھ سے کہنے لگے: ”شہزاد فوراً طور پر لائٹ کمانڈر کے میجر صاحب کا نمبر مجھے ایس ایم ایس کرو۔“ میں فوراً ان کی کہنی گیا اور وہاں سے میجر صاحب کا نمبر لے کر انھیں بھیج دیا۔

”اسی وقت مجھے بریگیڈئیر صاحب کارڈلی، اصغر مل گیا۔ میں نے اس سے کہا ”یار آج صاحب بہت جلدی اور پریشانی میں نکلے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔ کچھ تمھیں خبر ہے؟“ اس نے بھی بے خبری کے عالم میں سر ہلادیا۔ تقریباً سات بجے مجھے پتا چلا کہ بڈھ میرا تیر فورس کیمپ پر دہشت گردوں نے حملہ کر دیا ہے۔

”میں پریشان ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ان سے بات نہ کر سکا۔

۵ ستمبر ۲۰۱۵ء، ہفتے کا دن، کینٹن اسفند یار بخاری کے ساتھ اہل خانہ کی آخری ملاقات کا دن ہے۔ وہ صرف چند گھنٹے کے لیے پشاور سے انک آیا تھا۔ اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی لیکن سسرال والے اس دن انک آئے ہوئے تھے، اس لیے کچھ گھنٹوں کی رخصت لے گھر پہنچ گیا۔ اس دن اسفند یار کچھ زیادہ ہی خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ امی نے مہمانوں سے کہا: ”دیکھیے ہمارا چاند آج کچھ زیادہ ہی چمک دک رہا ہے... مہمان چلے جائیں تو مجھے اسفند کی نظر اُتارنا ہے۔“ رات کو اٹھ بجے جب ودارغ شہید کا وقت قریب آیا تو ماں اسے اپنے کلیجے سے لگائے بہت دیر تک پیار کرتی رہی۔

کینٹن اسفند واپس پشاور پہنچا تو اس کا اردلی، شہزاد انتظار کر رہا تھا۔ اسفند یار نے شہزاد سے کہا: ”شہزاد! میرے دفتر جاؤ اور میری میز پر جو ایک فائل پڑی ہے وہ لے آؤ۔“ شہزاد گیا اور اس کے دفتر سے متعلقہ فائل لے آیا۔

اسفند یار نے کہا: ”میرے شہزادے! اب جا کر سو جاؤ۔“
شہزاد کہتا ہے: ”میں نے سر کو جواب دیا، سر آپ بھی سو جائیں ارات کا ایک بج چکا، صبح کام کر لیجیے گا۔“ صاحب مسکرائے اور ہنستے ہوئے بولے:

”لوگ کہتے ہیں فوج میں بڑی موج ہے۔ میں کہتا ہوں فوج کی وجہ سے لوگوں کی موج ہے۔ فوج جاگتی ہے تو عوام موج اور مزے میں سوتے ہیں۔ شہزاد! مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے، ٹو جا کر آرام کرو۔“ یہ کہہ کر یپ ٹاپ پر فائل کھول کر کچھ کام کرنے لگے۔ جانے کب سوتے، میں ایک بجے جا کر سو گیا تھا۔“

شہزاد اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: ”۱۸ ستمبر کو منہ اندھیرے ہی ۰۵:۳۰ پر مجھے صاحب کی کال آئی۔ میں فوراً

سارے نو بجے قریب انک سے کینٹن صاحب کی باجی کافون آیا کہ صاحب کہاں ہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا، جب واپس آئیں تو انھیں بتانا کہ آپ کی امی کافون آیا تھا۔ جب واپس آئیں تو مجھے فون کر لیں... مگر پھر وہ واپس نہ آ سکے۔“ یہ کہتے ہوئے شہزاد کی روتے روتے ہنسی بندھ گئی۔

بڈھ میرا پشاور کا نواحی قصبہ ہے۔ وہاں کا ایک بہت بڑا علاقہ ۱۹۵۹ء میں امریکا کو دس سال کی لیز پر دے دیا گیا تھا جہاں امریکا نے اپنا ایک ہوائی اڈا قائم کر لیا تاکہ وہ یہاں سے روس پر نظر رکھ سکے۔ اس اڈے سے جاسوسی جہاز ”یو 2“ اڑانے جاتے اور سوویت یونین کی نگرانی کی جاتی۔ مئی ۱۹۶۰ء میں روسیوں نے امریکی جاسوسی جہاز کو رپڈار کے ذریعے پکڑا اور اپنے طیاروں کی مدد سے نیچے اتار لیا۔ پائلٹ گرفتار ہوا۔ روسیوں کو جب یہ پتا چلا کہ ”یو 2“ پشاور کے قریب بڈھ میرا تیریس سے اڑ کر آیا تھا تو انھوں نے نقشے پر بڈھ میرا کے ارد گرد سرخ دائرہ کھینچ کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بھانے کی دھمکی دے دی۔ جنوری ۱۹۷۰ء میں امریکا سے یہ تیریس واپس لے لی گئی اور اسے پاکستان تیریس کا میس کیمپ بنادیا گیا۔

پشاور میں کینٹن اسفند یار کے بریگیڈ کمانڈر، بریگیڈئیر عنایت پتائے ہیں: ”بیوں ہی مجھے یہ خبر ملی کہ دہشت گردوں نے بڈھ میرا کیمپ پر اپنے ناپاک قدم رکھے ہیں تو میں نے فوری طور پر اسفند یار کو فون کیا اور اسے بتایا کہ فوری طور پر چلا آئے۔ اس نے بہت تیزی سے اپنی ٹرانزٹ پلاٹون کو متحرک کر دیا۔ جب میں باہر نکلا تو کینٹن اسفند یار بخاری باہر بالکل تیار اور مستعد کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیلوٹ کیا اور کہا: ”سرا جلدی کیجیے کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اللہ نہ کرے کہ کوئی سانحہ ہو جائے۔ وہاں اسکول بھی ہے اے پی ایس، ہم

تعارف

کینٹن اسفند یار بخاری شہید پر زیرِ نظر مضمون ایک کتاب ”مہر کہ بڈھ میرا کایو“ سے بعد حکمران یا گیا ہے۔ یہ کتاب پروفیسر محمد ظہیر قدیل کے مرنے کا اعجاز ہے جو کینٹن اسفند یار شہید کے استاد بھی رہ چکے۔ انھوں نے کتاب میں نہایت احترام و محبت اور ولولے سے شہید شاکر کے حالات زندگی رقم کیے ہیں۔ یہ مفرد کتاب قاری کے جذبہ حب الوطنی کو میسر دیتی اور اسے بھی ملک و قوم کی خاطر کارنامہ ہانے انجام دینے پر اکساتی ہے۔

یہ کتاب بخاری لیبارٹری، ۲۳، کینٹن اسفند یار روڈ، انک شہر، فون نمبر: ۰۱۰۱۰۰۳۲۳۷۷ سے دستیاب ہے۔



کینٹن اسفند یار شہید کا آخری دیدار

نہیں چاہتے کہ پشاور جیسا کوئی واقعہ دہرایا جاسکے۔ ہم بجلی کی طرح وہاں سے نکلے۔ میں نے اپنا وائرلیس سیٹ اسفند یار کو دے دیا اور کہا کہ سب سے ضروری رابطہ کرو اور موجودہ صورت حال سے باخبر رکھو۔ پھر اسفند یار تازہ خبریں پہنچاتا رہا۔ اس نے بتایا: ”دہشت گرد دو گروہوں میں بٹ کر دونوں دروازوں سے اندر داخل ہوئے ہیں۔۔۔ لڑائی شدت سے جاری ہے۔۔۔ دونوں اطراف سے شدید فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔۔۔ وہ اندر اقامتی کالونی میں جانا چاہتے ہیں۔۔۔ اگر یہ لوگ وہاں چلے گئے تو بہت خوف ناک نتیجہ نکل سکتا ہے۔“

میں نے دیکھا کہ اسفند یار کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر وہاں پہنچ جائے۔ اس کے ہاتھوں، انگلیوں کی حرکات اور چہرے سے صاف لگتا تھا کہ وہ شدید تناؤ میں ہے۔ کہنے لگا ”سرا! یہ درندے ہیں اور بھیڑیے۔۔۔ انھوں نے وہاں جا کر نہ بچے دیکھنا ہے نہ عورت، نہ جوان، نہ بوڑھا، سب کے ساتھ ہیما نہ سلوک کریں گے۔۔۔ میرا انسانی بدن میں بھیڑیے ہیں۔۔۔ وہ کالونی کے لوگوں کو اپنی ڈھال بنا لیں گے تو ہمارے لیے آپریشن مشکل ہو جائے گا۔۔۔ انھیں وہاں نہیں جانے دینا چاہیے۔۔۔ (وہ مسلسل بولے جا رہا تھا)۔۔۔ خبیث! ہمیں پہنچنے دو۔۔۔ تمہیں عبرت کی مثال بنا دیں گے آج۔۔۔ بس ہمارا انتظار کرو۔ ہم ۰۶:۲۵ پر بڑھ کر پہنچ گئے۔“

بلڈ ہیر بازار سے ایک سڑک انیریئس کی جانب جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف وہاں کے ملازمین کی کالونیاں ہیں۔ اس سڑک کا نام انقلاب روڈ ہے۔ بیس کیمپ کے دونوں گیٹ آٹنے سامنے ہیں۔ اب سیکورٹی کی وجہ سے ایک گیٹ کو ذرا آگے کر دیا گیا ہے۔

بریگیڈ تیر عنایت اور کمیٹیٹن اسفند یار بخاری جب انیریئس پر پہنچے تو انھیں شدید فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں

فوری طور پر کنٹرول روم پہنچے تو معلوم ہوا کہ ۱۲ پنجاب کی کونٹیک ری ایکشن فورس کے کمانڈر میجر حسیب رشی ہو گئے ہیں اور انھیں سی ایم ایچ پشاور بھیج دیا گیا ہے۔ اسفند یار نے بریگیڈ تیر عنایت سے درخواست بلکہ التجا کی کہ اسے کمانڈ دی جائے۔ انھوں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا: ”کمیٹیٹن اسفند! میجر صاحب کے بعد دوسرے آفیسر موجود ہیں، جن کی ذمہ داری ہے اور وہ نبھارہے ہیں، آپ ایک اسٹاف آفیسر ہیں، آپ کو کیسے اجازت دی جاسکتی ہے؟“

اسفند یار نے خد کی: ”سرا! وہ کپتان نا تجربے کا راور جو میجر ہیں جبکہ دہشت گرد خوب تجربے کا راور جدید اسلحے سے لیس ہیں۔ مجھے ایک ہی خطرہ ہے کہ وہ کالونی کے سینکڑوں لوگوں کو یرغمال نہ بنا لیں۔ سرا! پلیز۔۔۔ پلیز۔۔۔ پلیز مجھے جانے دیں۔۔۔ میں انھیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ان کی نسلیں یاد رکھیں گی۔ انھیں بلیٹیں بنا بنا کر شکار کروں گا۔“ بالآخر اس کی خد کے آگے ہتھیار ڈالنے ہوئے بریگیڈ تیر عنایت نے اسے اجازت دے دی۔

بریگیڈ تیر عنایت صاحب کہتے ہیں: ”حالانکہ میں نے بادل ناخواست اسفند یار کو اجازت دی مگر مجھے اس کی صلاحیتوں پر بہت بھروسہ اور اعتماد تھا اور اس وقت اس سے بہتر کوئی آپریشن بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے مکمل طور پر مسلح ہونے کا کہا اور خود گاڑی میں بیٹھ کر اگلی کسی خبر کے ملنے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک مجھے نہایت قریب سے فائر کی آواز آئی۔ میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو اسفند یار مسکرا رہا تھا، اس نے میری حیرانی دیکھتے ہوئے کہا: ”سرا! میں اپنے اسلحے کی پڑتال کر رہا تھا۔“ وہ پھر چیتے کی سی پھرتی سے آگے بڑھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اپنے ہی بیٹے کو محاذ جنگ کی طرف جاتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اسے پیچھے سے آواز دی اور کہا: ”اسفند کیا تم مکمل مسلح ہو؟“

اس نے دور سے ہاتھ بلند کر کے کہا: ”سراو کے“ اور پھر اسفند یار وہاں سے دشمن کی جانب چلا گیا۔ کمانڈ ملے ہی اسفند یار گاڑی میں بیٹھا اور سب سے پہلے اس نے اپنی فورس کے جوانوں کو منظم کیا۔ پھر ان راستوں کو مکمل طور پر بند کر دیا جو اقامتی کالونی کی جانب جاتے ہیں، پھر وہاں موجود مسجد کا چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا اور آگے بڑھ کر اپنی گاڑی دہشت گردوں کے مزید قریب لے گیا۔ دہشت گرد چھپ چھپ کر بیرکوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔

اسفند یار نے دہشت گردوں کی جانب فائر کھول دیا۔ انھوں نے گاڑی پر شدید جوابی کارروائی شروع کر دی۔ اس کی پیچال انتہائی کامیاب رہی، اس طرح اسفند یار نے دہشت گردوں کے ٹھکانوں کا پتا معلوم کر لیا۔ ریکی مکمل کر کے وہ واپس آگیا اور پھر ان پر فوری قابو پانے کا مکمل منصوبہ بنالیا۔

اس کے بعد اسفند یار نے وہ فیصلہ کیا جو بالکل اس کے شایان شان تھا۔ اس نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ ایک اعزازی شمشیر یافتہ کپتان ہے۔ اس نے فراموش کر دیا کہ وہ جی تھری کپتان ہے۔ اسے فوج میں اپنا تہنک مستقبل بھی بھول گیا۔ اسے راہ دیکھتی اپنی ماں بھی بھلنا پڑ گئی جو اس کے ماتھے پر سہرا سجاد بکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے ابو بھی بھول گئے جو اس کی پیدائش سے اس کے بہترین دوست اور راہنما تھے، اسے بھائیوں کا خلوص و محبت بھی یاد نہ رہی۔ اسے یاد رہے تو بس وہ درندے جنہوں نے وطن کی عزت داغدار کرنے کے ناپاک عزائم بنا رکھے تھے۔ اسے یاد رہے تو وہ معصوم اور بے گناہ لوگ جو ان درندوں کا بآسانی نشانہ بن سکتے تھے۔ اسے یاد رہے تو وہ شہداء جن کو وہ مسجد میں خون سے لت پت دیکھ چکا تھا۔ اسے یاد رہے تو وہ وحشی قاتل جو سینکڑوں لوگوں کی موت سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔



شاہین دہشت گردوں کو تلاش کرتے ہوئے

کپٹن اسفند یار نے رضا کارانہ طور پر ۱۲ پنجاب اور ۱۵ بلوچ کے جوانوں کی قیادت کی تھی۔ اس نے اپنے منصوبے کے مطابق ایک متبادل راستے کا انتخاب کیا تاکہ جو دہشت گرد عمارت کے اندر موجود ہیں اور فائرنگ کرتے ہوئے کالونی کی طرف جانا چاہتے ہیں، ان کا راستہ روک کر انھیں وہیں ختم کر دیا جائے۔

اس کے سوا، کپٹن اعجاز بتاتے ہیں: ”اسفند یار کی حکمت عملی کے باعث تمام راستے سیل کر دیے گئے اور دہشت گرد ایک مخصوص علاقے تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اب وہ بیرکوں کے اندر ہی سے ہماری گاڑی کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔ جب کمانڈر اسفند یار کے ایک عجیب فیصلے نے سب کو حیران کر دیا۔ انھوں نے کہا: ”ہمیں گاڑی سے باہر نکلتا ہوگا۔“

”میں نے ان سے کہا: ”سر یہ خطرناک ہو سکتا ہے، وہ ہمیں سامنے پا کر چھوڑیں گے نہیں، مگر انھوں نے کہا: ”آپ لوگ فائرنگ جاری رکھیں، میں موقع پا کر نکلتا ہوں، ورنہ یہ دہشت گرد شدید فائرنگ کا فائدہ اٹھا کر کالونی کی جانب چلے جائیں گے اور پھر اسے پی ایس کی طرح کا کوئی ساتھ ہو جائے گا اور میں کسی قیمت پر ایسا نہیں چاہتا۔“

یوں انھوں نے اپنے فرائض سے بھی بڑھ کر وطن کی خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ انھوں نے بہترین کمانڈ کی۔ اس دن میں ان کی قائدانہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا۔ پھر وہ شدید جاری فائرنگ میں گاڑی سے باہر کود گئے اور دہشت گردوں پر قہر الہی بن کر ٹوٹ پڑے۔ ایک غار جی، مسجد کی طرف جا کر زخمی لوگوں پر فائرنگ کرنے لگا۔ کپٹن اسفند یار نے سب سے پہلے اپنا نشانہ بناتے ہوئے اسے بھون کر رکھ دیا۔ عمارت کے ایک ستون کی آڑ سے وہ مسلسل دہشت گردوں کو اپنا نشانہ بنا رہے تھے۔“

اس آپریشن کے چشم دید گواہ، نائیک محمد شفیق کا کہنا ہے: ”اٹھارہ ستمبر کی صبح میں اور نائیک طارق کیانی نماز فجر پڑھنے بڑھ بیرکیمپ میں واقع مسجد آئے۔ وہاں کافی نمازی پہلے ہی سے موجود تھے۔ ہم نے وضو کیا اور سنتیں ادا کیں۔ ابھی فرض نماز کھڑی ہونے میں کچھ دیر باقی تھی لہذا ہم دروازہ شریف اور وظائف پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران وضو کے مقام پر فائرنگ ہو گئی۔ ہم نے گھبرا کر دیکھا کہ یہ فائرنگ کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ اسی وقت دو آدمی اندر آ کر کہنے لگے: ”دہشت گردوں نے حملہ کر دیا ہے، ہم آپ کو بچانے آئے ہیں۔ سب لوگ ایک طرف اکٹھے ہو جائیں۔“

سبھی نمازی گھبرا کر ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ اچانک اُن دونوں نے نمازیوں پر فائر کھول دیا۔ یہ قیامت خیز منظر تھا۔ زخمی نمازی فرش پر، ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ دہشت گردوں نے مسجد کے اندر بھی جوتے پہن رکھے تھے اور وہ کہیں سے مسلمان نہیں لگتے تھے۔ ان کے چہروں پر لعنت برس رہی تھی۔ اتنا ہونا ک منظر دیکھ کر مجھے پکڑ آ گئے اور میں بے ہوش ہو کر فرش پر گر گیا۔

”جب مجھے ہوش آیا تو مسجد کے باہر سے فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ مسجد میں بہت سے لوگ شہید ہو چکے تھے جن میں میرا دوست نائیک طارق کیانی بھی شامل تھا۔ بہت سے زخمی آہ و بکا کر رہے تھے۔ میں ہمت کر کے اٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں بالکل زخمی تھا۔ البتہ کچھ شیشوں کے ٹکڑے ضرور مجھے لگے تھے۔ میرے بے ہوش ہوجانے کی وجہ سے شاید وہ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔“

”میں نے کھڑکی کے باہر دیکھا تو مسجد کی سیڑھیوں پر بھی کئی زخمی زخموں اور درد کی شدت کی وجہ سے کراہ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان کی کس طرح مدد کروں۔ اسی لمحے ایک دہشت گرد بیرک سے فائرنگ کرتا ہوا مسجد کی سیڑھیوں کی

طرف آنکلا۔ وہ زخموں کو مارنے آگے بڑھا۔ میں نے اسے دیکھا تو میرے جسم میں سارا خون منجمد ہو گیا، اب مجھے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔

”میں اسی لمحے میری آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ سامنے سے ایک فوجی گاڑی آ کر کی۔ اس میں سے ایک خوبصورت جوان بجلی کی سی تیزی سے نیچے کودا اور دہشت گرد کی جانب دوڑا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ آدمی نہیں شیر ہے جو اپنے شکار کی طرف بھاگ رہا ہے۔ وہ انتہائی غضب ناک نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے شکار کو کچا پی چا جائے گا۔ اس نے دہشت گرد کو لکھارا: ”بزدل! میری طرف آ!“

اس کی لٹکار سے دہشت گرد گھبرا گیا تو فوجی نو جوان نے فائر کر دیا۔ گولیاں لگیں تو دہشت گرد اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ فوجی جوان بھاگ کر اس کے پاس پہنچا تاکہ یقین کر لے کہ وہ جہنم رسید ہو چکا یا نہیں۔ فوجی جوان بالکل تنہا تھا اور اس حقیقی میدان جنگ میں کسی فلم کا ہیرو نظر آ رہا تھا۔ اسی اثنا میں بیرک کے اندر سے اس پر فائرنگ ہونے لگی۔ وہ ایک ستون کی اوٹ سے جوابی فائرنگ کرنے لگا۔

”اس کی جانب گولیوں کی بو چھاڑ ہو رہی تھی لیکن وہ نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ جوابی فائرنگ کر رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک دہشت گرد بیرک سے نکلا۔ وہ ایک ستون کی آڑ لیٹا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی ہمارے ہیرو نے اسے جہنم واصل کر دیا۔ اب وہاں فائرنگ رک گئی۔ میں نے بغور دیکھا تو وہ پاک فوج کا کپتان تھا۔ میں اس کا نام نہیں پڑھ سکا مگر اس کی جواں مردی اور شجاعت کی داد دے بنا رہ نہ سکا۔ اسی وقت کپتان صاحب نے اپنے جوانوں کو حکم دیا ”زخموں کو یہاں سے نکال کر اسپتال یا کسی اور محفوظ جگہ پر فوری طور پر پہنچا دیا جائے۔“

مسجد کی بالائی منزل پر کئی اتیر میں پناہ لیے ہوئے تھے۔

انھیں نیچے آنے کا حکم دیا گیا۔ جب بہت سے اتیر میں نیچے آ گئے تو انھیں باحفاظت وہاں سے نکال کر کسی محفوظ مقام کی طرف روانہ کر دیا۔ اچانک ملحقہ بیرکوں سے فائرنگ شروع ہو گئی تو وہ اس جانب دھاڑتا ہوا چلا گیا: ”ان جہنیوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا دو، کسی کو چھوڑنا نہیں... یہ اپنا اصل مقام بھول گئے ہیں، انھیں جہنم کے دروازے تک چھوڑنا۔“

”ہم سب حیران تھے کہ ایک ہی شیر نے لڑائی کا پانسا پلٹ دیا۔ ہمیں پھر اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ اس واقعے کے دو تین گھنٹے بعد ٹیلی ویژن پر میں نے دیکھا کہ اسی خوبصورت کڑیل جوان، کپتان اسفند یار بخاری کی شہادت کی خبر چل رہی تھی۔

اس آپریشن کی کامیابی بحکیم پر اللہ تعالیٰ نے فوری طور پر اسے شہادت کے عظیم منصب کا انعام بخشا تھا۔ میری آنکھیں جھلک پڑیں کہ پاک فوج کا ایک نہایت بہادر اور قابل افسر اس دنیا کو اپنے وطن کی خاطر چھوڑ گیا۔ ایسے افسر تو اس وطن کا اثاثہ ہیں۔ میں جب تک زندہ رہوں گا قوم کے اس عظیم سیوت کی داستان شجاعت میرے دل میں زندہ رہے گی۔ خدائے بزرگ و برتر اس کے درجات بلند کرے، آمین۔ واقعی ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے۔“

شہید بڈ بڈ، شہید ناموس وطن، شہید قوم، کپٹن اسفند یار بخاری کی شہادت نے پوری دنیا کو پیغام دیا کہ پاک فوج بے باک فوج ہے اور دنیا کے بہترین جاں باز اور جاں نثار اس فوج میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے افسر، سپاہیوں کے عقب میں پناہ گزین نہیں ہوتے بلکہ انھیں اپنے منصب قیادت کا پورا احساس رہتا ہے۔ وہ اپنے سپاہیوں کے لیے ڈھال بن کر پوری دنیا کے لیے مثال بن جاتے ہیں۔ شہید نہ خود کبھی مرتا ہے نہ اپنی قوم کو مرنے دیتا ہے۔ ♦♦♦

اپنا ریموٹ اپنے پاس!

موجودہ دور میں مسائل ٹٹنے والے ہرگز نہیں، ہمیں ہی ٹھنڈے دماغ سے مثبت رد عمل دکھانا ہوگا

زندگی میں ہر وقت، ہر جگہ، ہر قسم کے افراد اور حالات سے واسطہ پڑتا ہے۔ گھر، دفتر، بازار، اجتماعات اور سفر میں ایسے لمحات آتے ہیں کہ ہم آپ سے باہر ہو جائیں۔ پبلک مقامات اور ٹرانسپورٹ میں حد سے زیادہ بھیڑ، شور اور سگریٹ کا دھواں بے حال کرتا ہے۔ دفتر میں چھٹی چپے لگ نہیں ملتی، کام یا ڈیوٹی پر جاتے گاڑی خراب ہو جاتی ہے۔ بازار میں دکانداروں اور راہ گیروں سے منہ ماری بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگ ذاتیات پر بات کر کے تنگ کرتے ہیں تو کچھ کو بلاوجہ ہر بری صورت حال کا ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

گویا مسائل ٹٹنے والے ہرگز نہیں، ہمیں ہی ٹھنڈے دماغ سے مثبت رد عمل دکھانا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ مسئلہ دراصل ہوتا نہیں ہے، آپ کا رویہ اسے مسئلہ ضرور بنا دیتا ہے۔

اگر ہم کسی کے غلط رویے کا جواب ناروا رویے سے ہی دیں تو ظاہر ہوا کہ ہم بھی اس شخص کی نقل کر کے اپنا ذاتی تشخص کھو رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں سے تنگ ہیں تو دوسری حل ہیں: لوگوں کو سمجھا لیں یا اپنے آپ کو ا کون سا فیصلہ کرنا آسان ہے یہ آپ خود طے کر لیجیے۔ اچھا ہو کہ جب کوئی ہم سے اچھے تو یہ جملہ یاد رکھیں کہ اپنی آواز بلند نہ کریں بلکہ اپنے دلائل قوی بنائیے۔ کیونکہ دنیا میں دس فیصد مسائل اختلاف

امجد محمود چشتی

رائے کے باعث ہوتے ہیں جبکہ باقی نوے فیصد مسائل کا موجب فوری رد عمل، جذباتی اور بیجانی رویے ہیں۔

اپنے وجود کو قابو میں رکھنے والا ہی اصل ماسٹر ہے اور جو غصے میں کنٹرول کھو کر اپنا ہی خون جلائے اور کڑھتا رہے، حقیقت میں وہ شکار ہے۔ فریب ہی سہی، خوش رہنے کی کوشش کی جائے۔ اگر زمین پہ کاٹے ہیں تو کونے کے بجائے جوتے پہن لیں۔ اپنے مزاج کو قابو رکھنے سے ہماری اپنی ذات، خاندان، ملازمت اور معاشرتی تعلقات سب ٹھیک چل سکتے ہیں۔

جو معاملات ہمارے دائرہ اختیار میں نہیں، ان کے بارے میں زیادہ سوچ بچار اور فکر مندی بھی بے سود ہے۔ برے لوگوں کے خراب رویے کو تین طرح سے لیا جاتا ہے۔ جن لوگوں سے ہم ڈرتے ہیں وہاں سب کچھ جذب کر لیتے ہیں، ڈر نہ ہو تو یعنی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں مگر جہاں پیار ہو تو بدلے کی کوشش کرتے ہیں یعنی ناخوشگوار کو خوشگوار میں بدلے ہیں۔ جیسے بچہ روئے تو ماں روتی نہیں بلکہ پیار کرتی ہے۔

کام اپنے آپ کو بدلنے سے سنورتے ہیں۔ یاد رہے کہ بار جھک کر پہنچے جاتے ہیں اور پھینکے سے ہی محبت، امن اور ہمدردی جیسے ارفع جذبوں کا آغاز ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عظیم لوگ مثبت طرز عمل اور رواداری کے باعث ہی عظیم ٹھہرے۔ آئیں ہم بھی طے کریں کہ اپنے من کا ریموٹ ہم خود چلائیں گے اور اسے دوسروں کے ہاتھ نہیں لگے دیں گے۔

اگر ہمارا ریموٹ دوسروں کے ہاتھ میں ہے تو وہ جب چاہیں ہمیں غصہ دلائیں، چڑائیں یا تنگ کریں گے۔ اس دور میں یہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن ہرگز نہیں کہ اپنا ریموٹ اپنے پاس ہی رکھا جائے۔

لیو ٹالسٹائی / عروج فاطمہ

ایک کسان تھا۔ وہ اپنی معاشی بد حالی سے اکثر پریشان رہتا۔ اس کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جس پر کھیتی باڑی کر کے وہ اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی زندگی خوشحال بنانے اور بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر وہ دوسرے پہلے بھی اپنی رہائش تبدیل کر چکا تھا۔ اب زمین کا وہ حصہ جس کا وہ مالک تھا چھوٹے سے رقبے پر محیط تھا۔ اس پر اگنے والی فصل بیج کر وہ



لب گور

مستقبل سنوارنے کا حسین سپنا دیکھنے والے ایک آدمی کی غم ناک کہانی

اتنی رقم ضرور کما لیتا کہ اہل خانہ سمیت پرسکون زندگی گزار سکے۔ پوہم اپنی زمین اور کمائی سے مطمئن نہ تھا۔ وہ اکثر کسانوں کو حسرت سے دیکھتا جن کے پاس زیادہ زمین تھی۔ کاش اس کے پاس بڑے رقبے پر پھیلی زمین ہوتی جس پر وہ کپاس کی بڑی فصل لگا سکتا۔ وہ اکثر اسی فکر میں رہتا۔ وہ دن

دیکھنے میں لمبا چوڑا اور سخت گیر شخص معلوم ہوتا تھا۔ سردار نے حیرت انگیز طور پر کہا کہ ایک ہزار روپے میں جس طرح کی زمین تمہیں چاہیے، وہ مل جائے گی۔ غریب کسان کے پاس ایک ہزار روپے ہی تھے۔ اس نے فوراً پوچھا، "ایک ہزار روپے میں کتنے گز زمین ملے گی؟"

سردار نے کہا، "زمین کے رقبے کا فیصلہ تمہاری اپنی مرضی سے ہوگا۔ تم جتنی بڑی زمین چاہو، لے سکتے ہو۔" یہ سن کر کسان حیران رہ گیا۔ زمین حاصل کرنے کا جو طریقہ کار اسے بتایا گیا وہ اسے بہت آسان اور سادہ لگا۔ طے یہ پایا کہ وہ اتنے ہی ایکڑ کا مالک بن سکتا ہے جتنے پردہ ایک دن میں اپنے پیروں پر چکر لگا کر وہاں آ سکے۔

یہ دوڑ طلوع آفتاب سے شروع ہوگی اور غروب آفتاب سے پہلے اسے وہاں اسی جگہ پہنچنا ہوگا جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ دوڑتے ہوئے اسے کچھ فاصلوں پر چھوٹا سا گڑھا کھودنا ہوگا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اس زمین پر دوڑ چکا تاکہ زمین کو ناپنے میں آسانی ہو۔ جتنا وسیع اس کی دوڑ کا دائرہ ہوتا اتنی ہی زمین اس کے نام کر دی جاتی۔

"لیکن..." سردار نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا، "یہ یاد رکھنا کہ تمہیں سورج غروب ہونے سے پہلے وہیں واپس پہنچنا ہوگا جہاں سے دوڑ شروع ہوئی تھی۔ دیر ہونے پر تمہارے پیسے اور زمین ضبط کر لی جائے گی۔"

پوہم نے یہ سن کر جلدی سے سر ہلادیا کیونکہ وہ تو ہر طرح سے دوڑ پر آمادہ تھا۔

دوسرے دن پوہم طلوع آفتاب سے کچھ دیر پہلے دوڑ شروع کرنے منتخب جگہ پر پہنچ گیا۔ باشکرز قبیلے کے لوگ بہت بڑی تعداد میں اپنے سردار کے ساتھ اس جگہ موجود تھے۔ پوہم نے نعرے گزردہندی بیلٹ میں ایک بڑی سی پانی کی بوتل اور ہاتھ میں کدال لے رکھا تھا۔ سارے مجمعے نے

بہت ہی والہانہ انداز میں نعرے لگا کر اسے رخصت کیا۔ پوہم پورے جوش و خروش سے دوڑ پر روانہ ہوا۔ وہ اپنے آپ کو بہت تروتازہ محسوس کر رہا تھا کیونکہ بھرپور نیند لے کر آیا تھا۔ مزید برآں آج سورج سے دوڑنا اسے بہت فرحت بخش محسوس ہوا۔ اسی لیے دوڑتے ہوئے اسے ٹھکن محسوس نہ ہوئی اور تیزی کے ساتھ گڑھے کھودتے وہ تین میل تک دوڑ گیا۔ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دھوپ کی تپش پوہم کو اپنی پیٹھ پر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اب پسینے میں شرابور تھا۔ وہ اپنے اندازے سے ہر میل پر اپنے نقش پا کی تصویر، چھوٹا سا گڑھا کھود دیتا۔ دوڑتے ہوئے اس کا دل اطمینان اور خوشی سے بھر رہا تھا۔

وہ خواب جو اس نے اپنی زندگی اور مستقبل بہتر بنانے کے لیے دیکھے تھے، سب سچ ہوتے نظر آنے لگے۔ پیروں کے نیچے زیر ہوتی زمین اس کے تابع ہو رہی تھی۔ زمین کی یہ تسخیر اس کے لیے نہایت توانائی بخش تجربہ تھا۔ جہاں وہ زمین میں گڑھا کھودنے رکنا وہیں بوتل اسے پانی نکال کر پی لیتا۔ یوں تازہ دم ہو کر پھر دوڑنے لگتا۔ ڈھلتے سورج کے ساتھ وہ اب کافی حد تک تھک چکا تھا۔

اس نے سورج کو غور سے دیکھا کہ جان سکے، کتنی دیر باقی ہے؟ اور فیصلہ کیا کہ اب اسے پلٹ جانا چاہیے، کیونکہ وہ زمین کا بڑا حصہ سر کر چکا تھا۔ اب شرط کے مطابق اسے اپنی زمین کا دائرہ مکمل کرنا تھا، لیکن سامنے اسے میٹھے پانی کا چشمہ نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ چشمہ بھی زمین میں شامل ہو جائے تو اس کی فصل سونا لگے گی۔ یہ سوچ کر اس نے واپسی کا ارادہ ترک کیا اور آگے دوڑ گیا۔ یوں وہ چشمہ بھی زمین میں شامل کر لیا۔

چشمے کے آگے کی زمین بڑی زرخیز تھی۔ پوہم نے جب وہ جگہ دیکھی جو گیہوں اگانے کے لیے بہترین تھی تو اس

نے نذر کا گیا اور وہ مزید دوڑنا گیا۔ آخر کار اس زمین کو بھی دوڑ کر سر کر لیا۔ اب سورج ڈھل کر کافی نیچے آچکا تھا۔ سامنے کا علاقہ دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ پوہم نے واپسی کی دوڑ لگا دی۔ اس کی سانس بار بار اکھڑ جاتی۔ وہ کچھ لمبے رک کر لمبی سانس لیتا، اپنی ہمت یکجا کرتا اور پھر دوڑنے لگتا۔

دوڑتے ہوئے اس نے بڑا فاصلہ طے کر ہی لیا۔ اب اسے پہاڑی پر کھڑے باشکرز قبیلے کے لوگ دھندلے سامنے کی مانند نظر آرہے تھے۔ وہ اس کی واپسی کے منتظر تھے مگر پوہم کے لیے قدم آگے بڑھانا مشکل سے مشکل تر ہو رہا تھا۔ اس کا سر بری طرح چکر رہا تھا۔ بہتے پسینے کی وجہ سے اسے سامنے دیکھنے میں شدید دقت کا سامنا تھا۔ سورج کی روشنی نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا پھر بھی اس کے قدم نہ رکے۔ وہ اپنی پوری قوت جمع کر کے تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا مگر ڈوبتا سورج اس سے کہیں تیزی سے دوڑتا اپنے پیچھے اندھیروں کے بادل گہرے کرتا آ رہا تھا۔ پوہم کو اب باشکرز قبیلے کے لوگوں کے نعروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ چلا چلا کر اس کا حوصلہ بلند کر رہے تھے۔ مگر افسوس پوہم میں اب چلنے کی سکت بھی نہ رہی اور وہ گر پڑا۔

آخر کار اس نے پھر اپنی ہمت جمع کی اور اپنے بازوؤں اور گھٹنوں کے بل بڑھنا شروع کیا۔ وہ کسی طرح بھی یہ زمین اور اپنی زندگی بھری کمانی گنوا نہ انہیں چاہتا تھا مگر وہ کچھ ہی دور ریگ سکا۔ اس کا سر زمین سے جا لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس نے اپنی طاقت، ہمت اور وقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ مایوسی کے اندھیروں میں لیپٹے پوہم کو باشکرز قبیلے کے لوگوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ نعرے لگا کر اسے اٹھنے کو کہہ رہے تھے۔ سورج تو غروب ہو چکا، یہ لوگ مجھے اب کیوں آوازیں دے رہے ہیں؟ پوہم نے لمحہ بھر کو سوچا

اور فوراً ہی اسے خیال آیا کہ وہ لوگ تو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں جہاں سے ڈوبتے سورج کا نظارہ ممکن ہوگا۔ یعنی ابھی کچھ لمحے باقی تھے۔ پوہم کے لیے یہ لحاظ بہت قیمتی تھے۔

اس کی زندگی بھری کمانی اور وسیع و عریض زمین اب کچھ ہی فاصلے پر منتظر تھی۔ اس نے جسم کے اندر بچی بچی طاقت کو یکجا کیا اور دوڑ لگا دی۔ آخر کار خطِ سرحد پار کر وہ سر کے بل سجدے کی صورت میں گر گیا۔ سردار نے، جو اس کا خیر مقدم کرنے قریب ہی کھڑا تھا، چیخ کر پوہم کو ساری زمین جیتنے کی نوید سنائی۔ وہ پوہم کی تعریف کے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی یہ شخص مضبوط جسم و جان اور ارادے کا مالک ثابت ہوا تھا۔ اس نے ایک بڑے رقبے کی زمین جیت لی تھی۔ باشکرز قبیلے کے لوگ بھی اچھل اچھل کر نعرے لگانے لگے۔ وہ پوہم کو اتنی بڑی زمین جیتنے پر مبارک باد دے رہے تھے۔

پوہم کے اندر اب اٹھنے کی سکت نہ تھی۔ وہ سر کے بل جوں کا توں پڑا تھا۔ آخر کار اسے سیدھا کیا گیا اور پانی پلانے کی کوشش کی گئی۔ یہ کیا... پانی پینا تو دور کی بات پوہم کے جسم نے ہلکی سی جنبش بھی نہ کی۔ فوراً اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی گئی، مگر وہاں بھی کوئی حرکت نہ تھی۔ یوں اس کی موت کی تصدیق ہو گئی۔ باشکرز قبیلے کے وہ لوگ جو مبارکباد کے نعرے بلند کر رہے تھے، اب صدائے افسوس بلند کرنے لگے:

"ہائے بچارا، اتنی بڑی زمین جیت کر بھی کچھ حاصل نہ کر پایا۔"

سردار نے اس کی قبر کھودنے کا حکم دیا۔ ایک آدمی نے اسی کدال سے اس کی قبر کھود ڈالی جس سے پوہم اپنی زمین کے نشان کھودتا رہا تھا۔ آخر کار پوہم کو لحد میں اتار دیا گیا، جو اس کے سر سے پیر تک صرف دو گز زمین پر محیط تھی۔ شاید اسے اتنی ہی زمین کی ضرورت تھی۔ ♦♦♦

گڈ مارنگ، شیک ہینڈ اور تھینک یو



ہماری ماؤں کے انداز تعلیم کا پوسٹ مارٹم

تعلیم و تربیت

سیماصدیقی

چھلک رہا ہے... دیکھو گرنے جانے... دیکھو سنبھل کر... لاؤ مجھے دے دو... تم نہیں لے جاسکتے۔"

اس قسم کی روک ٹوک سے واقعی بچے میں اعتماد بحال نہیں رہتا اور وہ ہمیشہ ہر کام میں ماں کی اعانت کا محتاج رہتا ہے۔ ماہرین نے اسی نوع کی روک ٹوک سے منع کیا ہے مگر ماؤں کو بچانے کیوں یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ماہرین نفسیات نے بچوں کی غلطیوں اور بدتمیزیوں پر بھی روکنے ٹوکنے سے منع کر دیا۔ حالانکہ اگر بچہ کسی کا گھلا دیا

رہا ہے یا کسی کے گھر تباہی کا ہر کارہ بن کر لوٹ مار مچا تا ہے تو بچے کو دو تھپڑ رسید کرنے پر دنیا کے کسی ماہر نفسیات کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

آج کل ماؤں کو بچوں کی نشوونما کی سخت فکر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بچوں کی نشوونما اس قدر ہو جاتی ہے کہ کچھ ہی دنوں میں ماں باپ پر چڑھ دوڑتے ہیں۔

ایک ماں کا کہنا تھا کہ میں نے بچوں کی تربیت سے متعلق ایک خصوصی کورس کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچے کو ابتدائی پانچ سال کی عمر تک مارنا نہیں چاہیے۔ (پانچ سال بعد بھی نہ مارے، کیونکہ پھر کوئی فائدہ نہیں۔ ساری عادتیں اب پختہ ہو چکی ہیں) لہذا فی الحال میں اپنے بچوں کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔

پانچ سال بعد جب ہماری ملاقات ہوئی تو اشتیاق سے پوچھا، ہاں بھئی! اب تو آپ نے بچوں کو مارنا شروع کر دیا ہوگا۔ وہ چھینپ کر بولیں، ارے کہاں! پانچ سال کی چھوٹ سے بچوں میں اتنا اعتماد پیدا ہو گیا کہ اب اپنے ابا کو مارنے

راتے ہیں۔ وہ بے چارے چھپتے پھرتے ہیں۔" ہم نے دیکھا کہ واقعی پانچ سال میں ان کے بچے جن لے بچے بن چکے تھے۔ ایسے ہی ایک باپ کو ہم نے سڑک پر دیکھا، ایک پیارے سے بچے کو ہٹا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے محسوس کیا کہ باپ بچے کو نہیں... بچے باپ کو ہٹا رہا ہے۔ کبھی کبھار کسی دکان پر تو کبھی کسی دکان پر والد صاحب بادل خواستہ بچے کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہے تھے۔

اسکول کے انتخاب کے سلسلے میں بھی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ یہ بھی اسٹیش سبل بن گیا ہے۔ اگر فلاں کے بچے فلاں اسکول میں پڑھتے ہیں تو میرا بچہ بھی وہیں پڑھے گا۔ (خواہ وہ کتنا فیل ہی ہوتا رہے) بقول بانو قدسیہ "آج کل ماہرین فیصلہ کرتی ہیں کہ سرکس کے یہ جو کس اسکول میں تربیت پائیں گے۔"

ماؤں کا یہ اصرار ہے کہ اگر پڑوس کا بچہ گرمیوں کی چھٹیوں میں "سرکیمپ" جائے گا تو میرا بچہ بھی جائے گا۔ نندیا یاد پورانی کا بچہ جم خانہ یا کرائے کلب کا ممبر ہے تو میرا بچہ بھی اس کا ممبر بنے گا۔ گویا تعلیم، صحت اور تربیت کی تمام تر ذمہ داری معاوضہ لینے والے کاروباری اداروں کے سر ڈال دی جاتی ہے۔ ماں کے پاس صرف ایک ہی کام رہ جاتا ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے، اپنے بچوں پر فخر کرتی رہے۔

چاہے بچے بڑوں کو منہ چڑائے، گالیاں دے، ٹھو کے یا گھونے مارے، ماں ایسی ہر حرکت کو بچے کی ادا سمجھ کر مسکرا دیتی ہے۔ خوش ہوتی ہے کہ بچہ اتنے سارے لوگوں میں اعتماد سے "گفتگو" کر رہا ہے۔ ایک صاحبہ محفل میں وارد ہو کر بڑے ناز سے بچے سے مخاطب ہوئیں:

"مائیل بیٹا! آگنی کو سلام کیجیے... شاہاش گڈ بوائے!" "گڈ بوائے" انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ "یہاں اتنی ساری ڈراؤنی چیزیں بیٹھی ہیں، ان میں سے کس کو سلام کروں؟"

پوری محفل پہ سناٹا چھا گیا۔ آنٹیوں کے چہروں پہ

ناگواری و خفس کے آثار دیکھتے ہوئے ماں سٹپٹا کر بولی، "ارے جانو! یہ آپ کیا "بیڈ لیگنوج" استعمال کر رہے ہیں...!" پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر بولی "در اصل ان کے اسکول میں کچھ بچے بیڈ لیگنوج یوز کرتے ہیں۔ پرنسپل نے کہا ہے کہ ہم نے انہیں وائج کر لیا ہے۔"

"کیا...!!" حاضرین میں سے ایک خاتون بوکھلا اٹھیں "کیا انھوں نے نائل کو پکڑ لیا؟"

ماں منہ پور کر بولیں "جی نہیں! انھوں نے ان بچوں کو پکڑ لیا جو نائل کو خراب کر رہے تھے۔"

مسئلہ یہ ہے کہ آج ہر ماں کو یہ وہم ہے کہ دوسرے بچے ان کے بچے کو خراب کر رہے ہیں۔ حالانکہ بچوں کو بدتمیز بنانے کے لیے ان کی ماں ہی کافی ہے۔

ایک صاحبہ اپنے بچے کے ساتھ ہمارے گھر آئیں۔ بچے نے صحن سے ماں کو آواز دی، "ممی! ادیکھیں... کبوتر بیٹھا ہے!"

ماں نے ایک چیخ ماری اور بچے کو تنبیہ کرتے ہوئے بولیں "کبوتر نہیں بیٹا! پیجن (Pigeon)... پیجن ہے یہ!!"

ایسا محسوس ہوا گویا کبوتر کو کبوتر کہہ دینے سے نہ صرف بیچارے جانور بلکہ ماں کے دل کو بھی ٹھیس پہنچی ہے۔ یہ بات تو بچے اسکول میں سیکھ ہی لیتے ہیں کہ پرندوں کے انگریزی نام کیا ہیں۔ ماں نہ بھی سکھائے تو کوئی بات نہیں۔

ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ آج کل ماؤں کی اکثریت تہذیب محض اسی کو سمجھتی ہے کہ بچہ مہمانوں سے "فیک پیئڈ" کرے، "گڈ مارنگ" کہے یا "سوری" اور "تھینک" یو کا پھاڑا پڑھتا رہے... بچے کے اندر شرم ساری یا شکر گزاری کے حقیقی احساسات پیدا کرنے کے بجائے انھیں رٹو ٹوٹا بنا دیا جاتا ہے۔ بچہ سوری یا تھینک

یو اس طرح کہتا ہے گویا لٹھ مار رہا ہو۔ مہمانوں کی آمد پر ماں کی توجہ مہمان کے بجائے اپنے بچے پر مرکوز رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا والدین پہلی بار اپنے بچے سے ملے ہوں۔

"ارے...!! اکل سے شیک پیئڈ نہیں کیا!" بچہ شیک



عورت کا گھر کون سا

ایک سے دوسرے گھر سفر سفر
رہنے والی اُداس لڑکی کی کہانی

چکی تھی اور آدھے گھنٹے بعد سارہ کو رخصت ہو جانا تھا۔ رخصتی کے وقت سارہ نے باپ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ باپ کے قریب آتے ہی سارہ باپ کے گلے لگ کر رونے لگی۔

”آج کے بعد تمہارا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں۔ اب

عروسی لباس میں ملبوس سارہ شہزادی سے کم نہیں لگتی تھی۔

مگر ایک خوف اُسے ارد گرد کے ہنگامے اور شور شرابے سے بے خبر رکھے ہوئے تھا۔ بیٹیاں باپ کے گھر سے

رخصت ہونے پر افسردہ ہوتی ہیں مگر سارہ اسی

کشش کا شکار تھی کہ باپ اُسے کیسے

رخصت کرے گا؟ وجہ یہ کہ وہ باپ کی

شفقت سے محروم تھی۔

سارہ کی پیدائش پر آصف علی

ماتم زورہ بن گیا، کیونکہ وہ بیٹے کا

نوازش مند تھا۔ تب سے اُس نے

سارہ کو ایک بار بھی جی بھر کر نہ

دیکھا۔ سارہ تیسرے نمبر پر سب سے

چھوٹی بہن تھی۔ اب شادی اس کی

پسند سے ہو رہی تھی۔ صائم یونیورسٹی

میں سارہ کا ہم جماعت تھا۔

جییز تو دور باپ نے نکاح تک

دینے سے انکار کر دیا مگر ماں نے

تین، چار جوڑے بنا رکھے تھے جو

اسے مل گئے۔ سارہ کی بڑی خواہش

تھی کہ ایک بار باپ اسے اپنے سینے

سے لگا لے۔ اس کی نظریں باپ کو

تلاش کر رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح

آج بھی اس کی یہ خواہش حسرت بن کر دل میں جی رہ گئی۔

جب وہ ہر سال کلاس میں اول پوزیشن لے کر آتی تب بھی

بہی تنہا دل میں لیے باپ کے پاس جاتی کہ شاید وہ بھی اُس کی خوشی

میں شریک ہو جائے مگر تیسری بار بھی بیٹا نہ ہونے پر آصف علی

کے دل میں سارہ کے لیے ایک باپ کی محبت دم توڑ چکی تھی۔

آج بھی وہ گم سم بیٹی باپ کی راہ تک رہی تھی۔ بارات آ

ماؤں کی تسکین نہیں ہوتی۔ ان دواؤں سے چھینکیں تو بند ہو جاتی ہیں مگر ان کے ضمنی اثرات (سائیڈ افیکٹس) سے نئی بیماریوں کا راستہ کھل جاتا ہے اور بیماریوں اور علاج کا یہ سلسلہ ماں کی تشویش کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ بڑوں کے سامنے چوہنگ چبانا، سگریٹ پینا، ٹانگیں ہلانا، ان کی جانب بیٹھنا، بحث کرنا، قطع کلامی کرنا یا اونچی آواز سے بولنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا، مگر آج کل ایسا نہیں۔ بڑوں اور بچوں کے درمیان سارا ادب لحاظ رہیت کی دیوار ثابت ہوتا ہے۔

آج کل والدین ”جنریشن گیپ“ ختم کرنے کا نعرہ لگاتے اور بچوں سے دوستانہ پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بچے انہیں نہایت بے تکلفی سے گالیاں دیتے ہیں۔ بچوں سے تعلقات میں ”میانہ روی“ ہی سب سے بہتر پالیسی ہے۔ جہاں نرمی سے کام چل سکتا ہو وہاں نرمی اور جہاں سختی کی ضرورت ہو وہاں سختی ضروری ہے۔ یہ کی ماڈرن مائیں جب کسی کے گھر بطور مہمان جاتی ہیں تو ان کے بچے تباہی کا ہر کارہ بن کر سارے گھر میں پھیل جاتے ہیں۔ ایسے میں مائیں اتنی بے تعلق ہوتی ہیں جیسے یہ کسی اور کے بچے ہوں اور ان کے ساتھ نہ آئے ہوں۔ میزبان کا بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ وہ دوبارہ لگا کر بچے کا دماغ درست کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو بچے والدین کی مار نہیں سہتے انہیں زمانے کی مار کھانی پڑتی ہے۔ جنہیں والدین نہیں سکھاتے انہیں زمانہ سکھاتا ہے۔ بچے کی بدتمیزی کوئی جائزہ نہیں دیتا۔ دل خال تو برداشت کر سکتی ہے مگر دوسرے نہیں۔ جب بچہ عمری زندگی میں قدم رکھتا ہے تو دوسروں کے رحم و کرم پہ ہوتا ہے۔ ماں کے بے جالاؤ پیرانے اس کی شخصیت میں جو بگاڑ پیدا کر دیا ہوتا ہے، اس کے باعث بچے کو شدید شواہیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کی مدد کرنے، خامیوں پر پردہ ڈالنے اور حمایت کرنے کے لیے ماں ہر وقت اور ہر جگہ ساتھ نہیں ہوتی۔

ہینڈ کرلے تو ماں کو قرار آ جاتا ہے۔ اس کے بعد بے شک بچہ مہمان کو تنگ کرتا رہے۔ اگر بچہ طالب علم بھی ہے تو ماں مستقل فرمائشی پروگرام جاری رکھتی ہے:

”بیٹا اکل کو کتنی سناؤ؟“

اگر بچے کو ہزار تک لگتی یاد ہو تو مہمان بے چارے کی شامت آ جاتی ہے اور وہ نو دو گیارہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کل والدین بچے کی ہر فرمائش پوری کرنے کے لیے سر کے بل تیار رہتے ہیں، جبکہ بچے کو ”نا“ سننے کی عادت ہوئی چاہیے۔ اسے سمجھانا چاہیے کہ کچھ چیزیں ہم دے سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔ زندگی میں بھی ہر ایک کو ہر نعمت میسر نہیں ہوتی تو پھر اس کے لیے بچے کو ذہنی طور پر تیار کیوں نہ کر دیا جائے؟

مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط، کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری! اس کا فیصلہ ماں باپ نہیں... بچے کرتے ہیں۔ پہلے والدین بچے کو اگلی پکڑ کر چلنا سکھاتے تھے۔ آج کل بچے والدین کو انگلیوں پر بچاتے ہیں۔ مائیں بچوں کے تھرماس میں کولڈ ڈرنک جیسی مضر صحت شے بھر کر دیتی اور کہتی ہیں ”ہمارا بچہ تو بڑا فخرے والا ہے، پانی کی جگہ کولڈ ڈرنک پیتا ہے۔“

نئے نئے بچوں کی ”خند“ کے آگے گھٹن ٹیک کر انہیں مہنگے موبائل دلا دیے جاتے ہیں۔ والدین فخر یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ تو ہم سے زیادہ ”شارپ“ ہے، ساری ویڈیو کھول لیتا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل کے مضر اثرات کی وجہ سے اب مغربی دنیا میں بھی بچوں سے انہیں دور رکھنے کے قوانین پاس ہو رہے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ مغربی تہذیب سے مغرب ہو کر بچے کو انٹرنیٹ، جنک فوڈ اور کولڈ ڈرنکس کے استعمال سے روک نہیں پاتے کہ کہیں لوگ ہمیں دقیانوسی نہ سمجھیں۔

بچے کے پیٹ میں معمولی درد ہو یا چھینک آ جائے تو مائیں فوراً اسپتال اسپتال کو دکھانے لے جاتی ہیں جو اپنی بائیونک دوائیں دے دے کر ان کا معدہ چوہٹ کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر بھی کیا کرے... جب تک وہ تین چار دوائیں نہ لکھے

وہ ہی تمہارا گھر ہے۔“

باپ کی تلخ باتیں سن کر سارہ ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے سارے خواب آئینے کی طرح چکنا چور ہو گئے۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتی اپنے گھر سے رخصت ہوتی جواب اس کے لیے ابھری بن چکا تھا۔

☆☆

سارہ اپنے کمرے میں بیٹھی باپ کی تلخ باتیں یاد کر کے رو رہی تھی کہ اچانک صائم کمرے میں داخل ہوا۔ شوہر کو دیکھتے ہی سارہ نے اپنے آنسو پونچھے۔ وہ سارہ کے سارے حالات سے لاعلم تھا، کیونکہ سارہ ایک مضبوط لڑکی تھی اور وہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی بھی اس پر زور نہ کھائے۔ صائم مسکرا کر سارہ کو دیکھ رہا تھا۔

”صائم! کیا آپ کو بھی پتا چاہیے؟“ نئی نوپلی دلہن کی بات سن کر شوہر نے چونک کر اسے دیکھا ”بتائیں نا صائم؟“

”اولاد اللہ کی رحمت ہوتی ہے، چاہے بیٹا ہو یا بیٹی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ صائم کی بات سن کر سارہ جیسے اپنے تمام غم بھول گئی اور اسے دیکھ کر مسکرائے لگی۔

اگلی رات دونوں میاں بیوی ہنستے مسکراتے ناشے کی میز پر آئے۔

”ہو تمہارے گھر سے ابھی تک ناشتہ نہیں آیا۔“ آسیہ بیگم کی بات سنتے ہی سارہ کی مسکراہٹ حیرت میں بدل گئی۔

”اوہ ہوائی؟ اب یہ کون سی نئی رسم ہے؟“ صائم نے پوچھا۔

”بیٹا! یہ تو برسوں سے چلتا آ رہا ہے کہ بھوکا پہلا کھانا اس کے میکے سے آتا ہے۔“ بیٹے کی بات سن کر آسیہ جھٹ سے بولی۔

سارہ جانتی تھی کہ ناشا لانا تو دور کی بات، ماں باپ نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔

”ہو سکتا ہے امی کہ سارہ کے گھر والوں کو اس رسم کا پتہ ہی نہ ہو؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پتا نہ ہو۔ کیوں سارہ کیا تمہارے گھر والوں کو نہیں علم کہ بیٹی کا پہلا ناشا میکے سے جاتا ہے؟“

پتا نہیں آئی۔۔۔ آسیہ بیگم کی بات سن کر سارہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

”اچھا امی چھوڑیں، آپ ناشا لگوائیں۔“ صائم نے کہا۔

”سنا تھا کہ بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں۔ تمہیں دیکھ کر آج یقین ہو گیا۔“

ساس کی بات سن کر سارہ کی آنکھوں میں پانی اتر آیا مگر وہ ضبط کر گئی۔ ناشا کرنے کے بعد وہ برتن سمیٹ رہی تھی کہ اچانک پلیٹ ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو گئی۔

”بات سن لو لڑکی۔ یہ سب چیزیں تم جہیز میں نہیں لائیں جو اس طرح توڑ رہی ہو۔ میں نے بڑی مشکل یہ چیزیں بنائی ہیں۔ تمہارے باپ نے تو تمہیں ایک تنکا بھی نہیں دیا، بس اپنے سر کا بوجھ ہمارے کندھوں پر لا دیا۔“

”امی یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔“ ماں کی تلخ باتیں سن کر صائم ایک دم سے بولا۔

”تم سمجھا دو اپنی بیوی کو یہاں بے پروائیاں نہیں چلیں گی۔ اس گھر میں میرے اصولوں کے مطابق رہنا ہوگا۔“

یہ کہہ کر آسیہ بیگم وہاں سے چلی گئی۔

”کوئی بات نہیں صائم۔ غلطی میری تھی، مجھے احتیاط کرنی چاہیے تھی۔“ شوہر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی سارہ نے اپنی غلطی قبول کر لی۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آسیہ بیگم کے لہجے کی تبدیلی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

ایک دن وہ بیٹے سے کہنے لگیں:

”بیٹا اب میں چاہتی ہوں کہ تمہاری اولاد ہو جائے۔ اس گھر میں بچوں کی آوازیں گونجیں۔“

ماں کی بات سن کر صائم مسکرائے لگا۔

”کیا عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا؟ پہلے باپ اور شادی

کے بعد اسے ساس کے گھر رہنا پڑتا ہے؟ کھانا بناتے ہوئے سارہ بھی کچھ سوچ رہی تھی کہ اچانک گر پڑی۔ اس کی ٹانگ سن کر صائم دوڑ کر وہاں پہنچا اور بیوی کو سہارا دیا۔

☆☆

”مبارک ہو آپ باپ بننے والے ہیں۔“ ایک لیڈی ڈاکٹر نے سارہ کا معائنہ کرنے کے بعد صائم کو بتایا۔

آسیہ یہ خبر سن کر بہت خوش تھی۔ ”صائم، مجھے تو بیٹا چاہیے۔“

آسیہ بیگم کی بات سن کر سارہ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”اگر بیٹی ہو گئی تو...؟“

”نہیں مجھے تو بیٹا ہی چاہیے۔“ صائم کی بات سن کر آسیہ بیگم نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

”صائم! آپ نے تو کہا تھا کہ اولاد اللہ کی رحمت ہوتی ہے چاہے بیٹا ہو یا بیٹی۔“ ساس رخصت ہوتی، تو سارہ نے شوہر سے کہا۔

”ہاں کہا تو تھا مگر سچ پوچھو تو مجھے خود بیٹے بہت پسند ہیں۔“

شوہر کی بات سن کر سارہ نے حیرت سے صائم کی طرف دیکھا۔ وہ دھکی دل سے سوچنے لگی، اگر بیٹی ہو گئی تو کیا اس کے ساتھ بھی وہ ہی سب کچھ ہوگا جو میرے ساتھ ہوا؟ کیا وہ بھی باپ کی شفقت سے محروم رہے گی؟

اسی غم کو سارہ نے دل سے لگا لیا کہ اگر بیٹی ہوئی تو کیا وہ بھی صائم کی محبت نہیں پاسکے گی؟ اب وہ ایک اور سارہ کو جنم نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہی سب کچھ اس کی اولاد کے ساتھ بھی ہو۔ اس غم نے سارہ کو مزید کمزور کر دیا۔

ایک دن باورچی خانے میں کام کرتے کرتے سارہ کی طبیعت خراب ہوئی تو اسے اسپتال لے جایا گیا۔ اسپتال

سارہ کو مزید کمزور کر دیا۔

ایک دن باورچی خانے میں کام کرتے کرتے سارہ کی طبیعت خراب ہوئی تو اسے اسپتال لے جایا گیا۔ اسپتال

سارہ کو مزید کمزور کر دیا۔

میں صائم اور آسیہ بیگم سارہ اور بچے کی صحت یابی کی دعائیں کر رہے تھے۔ ”مریضہ کو خون کی ضرورت ہے۔“ ایک نرس نے آکر بتایا۔

سارہ کے خون کا گروپ او نیگیٹو تھا۔ نرس کی بات سنتے ہی صائم خون کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد نرس ایک بچہ گود میں اٹھا کر باہر آئی اور بولی ”مبارک ہو، بیٹا ہوا ہے۔“

آسیہ بیگم نے خوشی سے لڑکے کو گود میں اٹھا لیا۔ اسی وقت ڈاکٹر نے بتایا ”ماں کی جان کو خطرہ ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے خون کا بندوبست کریں۔“

سارہ کی حالت خراب تھی مگر اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ ایک بار وہ اپنے باپ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اُسے کس قصور کی بنا پر پردار مجت و شفقت سے محروم رکھا گیا۔

”سارہ... اچانک اسے وہ آواز سنائی دی جسے سننے کے لیے وہ بچپن سے ترپ رہی تھی۔“ آنکھیں کھولو بیٹا۔ میں ہوں تمہارا باپ۔ مجھ سے بات کرو۔“

وہ بات کرنا چاہتی تھی مگر بس تھی۔ سارہ نے ہمت کر کے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں تو سامنے باپ کو کھڑا دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔ آصف علی کی آنکھیں شرمندگی سے مٹھیں۔ سارہ کی آنکھیں زیادہ دیر کھلی نہ رہ سکیں۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے پرسکون نیند سونا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر فخر تھا اور اطمینان کہ باپ کو اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا تھا۔

”آنکھیں کھولو سارہ... اپنے بیٹے کو تو دیکھو۔۔۔“

صائم نے روتے ہوئے کہا مگر سارہ بہت دور جا چکی تھی۔ ان سب رشتوں سے دور ایک نئی دنیا میں! ◆◆◆

”جہنمی عورت“ ایک ایسی عورت کی کہانی جو آپ کی آنکھوں کے گوشے غم کر دے گی۔ صفحہ نمبر ۲۲۹

اپریل ۲۰۱۸ء

۱۶۹ اردو ڈائجسٹ

اپریل ۲۰۱۸ء

۱۶۸ اردو ڈائجسٹ

اپریل ۲۰۱۸ء

۱۶۷ اردو ڈائجسٹ

بشری شیریں اردو بینہ کوکب

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

دور و نزدیک سے اٹھتا نہیں شور زنجیر
اور صحرا میں کوئی نقش کف پا بھی نہیں

گل بہر رنگ تبسم کا گنہ گار رہا!
زخم ہستی کا سوا اس کے مداوا بھی نہیں

کون سا موڑ ہے، کیوں پاؤں پکڑتی ہے زمیں
اس کی بستی بھی نہیں، کوئی پکارا بھی نہیں

بے نیازی سے بھی قریہ جاں سے گزرے
دیکھتا کوئی نہیں ہے کہ تماشا بھی نہیں

وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

پروین شاکر

جستجو کھوئے ہوؤں کی عمر بھر کرتے رہے
چاند کے ہمراہ ہم ہر شب سفر کرتے رہے

راستوں کا علم تھا ہم کو نہ سمتوں کی خبر
شہر نا معلوم کی چاہت مگر کرتے رہے

ہم نے خود سے بھی چھپایا اور سارے شہر کو
تیرے جانے کی خبر دیوار و در کرتے رہے

جستجو
کھوئے
ہوؤں کی!



نامور شعرا کی دل منروز
عزروں کا جامع انتخاب

احمد مشاق

مل ہی جائے گا کبھی دل کو یقین رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

جس کی سانسوں سے مچکتے تھے در و بام ترے
اے مکان بول! کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے

روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ ٹھگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

دل فردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسین رہتا ہے

اسلم انصاری

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا بے دل نے بھلایا بھی نہیں

وہ نہ آئے گا ہمیں معلوم تھا، اس شام بھی
انتظار اس کا مگر کچھ سوچ کر کرتے رہے

آج آیا ہے ہمیں بھی ان اڑانوں کا خیال
جن کو تیرے زعم میں، بے بال و پر کرتے رہے

فاطمہ غزنوی

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یار نے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

گری محفل فقط اک نعرہ مستانہ ہے
اور وہ خوش ہیں کہ اس محفل سے دیوانے گئے

میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے، اس گلی میں میرے افسانے گئے

یوں تو میری رگ جاں سے بھی تھے نزدیک تر
آنسوؤں کی ڈھند میں لیکن نہ پہچانے گئے

وحشتیں کچھ اس طرح اپنا مقدر ہو گئیں
ہم جہاں پہنچے، ہمارے ساتھ دیرانے گئے

اب بھی ان یادوں کی خوشبو ذہن میں محفوظ ہے
بار بار ہم جن سے گلزاروں کو مہکانے گئے

کیا قیامت ہے کہ خاطر کشتہ شب بھی تھے ہم
صبح آئی تو بھی مجرم ہم ہی گردانے گئے

ریاض مجید

وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ، مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے

اس سے کب دیکھی گئی تھی میرے رخ کی مردنی
پھیر لیتا تھا وہ منہ، مجھ کو دوا دیتے ہوئے

خواب بے تعبیری سوچیں مرے کس کام کی؟
سوچتا اتنا تو وہ دست عطا دیتے ہوئے

بے زبانی بخش دی خود احتسابی نے مجھ
ہونٹ سل جاتے ہیں دنیا کو گلہ دیتے ہوئے

اپنی رہ مسدود کر دے گا یہی بڑھتا نجوم
یہ نہ سوچا ہر کسی کو راستہ دیتے ہوئے

آپ اپنے قتل میں شامل تھا میں مقتول شوق
یہ کھلا مجھ پر، طلب کا خوں بہا دیتے ہوئے

وہ ہمیں جب تک نظر آتا رہا، نکتے رہے
گیلی آنکھوں، اکھرے لفظوں سے دعا دیتے ہوئے

جانے کس دہشت کا سایہ اس کو مہربا ہوا
ڈر رہا ہے وہ مجھے کھل کر صدا دیتے ہوئے

بے اماں تھا آپ لیکن معجزہ ہے یہ ریاض
بالہ شفقت تھا اس کو آسرا دیتے ہوئے

ساحر لدھیانوی

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں غلوت میں
کہ اب تک کس تنہا کے سہارے پی لیا میں نے

انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسین خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامن دل چھوڑ دو بیکار امیدو
بہت دکھ سہ لے میں نے بہت دن جی لیا میں نے



کلیب جلالی

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے، پس دیوار گرے

ایسی دہشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی
آنکھ جھپکی بھی نہیں، ہاتھ سے پتوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گردوں
جس طرح سایہ دیوار پہ دیوار گرے

تیرگی چھوڑ گئے دل میں اجالے کے خطوط
یہ ستارے مرے گھر ٹوٹ کے بے کار گرے

کیا ہوا ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی تھی
کیوں مجھے ڈھال بنانے کو یہ چھتار گرے

دیکھ کر اپنے در و بام، لرز جاتا ہوں
میرے ہسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ یہ لنگی ہوئی تلوار گرے

ہم سے کلرا گئی خود بڑھ کے اندھیرے کی چٹان
ہم سنبھل کر جو بہت چلتے تھے، نا چار گرے

ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا
ہائے کس موڑ پہ خوابوں کے پرستار گرے

وہ تجلی کی شعاعیں تھیں کہ چلتے ہوئے تیر
آئینے ٹوٹ گئے، آئینہ بردار گرے

دیکھتے کیوں ہو کھلیب اتنی بلندی کی طرف
نہ اٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے



غزل

جو فرض عین ہو، پہلے وہ کام کر لینا
خلوص دل سے کیا ہو اعلان، عام کر لینا

ہے دل یہ مائل کہیں ایسا تو نہیں
چھپا رہے یونہی دل میں، سلام کر لینا

رہبر نہ مل سکا نہ دلبر ملا ہمیں
مل جائیں دونوں خود اپنا ہی انعام کر لینا

نہیں گل کی صورت تو کیا کرے کوئی
جو ہیں خار کی صورت تو غلام کر لینا

نہ ہو گا کچھ حاصل بھنور سی ہے دنیا
ہوا کے رخ پر حاصل اپنا مقام کر لینا

نہ آئیں گے لٹی بس انتظار باقی ہے
ہے یہ بھی فرض عین صبح سے شام کر لینا

نقی صنیع نقی امروہوی

مجید امجد

برس گیا بہ خرابات آرزو، ترا غم
قدح قدح تری یادیں، سب سب تو ترا غم

ترے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم

غبار رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن تری دھن
گرفتہ سنگ میں بل کھاتی آب بجو ترا غم

ندی پہ چاند کا پر تو، ترا نشان قدم
خط سحر پہ اندھیروں کا رقص، ٹو، ترا غم

خیل زینت کی چھاؤں میں نے بلب تری یاد
فصل دل کے گلے پر ستارہ جو، ترا غم

طلوع مہر، شگفت، سحر، سیاہی شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم

گلہ اٹھی تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھپکی، تو مرے دل کے روبرو، ترا غم



منیر نیازی

اشک رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

لائی ہے اب اڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رت کا تہر ہے اور ہم ہیں دوستو

شام الم ڈھلی تو چلی درد کی ہوا
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

پھرتے ہیں مثل موج ہوا شہر شہر میں
آوازیں کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی ڈھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو



ناصر کاظمی

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانہ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کی ہے ابھی

یاد کے بے نشان جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھے کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی





رنگ برنگ کہاوٹیں

دلچسپ واقعات جنہوں نے کہا توں کو جسم نہ دیا

ہماری قوی زبان کا دامن دلچسپ و مزیدار کہاوٹوں سے مالا مال ہے۔ یہ کہاوٹیں اپنی تاریخ رشتی ہیں۔ مشہور کہاوٹوں کی داستان آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بخشش بلی، چوہا لٹڈ ورائی بھلا

لٹڈ ورائی یعنی بغیر دم کے۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک بلی نے ایک چوہے پر لپک کر حملہ کیا۔ چوہا بھاگ کر اپنے بل میں گھس گیا لیکن اس کی دم بلی کے پنجوں میں کٹ کر رہ گئی۔ بلی نے چا پلو سی سے کام نہ کالنا چاہا اور چوہے سے بولی ”مسیاں چوہے! تم باہر آ جاؤ تو ہم دونوں مل کر کھیلیں گے اور تم اپنی دم بھی مجھ سے لے لینا۔“

چوہا اس کی چال سمجھ گیا۔ اس نے بلی کو جواب دیا ”بخشش بلی، چوہا لٹڈ ورائی جی لے گا۔“ اگر کسی کام میں معمولی سی کمی رہ جائے تو کام کی تکمیل کی خاطر بڑا خطرہ مول لینے کی سفارش

یا تنبیہ پر یہ کہاوٹ کہی جاتی ہے۔
بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا
ڈھنڈورا یعنی مسلسل ڈھولک بجانا۔
پرانے زمانے میں جب نئی وی،
لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کچھ نہیں تھا تو شہر کے
لوگوں کو ڈھنڈورے کے ذریعے
سرکاری خبریں پہنچائی جاتی تھیں۔
ڈھنڈو چاچوہا ہے پر پیٹا جاتا تھا اور
لوگ جمع ہو کر ڈھنڈورچی سے
سرکاری اعلان سن لیا کرتے۔ جب
کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو لیکن
اس کی تلاش چاروں طرف زور و شور
سے کی جا رہی ہو تو یہ کہاوٹ بولی

جاتی ہے۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا

جب گھروں میں ریفریجریز نہیں ہوتے تھے تو باورچی خانے کی چھت سے عوامری لٹکی رہتی جس کو ”چھینکا“ کہتے تھے۔ رات کو دودھ یا سالن کی ہانڈی اس میں رکھ دی جاتی۔ اس طرح ایک ٹکلی میں دواں رہنے سے چیز کے خراب ہونے کا امکان کم ہو جاتا اور دوسرے وہ چوہوں اور بلی کی دمترس سے بھی بچ جاتی۔ بلی کے بھاگوں یعنی قسمت سے اگر چھینکا ٹوٹ جائے تو گویا بلی کی خوش قسمتی ہوئی۔ چنانچہ اگر کسی شخص کی خوش قسمتی سے کوئی ان ہونی بات اس کے حق میں ہو جائے تو یہ کہاوٹ بولی جاتی ہے۔

بلی پہلے دن ہی ماری جاتی ہے

یعنی جھگڑے یا فساد کے اسناد کی منکر اول روز ہی کی جاتی ہے۔ دیر ہو جائے تو معاملہ ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔ اس

کہاوٹ سے ایک قصہ منسوب ہے۔ دو بھائیوں کی ساتھ ساتھ شادی ہوئی۔ کچھ دن بعد دیکھا گیا کہ چھوٹے بھائی کی بیوی تو نہایت فرمانبردار اور خدمت گزار ہے لیکن بڑے بھائی کی نہایت تک چڑھی اور جھگڑا لوہے۔ اس نے شوہر کی جان بلیق میں ڈال رکھی ہے۔ ایک دن بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی سے پوچھا ”کیا بات ہے کہ تمہاری بیوی ایسی خاموش اور نیک بخت ہے جب کہ میری ایسی ناکارہ اور بدزبان؟“

چھوٹے بھائی نے کہا ”بھائی صاحب! شادی کے بعد جب میں حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو اسی وقت کہیں سے ایک بلی کمرے میں گھس آئی قریب ہی کونے میں ایک ڈنڈا رکھا ہوا تھا۔ میں نے انتہائی غضب ناک ہو کر ڈنڈا گھما کر جو بلی کو رسید کیا تو وہ وہیں جاں بحق ہو گئی۔ بیوی کے دل پر میرے غصے کی دہشت ایسی پیشی کہ وہ اب کسی بات پر مجھ سے اختلاف نہیں کرتی۔“

بڑے بھائی نے یہ باتیں غور سے سنیں۔ اسی رات جب وہ اپنے کمرے میں گیا تو اتفاق سے بیوی کی پالتو بلی وہاں گھس آئی۔ اُس نے کونے میں کھڑا ایک ڈنڈا اٹھا کر بلی کو ایسا رسید کیا کہ وہ وہیں گر کر مر گئی۔ یہ دیکھ کر بیوی کو غصہ آ گیا اور اُس نے اپنے خاوند کی اچھی خاصی حرمت کر ڈالی۔ دوسرے دن بڑے بھائی نے چھوٹے سے کہا کہ اُس کا بتایا ہوا نسخہ تو کسی کام نہ آیا۔ چھوٹے بھائی نے مسکرا کر کہا ”بھائی صاحب! بلی پہلے ہی روز ماری جاتی ہے!“ محل استعمال کا اسی سے قیاس کر لیجیے۔

بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھ گا

اس کہاوٹ کے ساتھ ایک قصہ منسوب ہے۔ ایک بلی مستقل چوہوں کا شکار کیے جا رہی تھی۔ چوہوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ آخر سب سر جوڑ کر بیٹھے۔ ایک چوہے نے تجویز پیش کی کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ دی جائے تو اس کے آنے کی فن ٹن ٹن کر چوہے بھاگ کر اپنی جان بچا سکیں گے۔ تجویز کو سب نے بہت پسند کیا۔ اتنے میں ایک چوہے نے پوچھا

”لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ گے گا کون؟“

یہ سن کر چاروں جانب سناٹا چھا گیا۔ گویا کسی مشکل کا حل تجویز کرنا جس قدر آسان ہوتا ہے اسی قدر اس پر عمل درآمد دشوار بلکہ ناممکن ہو سکتا ہے۔ دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ تجویز کے ہر پہلو پر غور کر کے، پھر اس کو پیش کیا جائے۔

بندر بانٹ کرنا

یعنی دو اشخاص کے درمیان کسی شے کی ایسی تقسیم کرنا جس سے فریقین کو تو کچھ نہ ملے لیکن تقسیم کرنے والا سارا مال ہڑپ لے۔ اس کہاوٹ سے ایک کہانی منسوب ہے۔ ایک بار دو کوؤں کو ایک روٹی مل گئی اور اس کی تقسیم پر ان میں جھگڑا ہونے لگا۔ وہ دونوں ایک بندر کے پاس روٹی کی تقسیم کے لیے گئے۔ بندر نے روٹی کے دو ٹکڑے کیے لیکن ایک ٹکڑے نے کہا کہ اُس کا ٹکڑا دوسرے کے ٹکڑے سے چھوٹا ہے۔ اس پر بندر نے دوسرے ٹکڑے سے ایک ٹکڑا کاٹ کر کھا لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے اب وہ ٹکڑا پہلے ٹکڑے سے چھوٹا ہو گیا۔ کوؤں نے پھر شکایت کی تو بندر نے پھر بڑے ٹکڑے میں سے ایک ٹکڑا کتر کھا لیا جس سے پہلا ٹکڑا چھوٹا ہوا گیا۔ کوئے شکایت کرتے رہے اور بندر روٹی کھا تا رہا یہاں تک کہ آخر میں بندر کے پاس روٹی کا نہایت چھوٹا سا ٹکڑا رہ گیا۔ اس نے کہا ”اب یہ تو اتنا چھوٹا ہو گیا ہے کہ اس کے دو ٹکڑے ہو ہی نہیں سکتے۔“ یہ کہہ کر اُس نے وہ آخری ٹکڑا بھی منہ میں رکھ لیا اور کوئے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ اسی کو ”بندر بانٹ“ کہتے ہیں۔

بہت میٹھی کھیر ہے

قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک اندھے سے پوچھا ”کھیر کھاؤ گے؟“ اُس نے جواباً پوچھا ”کھیر کیا ہوتی ہے؟“ اُس شخص نے کہا کہ ”حلوے کی طرح میٹھی اور رنگ میں سفید۔“ اندھے نے دریافت کیا کہ ”سفید کا کیا مطلب ہے؟“ اُس شخص نے کہا ”جیسے بگلا۔“ اندھے آدمی نے حیرانی

ڈاکٹر اپنے پیچھے دس ہزار ڈالر کا قرضہ اور ایک بچہ چھوڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر کی بیوی، گیری جیکبس باڈجیران و پریشان تھی کہ اب وہ کیا کرے؟ اسے کسی قسم کی تجارت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ تو فقط گھریلو زندگی سے واقف تھی۔ اسے گھریلو کام کاج کیے بھی عرصہ گزر چکا تھا کیونکہ وہ ایک مدت سے دے کی مرلیضہ تھی۔ جب اسے دے کا دورہ پڑا تو اس کا سارا جسم ڈھانچے کی طرح جھولنے لگتا۔

لیکن وہ ہمدردی اور نہ ہی خیرات کی خواہشمند تھی۔ اسے اپنے آپ پر بہت فخر تھا، لہذا اس نے اپنے احباب اور رشتے داروں سے کنارہ کشا اور شکار کا چل گئی تاکہ وہاں آئندہ زندگی کی سختیاں عزیز واقارب سے دور کر چھیل سکے۔

اس نے کیا کچھ کیا؟ سب سے پہلے اس نے ایک مسافر خانہ کھولا، لیکن وہ اس کے اخراجات کی متحمل نہ ہو سکی۔ پھر اس نے چینی کے برتنوں پر نقش و نگار بنا کر فروخت کرنا شروع کر دیا لیکن لوگوں نے انھیں کوئی خاص پسند نہ کیا، پھر وہ گیت لکھنے لگی لیکن کوئی ناشر انھیں خریدنے پر تیار نہ تھا۔

آخر پندرہ برس بعد گیری جیکبس باڈجیران (Carrie-Jacobs Bond) نے "ایک اچھے دن کا اختتام" کے عنوان سے ایک گیت لکھا۔ اس گیت کی سادھ لکھ کا پیاں فروخت ہوئیں اور اس نے تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کمائے۔

مگر جب اس نے شروع شروع میں گیت لکھے تو کوئی انھیں دس پونڈ کے عوض بھی خریدنے کو تیار نہ تھا۔ مفلسی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ ہوتے تھے کہ مکان کا کرایہ ادا کر سکے۔ اسے ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں مالک مکان اس کا سامان مکان سے نکال کر باہر پھٹا پھٹ پر نہ رکھ دے۔

سردیوں میں اپنا جسم گرم رکھنے کے لیے اس کے پاس



اچھے دن کا اختتام

وہ گیت جس نے ایک مقروض خاتون کو کروڑ پتی بن دیا

پچاس برس پہلے امریکا کی ریاست مشی گن کے شمالی حصے میں فرینک باڈ نامی ایک ڈاکٹر رہتا تھا۔ ایک سچ بستہ رات کو اچانک اسے ایک مریض دیکھنے باہر جانا پڑا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے بیوی سے کہا "میری جان ایسے بے وقت میرا گھر سے نکلنا تمہیں گراں گزرتا ہوگا، لیکن ایک ڈاکٹر کی زندگی کا طور یہی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے اور اس قسم کی جدائیاں محبت کو استوار کرتی ہیں۔" یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ ابھی وہ اپنے گھر سے تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ برف پر سے اس کا پاؤں بڑی طرح پھسلا۔ ڈاکٹر کے سر پر سخت چوٹ آئی اور اس کی کئی ہسلیاں ٹوٹ گئیں۔ چند دنوں بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بچوں کو بلاؤں گا۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ تو بلی ہی ہے تو میں مان کر تجھ کو چھوڑ دوں گا۔

تھکا آؤٹ سرائے کو نکلتا ہے۔ پرانے زمانے میں اونٹ سفر کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ مسافروں کے آرام کی خاطر جا بجا سرائے موجود تھیں۔ جہاں کھانا پینا اور رات بسر کرنے کی سہولت کرایے پر مل جاتی۔ دن بھر سامان اور مسافر لا کر سفر کرنے کے بعد تھکا ہارا اونٹ جب سرائے دیکھتا، تو منہ اٹھا اٹھا کر اسے نکت کہ اب تھوڑی دیر میں شاید آرام مل سکے گا۔ یہ کہاتو تب کہی جاتی ہے جب کوئی شخص زندگی کا سفر تقریباً مکمل کر چکا ہو اور خود کو موت کے قریب محسوس کرے۔

جاٹ مراتب جائے جب تیرھویں ہو جائے۔ تیرھویں یعنی کسی کے مرنے کے تیرھویں دن ہونے والی رسم۔ جاٹ بہت سخت جان اور جفاکش مشہور ہیں اس لیے ان کا نام لیا گیا۔ کہاتو کا مطلب ہے کہ جب تک کسی معاملے کی اچھی طرح تصدیق نہ ہو جائے اس پر یقین نہ کرو اور تحقیق جاری رکھنی چاہیے۔ اس کہاتو کے پس منظر میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے۔

ایک جاٹ نے ایک بیٹے سے قرض لیا۔ وقت کے ساتھ سود کی وجہ سے قرض کی رقم بڑھتی گئی اور جاٹ کسی طرح اسے ادا نہ کر سکا۔ جب بیٹے کے تقاضے بہت بڑھ گئے تو اس نے عاجز آ کر اپنی فرضی موت کی خبر تک پہنچادی۔ دنیا کاف افسوس منانہ گیا۔ حادثے کی تصدیق کے لیے وہ جاٹ کے گاؤں گیا اور اس کے گھر والوں سے تعزیت بھی کر آیا۔ سب نے اپنے عزیز کی موت پر بہت رنج کا اظہار کیا۔ اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد بیٹے کو ایک قریبی گاؤں میں کسی کام سے جانا پڑا۔ وہاں اس نے بازار میں اس جاٹ کو گھومتے پھرتے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ لوگوں سے گھر آکر پوچھا تو انھوں نے کہا کہ "شاہجی!

جاٹ مراتب جائے جب تیرھویں ہو جائے۔"

سے پوچھا کہ "یہ بگلا کیا ہوتا ہے؟" اس شخص نے ہاتھ کو بگلا کی شکل میں ڈیز سہا کر کے اندھے کے سامنے کر دیا۔ اندھے نے ٹول کر اس کا ہاتھ چھوا اور بولا "بھائی یہ تو بہت میٹھی کھیر ہے۔ ہم سے نہیں کھائی جائے گی۔" اسی مناسبت سے اگر کوئی کام مشکل اور پیچیدہ ہو تو اس کو میٹھی کھیر کہتے ہیں۔ محل استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

پانڈے جی پچھتاؤ گے، وہی چنے کی کھاؤ گے۔ جب کوئی شخص ضد میں کسی کام سے انکار کر دے لیکن بعد میں مجبور ہو کر راضی ہو جائے تو یہ کہاتو بولی جاتی ہے۔ کہاتو سے ایک کہانی منسوب ہے۔ ایک پنڈت جی کو چنے کی روٹی اور دال سخت ناپسند تھے۔ ایک دن جب بیوی نے ان کے سامنے چنے کی دال اور روٹی رکھی تو پنڈت جی نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بیوی نے سمجھایا کہ گھر میں اس وقت اور کچھ پکانے کو نہیں ہے، لیکن وہ نہ مانے اور غصہ میں بھنائے گھر سے نکل گئے۔

شام تک بھوک نے اتنا برا حال کر دیا کہ ہار کر گھر واپس آئے اور خاموشی سے کھانے کی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ بیوی مطلب سمجھ گئی اور اس نے دال روٹی ان کے سامنے رکھ دی۔ پانڈے جی نے بحالت مجبوری اسی سے پیٹ کی آگ بجھائی۔

سنج کہیں بلی تو بلی ہی سہی سنج۔ اگر لوگوں کی اکثریت کسی بات پر متفق ہو جائے تو غلط بات بھی سچ ہو جاتی ہے اور اس کو ماننا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص کے گھر میں رات کو چور گھس آیا اور کمرے میں چوری کرنے گیا۔ اس شخص کی آنکھ کھل گئی اور اس نے چپکے سے کمرے کی کنڈی باہر سے لگا دی کہ چور نکل کر بھاگ نہ سکے۔ چور نے گھبرا کر اس امید پر بلی کی طرح میاؤں میاؤں کہنا شروع کیا کہ وہ شخص اسے بلی سمجھ کر دروازہ کھول دے گا اور وہ بھاگ نکلے گا۔ اس شخص نے بلی کی آواز سن کر کہا کہ "سنج کہیں بلی تو بلی ہی سہی" یعنی صبح ہونے دو تو

پاندہ ہیں کہ زمین میں ہل چلائیں، گاہنے کے وقت کھلیان کے چرخ کو گھمائیں، دودھ بھی دیں اور سب سے بڑھ کر ہمارا سر و کار قصاب کے ساتھ! آج ہی کی بات ہے، مجھے اس قدر ہل چلانا پڑا کہ میرے پہلو ہل پٹیائی کے بوجھ سے درد کر رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی سزا ہے۔“

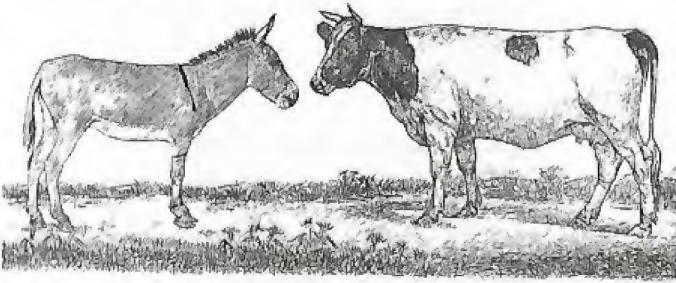
گدھے کو بڑا دکھ ہوا، اس نے کہا: ”تم سچ کہتی ہو۔ کیا تم جانتی ہو کہ میں تمہیں ایک ایسا گر بتاؤں کہ اس کے بعد تمہیں صحرا میں نہیں لے جائیں گے اور ہل چلانے سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔“ مجھے نہیں معلوم مگر عام طور پر مشہور یہ ہے

ایک دیہاتی کے پاس ایک گدھا اور ایک گائے تھی۔ وہ ان دونوں کو ایک ہی طویلے میں باندھتا تھا۔ گدھے پر سواری کرتا تھا اور اس کا خوب خیال رکھتا لیکن گائے کو صحرا میں لے جاتا۔ اسے جوتا اور زمین میں ہل چلاتا۔ فصل کاٹنے کا وقت آتا تو اس کو کھلیان کے چرخ میں جوت دیتا اور اس سے خوب کام لیتا۔

ایک روز گائے بہت تھک چکی تھی۔ جب وہ گھر لوٹ رہی تھی، مسلسل اپنے آپ سے باتیں کرتی اور بڑ بڑاتی جاتی۔ گدھے نے اس سے پوچھا: ”اس قدر ناخوش کیوں ہو اور کیوں اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی ہو؟“ گائے بولی، ”کچھ نہیں، تم گدھوں کو ہمارے دکھوں کا کچھ اندازہ نہیں۔ ہم تمہارے مقابلے میں زیادہ بد قسمت ہیں۔“

گدھا: ”یہ کیا بات کر رہی ہو؟ تم بوجھ اٹھاتی ہو، ہم بھی بوجھ اٹھاتے ہیں۔“

اس کے علاوہ کیا بہتر اور کیا بدتر، کوئی فرق نہیں۔“ گائے بولی ”کیوں نہیں، بڑا فرق ہے۔ گدھے کو سواری اور بار برداری کے لیے طلب کرتے ہیں، اس کے سوا تمہارے ساتھ ان لوگوں کو کچھ کام نہیں ہوتا لیکن ہم



گدھے کا مشورہ

ایک آحق کی کتھا، اس نے بلاوجہ مصیبت اپنے سرمولی

سورج کا نظارہ کر رہی تھی۔ جب سورج دوسرے میں غروب ہوا ہاتھ اتواں نے اپنے آپ سے کہا ”جی جی کتنا اچھا دن ہے۔“ لفظ اور مصرعے اس کے ذہن میں ترتیب پانے لگے، شکر گزاری کا ایک جذبہ اس کے دل میں جنم لینے لگا۔ اس پر شعر کہنے کا موڈ طاری ہو گیا اور اس نے وہیں دو قطعے لکھ ڈالے۔ پھر وہ اس کی طرز بھی لکھنے لگی۔ بات بن گئی تھی۔ موسیقی کے ایک معجزے نے جنم لے لیا تھا۔ اس نے کسی کوشش کے بغیر ایک ایسے گیت کی تخلیق کی تھی جس نے بیسویں صدی کی غنائیہ شاعری میں پہل پید کردی۔

جب مسٹر روز ویلٹ امریکا کا صدر تھا تو وہ مسز بانڈ کو وائٹ ہاؤس میں بلا کر اس سے گیت سنا کرتا۔ ”ایک اچھے دن کا اختتام“ صدر ہارڈنگ کا محبوب ترین گیت تھا۔ اس گیت کا اردو ترجمہ ذیل میں درج ہے:

جب آپ ایک اچھا دن گزار چکے ہوں اور شام کے وقت اپنے خیالات مسیں محو ہوں اور دن کی لائی ہوئی خوشی کی یادیں کلیسا کی گھنٹیاں سریلے انداز میں بجتی ہوں تو کیا آپ جانتے ہیں کہ ایک اچھے دن کا اختتام جب سورج اپنی آفتیں کرنوں کے ہمراہ ڈوب رہا ہو اور عزیز دوست جدا ہونے والے ہوں ایک تھکے ہوئے دل کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے

ایک سفر کے اختتام پر یہ ایک اچھے دن کا اختتام بھی ہے لیکن یہ اپنے پیچھے ایک ایسا خیال چھوڑے جا رہا ہے جو بڑا مؤثر اور سچا ہے اس اچھے دن نے اپنی یاد کی تصویر ایسے رنگوں کے ساتھ بچھ دی ہے جو کبھی دھندلے نہ پڑیں گے یہ یاد ایک اچھے دوست سے کم نہیں

اٹنی رقم نہ ہوتی کہ ایندھن خرید سکے۔ وہ اتنی غریب ہو گئی کہ دن میں فقط ایک بار کھانا کھاتی تھی۔ آخر اس نے فاقوں سے تنگ آ کر اپنا بچا کچا پیچر بھی فروخت کر ڈالا۔

لیکن اس ساری پریشانی کن مفلسی کے زمانے میں کیری جیکبسن باندہ خوبصورت گیت لکھتی رہی۔ ایسے گیت جو ایک دن دنیا میں مشہور ہونے تھے اور ہر ایک نے انھیں گاتے پھرتا تھا مگر مسز بانڈ ان گیتوں کو رندی کے کاغذوں پر لکھا کرتی تھی کیونکہ اس کے پاس اتنے پیسے نہ ہوتے کہ اچھا اور صاف کاغذ خرید سکے۔ وہ شمع کی روشنی میں گیت لکھتی، کیونکہ گیس روشن کرنے کی حیثیت تھی۔

وہ اپنے گیت مشہور کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اشتہار دینے کے لیے ڈالر نہ تھے لہذا وہ اشتہاروں کی قیمت چکانے کے لیے ایڈیٹروں کی بیویوں کے کپڑے سیا کرتی۔ شروع شروع میں اسے کسی کلب میں شام کے وقت گیت سنانے کے بمشکل دس ڈالر ملا کرتے۔ جب بعد میں مشہور ہو گئی تو اسے کسی کلب میں گیت سنانے کے لیے بارہ منٹ کا معاوضہ دوسو ڈالر ملا کرتا۔ جب پہلی دفعہ وہ ایک کلب میں گیت سنانے لگی تو لوگوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ شکستہ دل ہو کر وہ کلب کے عقبی دروازے سے تنگے پاؤں باہر گئی میں بھاگ آئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے لیکن بعد میں اس کا نام اور تصویر نامور اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ تب اسے تھیں میں گیت سنانے کے عوض دو ہزار ڈالر فی ہفتہ ملتا۔

ایک دفعہ اسے ایک گورنر کے سامنے گیت سنانا تھا سیکن پہننے کے لیے اس کے پاس لباس نہ تھا اور نہ ہی اتنے پیسے تھے کہ بازار سے خرید سکے۔ اس نے اپنا ٹرنک کھولا، اس میں دو بڑے بڑے پردے پڑے تھے۔ اس نے وہ پردے سی کر لباس تیار کر لیا۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ مسز بانڈ کو اپنے چند دوستوں کے ہمراہ شہلی کیلیفورنیا کے سن پر دراور نظر فریب مناظر میں ایک دن گزارنے کا موقع ملا۔ اس کا وہ دن بڑے طلسمی انداز میں گزرا۔ شام کے وقت وہ روپی ڈیکس کی پہاڑی پر کھڑی ڈوبتے ہوئے

کہ گدھے خاصے ناکچھ ہوتے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ تم مجھے کوئی ایسا اجتماع نہ کر بتاؤ گے جس کا انجام میرے نقصان پر ہو۔“

گدھا بولا، ”نہیں بھئی، ہم اتنے بھی گدھے نہیں جتنا لوگ کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے مالک ہمیں ہل جوتے اور کھلیان کا چرخ گھمانے کے لیے نہیں لے جاتے۔ سروسٹ تم ایک دفعہ میری نصیحت کو آزمائے تو دیکھو۔ جس قدر مجھے علم ہے، لوگ سخت کاموں کو طاقتور اور صحت مندا کیوں کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں اور تم بھی چونکہ خوب عمدہ کام کرتی ہو، اس لیے یہ لوگ تم سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ میرے خیال میں تمہیں چاہیے کہ خود کو بیمار ظاہر کرو اور ہائے دانے کرو اور راہ چلنے سے اجتناب کرو۔ کوئی کسی سے زبردستی کام نہیں لے سکتا۔“

گائے بولی: ”کیا مشورہ ہے! ارے اس وقت وہ مجھ پر اٹھی اٹھالیں گے اور مار پیٹ کریں گے۔“

گدھا: ”میری دانست میں زیادہ کام کرنے سے تھوڑے سے ڈنڈے کھا لینا بہتر ہے۔ اصل میں راہ چلنے سے پہلے ہی اس کی پیش بندی کر لینی چاہیے۔ صبح جب تمہیں صحرا میں لے جانے کے لیے آئیں تو تمہیں چاہیے زمین پر کسی کروٹ لمبی پڑ جاؤ اور ہائے ہائے کرنا شروع کر دو۔ تمہیں تین چار چھڑیاں ماریں گے اور جب دیکھیں گے کہ تم اپنی جگہ سے ایک پور برابر بھی حرکت نہیں کر رہیں تو تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیں گے۔“

گائے بولی: ”تم درست کہتے ہو۔ اپنی تمام تر بے وقوفی کے باوجود یہ نکتہ تمہیں خوب سوجھا ہے۔“

اگلے دن گائے زمین پر ایک کروٹ لمبی پڑ گئی اور اس نے ہائے ہائے کرنا شروع کر دی۔ دیہاتی نے جس قدر بھی کوشش کی وہ گائے کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں ناکام

رہا۔ ناچار وہ طویلے سے باہر نکل آیا کہ کوئی متبادل صورت نکالے۔

گدھا بولا: ”میں نے کہا نہیں تھا! دیکھا میں نے تمہیں کیسا گر سکھایا۔ اب پھر کہو، گدھوں میں عقل کہاں؟“

چند لمحے گزرے ہوں گے کہ دیہاتی کسی دوسری گائے کا بندوبست نہ کر سکنے کے باعث طویلے میں واپس آیا اور لگام والی ری گدھے کے منہ سر میں ڈالی اور اسے باہر لے گیا۔ جب گدھا باہر نکل رہا تھا، اس نے گائے کے کان میں کہا ”یاد رکھو کہ رات تک خود کو اسی طرح بیمار ظاہر کرنا، ورنہ ہو سکتا ہے یہ دوپہر کو آئیں اور تمہیں صحرائیں لے جائیں۔“

گائے بولی، ”اس راہنمائی کا شکریہ۔ اللہ تمہاری عمر اور عزت میں اضافہ فرمائے۔“

دیہاتی اس دن گائے کی جگہ گدھے کو صحرائیں لے گیا۔ اسے ہل میں جوتا اور وہ رات گئے تک زمین میں ہل چلاتا رہا۔ گدھا اپنے دل میں سوچ رہا تھا: ”گائے سے نیکی کرنا

کرنا میں خود کباب ہو گیا۔ میں بھی کیا اتحق گدھا ہوں، بے وجہ اپنے سر مصیبت منول لے لی۔“

گدھا کام میں کسی قدر جھکا تھا اور جب اسے گائے کا خیال آتا اور کام سے تھک جاتا تو اپنی راہنمائی پر پشیمان ہوتا اور خود سے کہتا: ”میں بھی کیا عجیب گدھا ہوں۔“ ظہر تک وہ بہت تھک گیا۔ اپنے آپ سے کہنے لگا، ”خوب! اب میں اپنی نصیحت پر خود بھی عمل کرتا ہوں۔“ وہیں بیٹھ گیا، آنکھیں میچ لیں اور ہائے وائے شروع کر دی!

دیہاتی نے ایک لکڑی اٹھائی، گدھے کو مارنا پینٹنا شروع کر دیا اور کہنے لگا: ”او بے شعور گدھے! تجھے معلوم ہے گائے بیمار ہے، اب تو بھی سستی دکھا رہا ہے؟ گائے تو دودھ دیتی ہے اس لیے میں نے اس سے نرمی کی لیکن اس لکڑی سے تجھے تو ماری ڈالوں گا۔ نہ تیرا دودھ کسی کام کا نہ

نیرا گوشت کسی لائق۔ بول، یہ سب گھاس کس لیے کھاتا ہے، اگر اس ایک روز میں بھی کام نہیں کرنا۔ تیرا نہ ہونا بہتر ہے۔“

گدھے نے جب دیکھا کہ معاملہ بڑا خطرناک ہے، اٹھ بیٹھا اور پہلے تھوڑی سی بے زاری اور بعد میں سرگرمی سے کام میں جُت گیا۔ اُس نے رات بڑی دیر جاگ کر اپنے کام کی تکمیل کی۔ خود سے مسلسل کہتا جاتا تھا: ”میں بھی کیا عجیب گدھا ہوں۔ میں نے خود کو کس مصیبت میں ڈال دیا۔ کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ کسی بہانے سے دوبارہ گائے کو صحرا میں بھیجا جائے!“

رات ہو گئی تھی۔ گدھا طویلے میں آیا۔ وہ اگرچہ چاہتا تھا کہ گائے کو اس کے تھک جانے کا احساس ہو لیکن اس کے باوجود اپنی عادت سے مجبور وہ زیر لب بڑبڑائے جا رہا تھا: ”میں بھی کیا عجیب گدھا ہوں۔ میں بھی کیا عجیب گدھا ہوں!“

گائے نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی اور بولی: ”نہیں نہیں تو ہرگز گدھا نہیں۔ خاص طور پر جو گرتو نے آج مجھے بتایا تھا، خوب تھا۔“

گدھا بولا: ”تم ہر چیز سے واقف نہیں۔ تم طویلے میں سو جانے ہی کو حل سمجھی ہو۔ لیکن آج مجھے ایک ایسی چیز سمجھ میں آئی کہ تمہاری خاطر مجھے بڑا رنج ہوا۔“

گائے بولی: ”ہاں اگر تو صحرائیں گیا ہو گا، تو مجھے اب سمجھ میں آیا ہو گا کہ زمین میں ہل چلانا کتنا مشکل کام ہے۔“

گدھا بولا: ”نہیں، اس کے برعکس میں گیا اور میں نے دیکھا کہ کام مشکل نہیں بہت آسان تھا۔ رنجیدہ ہونے کا سبب کچھ اور تھا اور ڈرتا ہوں کہ میں تمہیں بتاؤں تو تمہیں ڈکھ ہو گا۔“

گائے بولی: ”ہاں بتاؤ، کیا سبب تھا۔ کہہ ڈال، مجھے

ڈکھ نہ ہو گا۔“

گدھا بولا: ”کچھ نہیں۔ دراصل ہمارا مالک آج ظہر کے بعد اپنے دوست سے کہہ رہا تھا: ”صحرائیں کام کے لیے گدھا خاصا بہتر ہے۔ گائے بیمار بھی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے ہاتھ سے جاتی نہ رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کل اسے قصاب کے ہاتھ فروخت کر دوں تاکہ کم از کم اس کا گوشت تو حرام نہ ہو۔“

گدھے نے اپنی بات کے آخر میں کہا: ”تم یقین کرنا، میں تو تمہاری بھلائی چاہتا تھا اور جب میں نے تمہیں آرام کرنے کا گرتا بتایا تھا تو میرا ارادہ جراتی کا نہیں تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہمارا مالک قصاب کی فکر کرے گا۔ اگر تم درست سمجھتی ہو تو چند دن آرام کر لو۔“

گائے ڈر گئی اور بولی: ”نہیں، بس یہ ایک دن ہی بہت ہے۔ میں جانتی تھی کہ گدھے کا مشورہ گائے کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ میں کل اپنے کام پر جاؤں گی۔“

گدھے نے سکھ کا سانس لیا اور بولا: ”جب بھی تمہارا دل چاہے میں صحرا میں جانے کے لیے بہر حال حاضر ہوں۔ صحرا بہت عمدہ جگہ ہے۔ ہل اور کھلیان گاہنے کا چرخ بھی بہت خوب ہے۔“

گائے بولی: ”میں خود بھی جانتی تھی۔ تو نے مجھے دھوکا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ صحرا وہیل، قصاب کی چھری سے بہتر ہیں۔“

گدھا بولا: ”لو اور کرو نیکی! مجھے معلوم تھا کہ گائے کی جنس بھلائی کی قدر کرنا نہیں جانتی۔“

اگلے دن دیہاتی گائے کو بھی صحرائیں لے گیا اور اپنے بیٹے سے کہنے لگا: ”ایک ہل تو بھی اٹھا اور اس گدھے کے ہمراہ کام کر۔ ایک لکڑی بھی ہاتھ میں لے تاکہ اسے سستی اور

کالی کا خیال نہ آئے۔“ ♦♦♦

میں ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ اس میں ایک بھولا بھرا گیت گونج اٹھا جو محمد علی شکی اور افشاں احمد نے گایا تھا:

میرے بچپن کے دن

کتنے اچھے تھے دن

گیت سن کر میں بچیوں میں گھوٹی۔ یہ گیت میں نے

بہل بار اپنے بچپن میں ہی سنا تھا، مگر

وہ بچپن تھا لہذا اُسے سنا سنا کر

دیا۔ مگر آج جب ہم بڑھاپے کی

دہلیز پر بیٹھے ہیں تو گیت سن کر لگا،

واقی وہ دن کتنے اچھے، کتنے سہانے

تھے۔ وہ دن، لوگ، یادیں، گلیاں

سب کچھ کھو گئے۔

میرا بچپن راولپنڈی کے محلہ

امر پورہ میں گزرا۔ تب لوگوں کے

مکان ایک منزل، گھر چھوٹے،

گلیاں کشادہ اور دل بہت بڑے

تھے۔ ہمارے محلے میں ایک

خاتون تھیں۔ ماشا اللہ ان کے نو

بچے تھے۔ پھر بھی ان کے گھر

میں محلے کے دو چار بچے ہر وقت

پائے جاتے۔ اس وقت گھروں

کے دروازے مستقل کھلے رہتے

تھے۔

ہم پانچ بہن بھائی تھے۔ ہماری

والدہ ماشا اللہ بہت سلیقہ مند اور گھڑ خاتون تھیں۔ (اللہ

انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے) ہم لوگوں کے سکول سے

گھر آنے تک وہ صفائی ستھرائی، کھانا پکانے تمام کاموں سے

فارغ ہو جاتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں ہماری پسند کا سالن

نہ ہوتا تو ہم پیالہ اٹھا کر انہی خاتون کے گھر چلے جاتے اور کہتے، خالہ جان تھوڑا سالن دے دیں۔ وہ پیالہ بھر کر ہمیں پکڑا دیتیں اور ہم خوش خوشی سب بہن بھائی مل کر وہ سالن کھاتے۔



میرے بچپن کے دن

معصومیت اور خوشیوں سے بھرپور
البیلے دنوں کی پُرلطف یادیں

چیس برس گزر گئے ہیں علم ہی تھا۔ والد سے چار آنے لیتے اور محلے میں بابا جی کی دکان سے مونگ پھلی، ملوک، ناشپاتی لاتے اور اسی میں خوش ہو جاتے۔

چھوٹی عید پر دادا جان ہمیں ۱۰ روپے عیدی دیتے۔ وہ

پیسے صرف ہمارے ہوتے۔ ان ۱۰ روپوں کی جی بھر کر عیاشی کرتے۔ قلفی، گول گپے، سموے، چاٹ کھاتے اور لاٹ صاحب کی طرح اکڑا کر پھرتے۔ ہمارے سکول کے باہر چاٹ والا ہوتا جو ۲۵ پیسے کی پیالہ بھر چاٹ دیتا۔ اس چاٹ میں ابلے چنے، ابلے لال لوبیا، آلو ہوئے اور کھٹا پانی۔ مگر اللہ کی قسم اس طرح کی چاٹ زندگی میں دوبارہ نہیں کھائی۔

۲۵ پیسے کی میٹھی مونگ پھلی والی پٹی ملتی جو روز چھٹی کے بعد میں خریدتی۔ وہ ذائقہ بھی دوبارہ نہیں ملا۔ ہمارے محلے میں ایک سبزی والے راجہ جی ہوتے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ شام کو جو سبزی بیچ جاتی اس کے پکڑے بناتے۔ بینگن، گوہی اور آلو کے پکڑے، ویسے لذیذ پکڑے دوبارہ نہیں کھائے۔ ہمارے محلے میں امام دین کے سموے اور کھنے لذ پورے امر پورہ میں مشہور تھے۔ لوگ کہتے ”امام دین کے سمووں جیسے سموے کوئی نہیں بناتا۔“ گرمیوں میں ہماری گلی میں ایک شخص قلفی بیچنے آتا تھا۔ وہ خود ہی شاعری گھر کر قلفی بیچتا۔

میں سوچتی ہوں اس وقت لوگ کتنے خوش رہتے تھے۔ غریب کو بھی دو وقت کی روٹی آرام سے مل جاتی۔ ہوس نہیں تھی، ہر کوئی خوش رہتا۔ کوئی کسی کی امارت سے جلتا نہیں تھا۔ ہماری پوری گلی میں صرف ایک وکیل تھے جن کے پاس گاڑی تھی۔ اکثر لوگوں کے پاس سائیکل ہوتی۔ میرے والد کے پاس بھی سہراب سائیکل تھی اور وہ اس پر دکان جاتے۔

ہم خوشحال لوگ تھے مگر محلے میں اکثر لوگ متوسط درجے کے تعلق رکھتے مگر سب کا ایک دوسرے سے اچھا رابطہ تھا۔ ہمارے گھر میں اڑوس پڑوس کی خواتین ہر وقت براجمان رہتی تھیں۔ محلے کے بچوں سے ہماری بہت دوستی تھی۔ مجھے یاد ہے جب چھوٹی عید آتی تو والدہ چھوٹا گوشت اور آلو پکا تیں اور ابلے چاول بھی، ہم سب ہمیں اور ہماری سہیلیاں ایک

بڑی پرات میں چاول اور سالن ڈال کر کھاتیں اور خوب مزے کرتیں۔ آج بھی وہ پرات اور سالن یاد آتے ہیں۔

اس وقت صرف پی ٹی وی کا راج تھا۔ چار بچے شام نشریات کا آغاز بصیرت سے ہوتا پھر کارٹون لگتے اور اس کے بعد بچوں کا کوئی ڈراما دیکھ کر ٹی وی بند کر دیا جاتا۔ پھر ۸ بجے کا ڈراما دیکھا جاتا۔ نو بجے بعد ہمیں ٹی وی دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ تب ہم سب بہن بھائی سو جاتے۔

رشتہ داروں کے گھروں میں باقاعدگی سے آنا جانا تھا۔ ہر جمعرات کو والدہ ہمیں دادی اماں اور نانائی جان کے گھر لے کر جاتیں۔ رات کو والد کے ساتھ ہم واپس آتے۔ بچوں کو بڑوں کی محفل میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم بچے گلی میں کھیلنے یا پھر بچوں کے رسالے پڑھتے۔ ہمارے محلے میں ایک لڑکی مجھے اچھی نہیں لگتی تھی مگر جب پتا چلا کہ اس کے پاس اشتیاق احمد کے بہت سے ناول ہیں تو میں فیروں کی طرح اس کے گھر کے چکر لگاتی کہ مزید ایک ناول پڑھنے کو مل جائے گا۔

لوگوں میں محبت اور خلوص تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کا شاسا تھا۔ ہمیں یہ علم ہوتا تھا کہ یہ بچے ہمارے محلے کا ہے یا نہیں۔ آج تو یہ حالات ہیں کہ ہمیں یہی پتا نہیں کہ ہمارے ساتھ والے گھر میں کون رہا ہے؟ مادہ پرستی نے ہمارے دل و ذہن پر بیجے گاڑ لیے ہیں۔ ہمارے بچوں کا بچپن موبائل، کمپیوٹر اور بے تحاشا مشاغل نے چھین لیا ہے۔ وہ بے فکری وہ لاابالی پن جس میں ہم نے اپنا بچپن گزارا، ہمارے بچے اس سے نا آشنا ہیں۔ ہم چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خوشی میں سارا دن سرشار رہتے تھے۔ عید آتی تو ساری رات صبح پہننے والے کپڑے اور جوتیاں اٹھا کر دیکھتے اور خوش ہوتے۔ ہمارے بچے ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم ہیں۔ جو کچھ ہم کھیتے تھے: برف پانی، کوکھا چھپاکی، نیلی پری، ادوج نیچ وغیرہ۔ ہمارے بچے جانتے ہی نہیں کہ یہ کیا ہیں۔



چوتھی اولاد

تہائی اور بے رخی کا نشانہ بنی ایک بوڑھی کی
ولد و زواستان جو اپنا تانباک ماضی کبھی نہ بھول پائی

۱۹۵۰ء کے اوائل کی بات ہے کہ روزہ (ROSA) اور ولیم شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ وہ فروری کی ایک سرد شام تھی جب ولیم کو آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ شادی کو کچھ ہی دن گزرے تھے۔ ولیم نے یہ خبر بہت خوشی سے اپنی نو بیاہتا کوسنائی۔

”تم میرے لیے بہت خوش قسمت ثابت ہوئی ہو۔ اب

میری تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ مجھے بہترین ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے۔“ وہ دونوں اٹلی کے شہر روم کے رہنے والے تھے۔ والدین، رشتہ دار سبھی لوگ روم کے آس پاس مقیم تھے۔ سبھی لوگ عیسائیت کے پیروکار تھے۔ قدیم مسیحی مذہب کی جڑیں وہاں کافی مضبوط تھیں۔ خاندان والے مل جل کر رہتے تھے۔ بزرگ مضبوط بنیاد کی طرح پورے خاندان کو جوڑ کر رکھتے۔ آپس میں ملنا جلنا تھا۔ کھانا پینا، ہنسنا، خوشی، غمی سب کچھ سانجھا تھا۔ آٹنی ایلس روزہ کی بیوہ خالہ تھی۔ سگی ماں کی طرح عزت ملتی تھی۔

روزہ اپنے خاندان میں بڑی خوش تھی کہ اس کی زندگی میں ولیم آگیا۔ وہ ایک خوش شکل، خوش پوش، پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ ان کے درمیان دوستی اور اعتماد کا رشتہ اتنا بڑھا کہ روزہ نے اسے اپنے تمام خاندان والوں سے ملوایا۔ ولیم کی اکلوتی بہن سڈنی میں سکونت پذیر تھی لہذا وہ ان کی شادی میں شریک نہ ہو سکی۔ البتہ ولیم کے دوست احباب اور دور کے رشتہ دار شادی

میں ہنسی خوشی شریک ہوئے۔ اب روزہ اداس ہو گئی کہ سب کچھ چھوڑ کر اتنی دور جانا پڑے گا لیکن اچھے مستقبل کی خاطر اس نے یہ گوارا کر لیا۔ پھر جوانی میں نئی جگہ دیکھنے کی لگن بھی تو ہوتی ہے۔

دونوں میاں بیوی باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ کچھ سامان وہ ساتھ لے جا رہے تھے۔ سامان میں ایک

چھوٹی ڈریسنگ ٹیبل بھی تھی جو آٹنی ایلس نے اسے شادی کے موقع پر تحفہ دی تھی۔ سب ہی اداس تھے کہ اب جانے کب ملاقات ہو مگر ان دونوں کی خوشی میں سب خوش بھی تھے۔ وہ بس کے ذریعے روم سے نیپلز روانہ ہوئے تو آنکھوں میں آنسو تھے۔ انھیں نیپلز سے بحری جہاز کی تقریباً دو ماہ کی مسافت کے بعد آسٹریلیا کے ساحل سڈنی پہنچنا تھا۔

روزہ اور ولیم نے یہ سفر کسی نہ کسی طرح طے کیا۔ جب وہ سڈنی پہنچے تو دفتر کی طرف سے انھیں ایک عارضی رہائش دی گئی۔ سڈنی بہت خوبصورت شہر تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر بھی آسٹریلیا کا سن و پلٹھ کے زیر اثر تھا اس لیے وہاں بہت تیزی سے ترقیاتی کام ہو رہے تھے۔ دوسرے ممالک کے لوگ اپنی روزی کے چکر میں وہاں منتقل ہو رہے تھے، اسی لیے ایک ملٹی کلچرل (Multicultural) سوسائٹی تشکیل پا رہی تھی۔

روزہ کا دل بڑی مشکل سے سڈنی میں لگا لیکن وقت رفتار بڑھاتا ہے تو پتا ہی نہیں چلتا۔ جب یکے بعد دیگرے اس کے تین بچے ہوئے تو وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ روزہ کو معلوم ہی نہ ہوا۔

وہ سارا دن بچوں کی دیکھ بھال، گھر کے کام کاج کرنے اور ولیم کی واپسی کے انتظار میں گزار دیتی۔ شوہر کی بہن وہیں رہتی تھی۔ کبھی کبھی اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ پھر یوں، ہوا کہ ولیم کے توسط سے دو بہن بھائی بھی حصول روزگار کی خاطر آسٹریلیا منتقل ہو گئے۔ اب اٹلی جانے کا سوال ہی نہیں تھا مگر یا تو آتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے پینتیس سال گزر گئے۔ بچوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ولیم اور وہ دونوں ہی بیمار رہنے لگے۔ ان کا ملنا جلنا آپس میں اور وہاں کے رہنے والوں سے تھا لیکن وہ اپنا نسب جو اپنے وطن میں ہوتی ہے، وہ عنقا تھی۔ ولیم اور روزہ الگ گھر میں رہتے۔ ایک دن ولیم کے سینے میں شدید درد اٹھا اور

وہ زرد پتے کی طرح کانپنے لگا۔ جب تک ایسپولینس آئی اس نے جان دے دی۔ شوہر کی موت کے بعد روزہ اکیلی رہ گئی۔ بچے آئے لیکن جنازے کی مصروفیات کے بعد اپنی نوکریوں کا بہانہ کر واپس چلے گئے۔

روزہ کے لیے بہت مشکل وقت تھا، اس نے سوچا کیوں نہ وہ کوئی نوکری کر لے تاکہ مصروف ہو جائے۔ جب تک ولیم زندہ تھا، اس نے کبھی اس طرف دھیان نہ دیا تھا۔ ایک تو ولیم کو یہ بات پسند نہ تھی دوسرے روزہ بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ بلڈ پریشر اور شوگر کے امراض نے اسے کمزور کر دیا تھا اس لیے گاڑی ڈرائیو کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسپتال جاتی یا گھریلو سامان کی خریداری کے لیے اسٹور تک چلی جاتی۔

اس کی بڑی بیٹی الزبتھ کبھی کبھی پکڑ لگاتی۔ اس نے دیکھا کہ اتنا بڑا گھر سنبھالنا ماں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اس نے اے جھوٹے گھر کا مشورہ دیا۔ اگلے دن سے چھوٹا گھر ڈھونڈنے لگی۔ پہلے گھر کا سامان بیچنے کے لیے درخواست میوہل کمیٹی میں جمع کروادی اور پھر سہ روزہ سے پوچھے بغیر ہی بہت سی چیزوں کا سودا کر دیا۔ جب روزہ کو پتا چلا تو اسے بہت رنج پہنچا اور اس نے نئے گھر میں جانے سے انکار کر دیا۔

الزبتھ بولی ”آپ ویسے بھی اکیلے گھر میں نہیں رہ سکتیں کیوں نہ میں آپ کو نرسنگ ہوم میں داخل کروادوں۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ وہاں آپ کا خیال رکھنے کے لیے عملہ ہوگا۔“ روزہ کو اپنی جوانی کا زمانہ یاد آیا جب تمام خاندان والے اٹلی میں مل جل کر اکٹھے رہا کرتے تھے۔ بزرگ گھر میں سایہ دار درخت کی طرح سمجھے جاتے۔ روزہ اور ولیم نے اپنی اولاد بہت پیار سے پالی تھی مگر جب اس کا بڑھاپا آیا تو کوئی بھی اسے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ شاید نئے زمانے میں ماں باپ کو ساتھ رکھنا عیب تھا یا نرسنگ ہوم

جائے گی۔

لیکن اب اس اجنبی نے آکر فخر سے بھرے خیالوں میں ہلچل مچادی تھی۔ اجنبی کی باتیں بغل کے پاس خاصا نمایاں ابھارتھا۔ گویا اس نے کندھے کا ہولسٹر پکڑ رکھا تھا اور اس میں یقیناً ایک پستول بھی موجود تھا۔ اس کی تیز چمکدار آنکھیں بڑی مہارت سے بار میں موجود ہر شخص کا جائزہ لے رہی تھیں۔



قانون کی نگاہوں میں
دھول جھونکنے والے کائیاں
فوجدار کا دلچسپ ماحبرا



اشوکھا جھانسا

میں کوئی قیمتی چیز تو نہیں۔“

جب الزبتھ نے پہلی دراز کھولی تو اس میں تینوں بہن بھائیوں کے بچپن کی تصاویر نکل آئیں۔ اس دراز میں اسی کے بچپن کی ایک گڑیا تھی جس کا فراک الزبتھ نے خود سیا تھا۔ باپ کا ایک۔ گار بھی نکلا۔

دوسری دراز کھولی تو اس میں چار عدد خط رکھے تھے۔ ہر بچے کے نام ایک خط تھا اور ایک پیکٹ۔ تین عدد خط بچوں اور ایک عدد خط نرسنگ ہوم کی انچارج کے نام تھا۔

الزبتھ کے خط میں ماں نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور اپنی ہیرے کی انگلی اُسے بطور تحفہ دی تھی۔ باقی دونوں بچوں کے خطوط میں انھیں وصیت کی تھی کہ وہ اپنے بچوں سے ایسے ہی محبت کریں جیسے ان کے ماں باپ نے ان سے کی تھی۔ ان دونوں کے لیے اس نے پرائز بانڈ رکھے تھے۔

نرسنگ ہوم کی انچارج کے نام خط میں روزہ نے لکھا تھا۔

”آپ نے میرا بہت خیال رکھا اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ میرا سامان میرے بچوں کے حوالے کر دیں گی۔ یہ اس میز کو نہیں لے کر جائیں گے۔ یہ میز مجھے میرے وطن اٹلی کی یاد دلاتی ہے۔ یہ مجھے اپنی اولاد کی طرح پیاری ہے۔ اس میز نے ہمیشہ میرے رازوں کی حفاظت کی ہے اور میری تنہائی میں میرا ساتھ دیا۔ یہ میرا میکہ، سسرال، خاندان، یادیں، اولاد سب کچھ ہے۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئی ہیں۔ کیا آپ اس میز کو جو میری چوتھی اولاد ہے میری خاطر قبول کریں گی؟

اگر ان کو بہت شکر ہے اور اگر نہیں! تو اسے بھی زمین میں میری طرح دفنا دیں ورنہ میرے بچے اس کو ضائع کر دیں گے۔ میں اس کی یہ بے وقعتی برداشت نہیں کر سکتی۔

آپ کی دوست روزہ ولیم

میں رکھنا فیشن بن چکا تھا۔

روزہ نے گھر کے بچے کچھے سامان کا جائزہ لیا۔ سامان سے اس کی سہانی یادیں وابستہ تھیں۔ باورچی خانہ جو اس کے محبوب شوہر نے بڑی محبت سے بنوا کر دیا تھا۔ ٹی وی لاؤنج جہاں بیٹھ کر وہ اپنے شوہر اور بچوں کے سونے اور جرائیں پنا کرتی تھی۔ باغیچہ جہاں انار اور سیب کے درخت بڑی محنت کے بعد پھل دے رہے تھے۔ اس نے سبھی پر حسرت کی نظر ڈالی۔ واقعی شوہر کی زندگی میں عورت کو جو سکون نصیب ہوتا ہے وہ دوبارہ نہیں ملتا۔ منجائے اولاد کی تربیت میں کیا کمی رہ گئی تھی۔

شوہر کے بینک بیلنس اور سوشل سروسز کی وجہ سے اسے وظیفہ ملتا تھا لہذا معاشی مسائل نہیں تھے بس تنہائی تھی۔ آخر وہ وقت بھی آتی گیا جب اس کو نرسنگ ہوم میں کمروہ الاٹ کر دیا گیا۔ وہ چند ضروری چیزیں لے جا سکتی تھی۔ اس نے اپنے پیارے گھر کی تمام چیزیں آہستہ آہستہ بکتے دیکھیں اور ہاتھ ملتی رہ گئی۔ جب ڈریسنگ ٹیبل کی باری آئی تو وہ رو پڑی اور الزبتھ سے درخواست کی کہ یہ میز اس کی پیاری خالہ نے اسے دی تھی وہ اسے نرسنگ ہوم لے جانے کی اجازت حاصل کر لے۔

تھوڑی بحث کے بعد الزبتھ راضی ہو گئی اور اس نے درخواست جمع کر وادی جو روزہ سے تھوڑی پوچھ گچھ کے بعد منظور کر لی گئی۔ الزبتھ نے نرسنگ ہوم میں اپنی ماں کو منتقل کیا اور وہاں اپنے شوہر چلی گئی۔ ایک ماہ نہ گزرا تھا کہ روزہ کے سر میں شدید درد اٹھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ نرسنگ ہوم والوں نے بچوں کو اطلاع دی۔ جب سب بچے پہنچ گئے تو ضروری انتظامات کے بعد روزہ کو دفنا دیا گیا۔ اس کا بقایا سامان بچوں کو ملتا جس میں ڈریسنگ ٹیبل بھی شامل تھی۔

الزبتھ نے اس میز کی طرف حقارت سے دیکھا اور بولی ”پرانے زمانے کی اس میز کا ہم نے کیا کرنا ہے۔“

نرسنگ ہوم کی انچارج نے کہا ”آپ دیکھ لیں اس

☆☆☆

”پچیس سالہ مہذب اور خوشحال مرد، ایک پختہ زمیندار حسین خاتون سے شادی کا خواہش مند ہے۔ خاتون کو جو مندرت زندگی گزارنے کی ضمانت دی جاتی ہے۔ رجوع کرے۔“

یہ سوچتے ہوئے وہ دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اس نے دونوں خامیاں بڑی مہارت سے دُور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے سائنس ایڈ کو کچھ اِن مادے میں ملا کر

”ممکن ہے اُس نے کوئی ایسی چیز کھائی جس سے موت اس قدر جلد واقع ہو گئی۔“ جوزف نے یہ کہتے ہوئے

شکی مزاج مارشل کی طرف سے منہ پھیر کر تھوک نکلا۔ اسے یقین تھا کہ انکل جون کا دل ہی جواب دے گیا اور اس کی فوری موت کا سبب بنا۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ اگر اس نے سائنسٹڈ والا کپسول نگاہا ہوتا، تو وہ گھٹنے بعد ہی مرتا۔

اچانک اس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس سے بڑی حماقت سرزد ہو چکی تھی۔ کاش وہ کچھ دیر اور صبر کر لیتا اور فطرت کو اپنا کام کرنے کی مہلت دیتا مگر اب تو وہ بڑے خطرے میں پڑ چکا تھا۔ اسے ہر قیمت پر پولیس والوں سے پہلے انکل جون کی جیب سے کپسول کی شیشی نکالنا تھی۔ ورنہ وہ بڑی مشکل میں پڑ جاتا۔

انکل جون کی لاش اٹھائی جانے لگی تو جوزف کو اس کا موقع بھی مل گیا۔ اس نے لاش کو سہارا دیتے وقت آہستگی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کپسول کی شیشی نکال کر مٹھی میں چھپالی۔ اپنے اسٹور میں آ کر وہ شیشی جلتے چولہے میں ڈالنے ہی والا تھا کہ اطلاع گھنٹی بج اٹھی۔ وہ چولہے سے دور ہٹ گیا۔ وہ مارشل کین تھا جو اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ”میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔“ اس نے ایک انگلی جوزف کی طرف اٹھا کر ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا کہ تم نے جون کی جیب سے کوئی چیز نکالی ہے۔ وہ کیا چیز تھی؟“

جوزف سکڑا ہوا اپنے کاؤنٹر کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ لباس کے نیچے سرد پسینہ بہ رہا تھا۔ اسے جلد از جلد اس منحوس شیشی سے چھکارا حاصل کرنا تھا۔ ترجیحی نظروں سے اس نے کاؤنٹر اور دیوار کے بیچ میں آدھ انچ کا خلا دیکھا اور آہستگی سے شیشی اس میں ڈال دی۔ اس کی حرکات ایسی تھیں جیسے وہ کاؤنٹر صاف کر رہا ہو۔ اسے یقین تھا کہ مارشل کین اسے شیشی

گرا نے نہیں دیکھ سکا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کس چسیہ کا تذکرہ کر رہے ہو۔“

”تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔“ مارشل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”جون کی موت کے بعد تمہیں پچاس ہزار ڈالر ملے والے ہیں۔“ اس نے اسٹور کی طرف ہاتھ لہرایا۔ ”اور یہ اسٹور بھی اب تمہاری ملکیت ہے۔ مگر میں لاش کا پوسٹ مارٹم کرا کر ثابت کر دوں گا کہ تم نے اسے زہر دیا۔“

اس نے پھر جوزف کے لباس کی تلاش کی مگر کچھ ہوتا تو نکلتا۔ وہ پیر پختا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب رکھے شوکیں پر ایک خالی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اسے اٹھا کر یوں دیکھنے لگا جیسے بوڑھے جون کو اس میں سے زہر دیا گیا ہو۔

جوزف کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ خوف اس کے رگ و پھ میں سرایت کرنا جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا جب پولیس نے لاش کا پوسٹ مارٹم کیا تو زہر کے اثرات مل جائیں گے۔ انکل جون کچھ عرصے سے کسی بیماری کی وجہ سے آرسینک کی خوراکیں لے رہا تھا۔ وہ یہ خوراک کسی ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر اپنی مرضی سے لے رہا تھا۔ چونکہ اسے آرسینک لینے کا خاصا عرصہ گزر گیا تھا، اسی لیے اس نے اس خوراک کی مقدار بڑھا دی۔ مگر جسم عادی ہو جانے کی وجہ سے زہر نے کوئی خراب اثر نہیں دکھایا۔

جوزف کی پسینہ میں بھیگی قمیص کمر سے چپک گئی۔ اگر وہ اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیتے تو جو وہ کرنا چاہتا تھا، وہ کر پاتا۔ یہ اس کے خیال میں بڑی نا انصافی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر رونا آ گیا۔ شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں، اس نے سوچا کہ آدمی جرم کر کے سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ نہیں، نہیں وہ دوبار پہلے بھی چھوٹے موٹے جرائم کر کے سزا سے

صاف بچ نکلتا تھا۔ شاید اسے اپنے جرائم کی سزا مل رہی ہے۔ مگر وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اس کے جبرے بچھ گئے۔ اس نے سر اٹھالیا۔ ”وہ پوسٹ مارٹم ہرگز نہیں ہونے دے گا۔“ جوزف نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ پھر ذرا سی دیر بعد وہ کارولز کے دفتر میں داخل ہوا تو اپنے لیے لائحہ عمل تیار کر چکا تھا۔

پستہ قد کارولز اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا پھر اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ ”تمہیں۔“ اس نے کہا۔ ”یہاں کوئی پوسٹ مارٹم نہیں ہو رہا۔ کم از کم مجھے تو اس کی اطلاع نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مارشل کین بہت جوش میں ہے مگر انکل جون کی لاش دیکھ کر پہلی نظر میں ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ قدرتی موت مرا۔“

لہجے تو گنگے سرخنی سوٹ والے سراخ رساں نے مسکرا کر اپنے گلاس سے آخری گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھ دیا۔ اسٹھ کا گلاس جون کا توں بھرا ہوا تھا۔ ”تو یہ ہے وہ داستان۔ جوزف کو ورثے میں پچاس ہزار ڈالر مل گئے پھر اس نے میڈیکل اسٹور بھی بیچ دیا اور کسی شہر کی طرف نکل گیا۔ اس کی بیوی کے رشتے داروں نے نجی طور پر میری خدمات حاصل کی تھیں۔ انکل جون کی موت کے چند ہی روز بعد جوزف کی بیوی سیڑھیوں سے گر کر مر گئی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اتفاقی طور پر نہیں گری بلکہ اسے دھکا دیا گیا تھا۔ مگر ہم جوزف کے خلاف کبھی یہ بات ثابت نہیں کر سکے۔“ اس نے ایک طویل سانس لی۔

”یقیناً اس سے پہلے ہمیں میڈیکل اسٹور سے جوزف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ مل گیا تھا جس میں اس نے سائنسٹڈ کے ساتھ کھرا بن ملا کر کپسول تیار کیے تھے اور انھیں انکل جون کی وٹامن والی شیشی میں رکھ دیا تھا۔ بعد میں ہمیں کاؤنٹر اور دیوار کے بیچ خلا میں سے وہ شیشی بھی مل گئی۔“

اچانک اس نے حیرت آمیز نگاہوں سے اسٹھ کی طرف دیکھا اور پوچھا ”تم ہی کیوں نہیں رہے؟“ اسٹھ نے نفی میں سر ہلایا تو سراخ رساں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور انگلی سے اس کے کنارے سہلانے لگا۔

”تم نے کہا ہے کہ یہ نوسال پرانی داستان ہے۔“ اسٹھ نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”تو کیا تم اب بھی جوزف کو پہچان سکتے ہو؟“

سراخ رساں دھیرے سے مسکرایا اور بولا ”یقین کرو، میں کسی چہرے کو ایک بار دیکھنے کے بعد قیامت تک نہیں بھول سکتا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جوزف نے کیسے اپنا حلیہ بدلا ہوگا۔ بال رنگ لیے، چہرہ پھلایا ہوگا یا کچھ اور ہوگا مگر انگلیوں کے نشانات کوئی نہیں بدل سکتا۔ ہمارے پاس کپسول کی شیشی پر اس کی انگلیوں کے واضح نشانات موجود ہیں۔“

وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ایک منٹ کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے ایک فون کرنا ہے ابھی آیا۔“ اس نے رومال اٹھا لیا اور باہر نکل گیا۔ اسٹھ کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ اس نے زبان پھیر کر انھیں ترک کیا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ رنگ دار بال، پھولا ہوا منہ، انگلیوں کے نشانات، اس نے میز پر رکھے اپنے گلاس پر نگاہ ڈالی۔ یقیناً گلاس پر بھی اس کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ اسے یاد آیا، سراخ رساں نے اس کے ہاتھ سے بڑی احتیاط سے گلاس لیا اور پھر اپنا رومال اٹھا لیا تھا۔ ”ادھ“ حقیقت کا ادراک ہوتے ہی اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ شاید وہ پولیس کو فون کرنے گیا ہے۔ اس نے سوچا پھر تیزی سے حرکت میں آ گیا۔

شہر میں گھومتے ہوئے اس نے تین بار ٹیکسیاں بدلیں۔



مُسکراہٹ دلکش بنا لیجیے دانتوں کی تندرستی و صفائی کے لیے تیسرہ ہدف نسخہ

نقصان پہنچ سکتا ہے۔

تمکین گرم پانی

یہ قدرتی ٹانک نہ صرف دانتوں کو قدرتی طور پر صاف کرتا بلکہ مسوڑھے صحت مند رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا

سفید دانتوں کی چمک سے اپنی مسکراہٹ پر کشش بنانا کس کی خواہش نہیں ہوتی؟ لاتعداد خواتین و حضرات اس مقصد کے لیے ہزاروں روپے ماہرین دندان کو دے کر ان کی صفائی کروا رہے ہیں۔ تاہم کیا آپ نے کبھی ایسے قدرتی طریقے یا غذائیں استعمال کرنے کا سوچا جو آپ کے دانت موتیوں کی طرح سفید کر سکتی ہیں؟

درحقیقت موتیوں جیسے چمکتے دانت آج کے دور میں خوبصورتی کا جزو بن چکے جیسے بال رنگوانا، بھونچا بنانا وغیرہ۔ اچھی بات یہ کہ اپنی مسکراہٹ جگمگانے کے لیے آپ کو بہت زیادہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں، درحقیقت اسٹراہیری سے لے کر پاپ کارن تک یہ کام بخوبی کر سکتے ہیں۔ چند چیزوں کے بارے میں جانے جو آپ کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

بیکنگ سوڈا

اپنے پائوچی خانے سے بیکنگ سوڈا (کھانے کا سوڈا) نکال کر غسل خانے میں منتقل کر دیں۔ جی ہاں، یہ سفید سفوف جو بیشتر ٹوتھ پیسٹوں کا حصہ ہوتا ہے، قدرتی طور پر دانتوں کی سفیدی واپس لانے میں مددگار بنتا ہے۔ چوتھائی سپچ بیکنگ سوڈا پانی میں ملائیے اور پھر اپنے دانتوں پر ٹوتھ برش کی مدد سے لگائیے۔ اس سے دانتوں کی سفیدی بتدریج بحال ہونے لگتی ہے۔ معمول بنالینے سے کچھ عرصے میں دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔

اسٹراہیری

اس پھل کے داغ ہو سکتا ہے کہ کپڑوں سے تو نہ ہٹ سکیں مگر دانتوں پر ان کا اثر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دراصل اس پھل میں شامل مالینس ایسڈ قدرتی طور پر دانتوں کی چمک بحال کرنے میں مدد کرتا ہے۔ تاہم پھل کو کھالیے، اسے دانتوں پر چپکنے نہ دیں کیونکہ اس سے ان کی سطح کو

بیٹھے رہتے تو میں کبھی تمہیں بکڑ نہ پاتا۔ تم نے شاندار میک اپ کر رکھا ہے۔ تمہارا چہرہ اور انداز بدلے ہوئے ہیں۔ انگلیوں کے نشانات کا تو میں نے محض ڈھونگ رچایا تھا۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بس ایک جھانسا تھا جس میں تم کسی بچے کی طرح پھنس گئے۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ تم بھاگتے ہو یا نہیں۔ اگر تم وہیں بیٹھے رہتے تو ہم زندگی بھر تمہیں شناخت نہ کر پاتے۔“

سراغ رساں بولے جا رہا تھا۔ اس طرح شاید وہ زیادہ سے زیادہ لطف لینا چاہتا تھا۔ اسمتھ کو چکرا رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ بھنور میں پھنس چکا۔ آخر اس نے خود کو سنبھالا اور سراغ رساں کی آنکھوں میں دیکھا۔

”پھر تم آخر مجھ تک کیسے پہنچے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”مجھے اپنی صلاحیتوں پر پورا یلتسین اور اعتماد تھا۔ میں نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے بعد ازاں شیشی پر سے اپنی انگلیوں کے نشان مٹا ڈالے تھے۔ اور پھر میں انتہائی شہاندار بدل رکھا تھا۔ پھر تم نے کیسے میرا پتہ لگایا؟ مجھ تک کیسے پہنچ گئے؟“

سراغ رساں کی مسکراہٹ کچھ اور کشادہ ہو گئی۔ ”اس اشتہار کے ذریعے جو تم نے ایک ہفتے قبل اخبار میں دیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”کیا تم اب بھی نہیں سمجھ؟ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

اسمیتھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”ارے بے وقوف“ سراغ رساں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں وہی سون ہوں جس سے تم شادی کرنا چاہتے ہو۔ مجرم کتنا ہی چالاک ہو وہ قانون سے نہیں بچ سکتا۔“

اپنے گھر میں وہ صرف اتنی دیر کا کہ کچھ رقم اور ایک ہفتے پرانا اخبار لے کے جسے میں اس نے پینتیس سالہ جوان کی شادی کا اشتہار دیا تھا۔ اخبار کے ساتھ وہ جواب میں آنے والا سون نامی لڑکی کا خط لینا نہیں بھولا تھا۔ اس کا میڈیکل اسٹور نیویارک شہر میں تھا جہاں انسان بڑی آسانی سے پولیس کو دھوکا دے کر کہیں بھی گم ہو سکتا ہے۔

اس نے عظیم ٹرمینل کے گیٹ نمبر گیارہ کی طرف دیکھا۔ اس وقت سون کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اسے کسی بہانے سے راضی کر لے گا پھر اسے بھی ساتھ لے کر یہاں سے نکل جاتا۔ اتنا شاندار موقع وہ کسی بھی قیمت پر گنونا نہیں چاہتا تھا۔ سون حرام بیویوں میں زیادہ مال دار اور منافع بخش ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ گیٹ نمبر گیارہ کی طرف بڑھا۔ پھر اس کے قدم جیسے زمین نے تھام لیے۔ سُرمی سوٹ والا لمبا تڑنگا سراغ رساں گیٹ سے نکل رہا تھا۔ اسمتھ فوراً سنبھل گیا اور بھوم کی طرف دوڑا۔ مگر سراغ رساں گولی کی طرح اس کے تعاقب میں آ رہا تھا۔ اسمتھ نے محسوس کیا جیسے کسی نے عقب سے اس کا کوٹ بکڑ کر کھینچا ہو۔ وہ تیزی سے گھوما اور پوری قوت سے سراغ رساں کے چہرے پر گھونسا مارا مگر سراغ رساں ہوشیار تھا۔ اس نے جھکائی دے کر خود کو بچا لیا اور اسمتھ کے پیٹ میں لاس ماری۔ اسمتھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ایک پیر قہر میں اور دوسرا کیلے کے پھلکے پر رکھا ہوا ہو۔

جب وہ بمشکل فرش سے اٹھا تو خود کو پولیس کے جوانوں کے نرغے میں دیکھ کر اس کے رہے سبے واسان بھی خطا ہو گئے۔ پھر اس کی نگاہ سراغ رساں کے چہرے پر پڑی جو بڑے دلکش انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ”حق کی دُم“ وہ بولا۔ ”تمہیں ہرگز فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تم اگر بار میں

باغ کا راز



ایک خوش مزاج اور ہنس مکھ خاتون کا ماحبراجو
دیکھتے ہی دیکھتے چڑچڑی اور بد مزاج بن گئی

دیکھی۔ وہ انتہاء درجے کی ہمدرد اور غمگسار بھی ہیں۔ آس پاس کے تمام لوگ ان کے گن گاتے ہیں۔ وہ ہیں ایسی ہی امیر ایک کے غم کو اپنے غم سمجھنے والی اور ہر کسی کی مصیبت میں کام آنے والی۔ میں جن خوبیوں کا تذکرہ کر رہا ہوں، وہ بلدیہ کا ٹکس آنے سے پہلے کا ذکر ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ اس خوش مزاج عورت میں جیسے کوئی بدروح حلول کر گئی ہو۔ ان کی اس ذہنی تبدیلی نے ہر ایک کے چہرے کی رونق کو اداسی میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہر دل سے ان کے لیے یہی دعا نکل رہی ہے کہ اللہ کے ان کی پریشانیوں کو دور ہو جائیں اور وہ دوبارہ اپنے اصلی روپ میں واپس آجائیں۔

بیکم افضل ایک معاملے میں بڑی ہی بد قسمت واقع ہوئی

بیکم افضل نہایت ہی خلیق، مہربان اور ملسار خاتون ہیں، لیکن جب سے بلدیہ عظمیٰ نے انھیں اطلاع دی ہے کہ ایک بڑی شاہراہ تعمیر کرنے کے سلسلے میں انھیں اپنے وسیع و عریض باغ کے ایک حصے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے، تب سے وہ انتہائی چڑچڑی اور بد مزاج ہو گئیں۔ نجانے انھیں کیا ہو گیا ہے، بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ وہ گزشتہ آٹھ سال سے میری پڑوسن ہیں، بلکہ دراصل میں ان کا پڑوسی ہوں، کیونکہ وہ موجودہ مکان میں تیس سال سے رہائش پذیر ہیں، جبکہ مجھے اس علاقے میں آئے ہوئے آٹھ سال ہوئے ہیں۔ میں اس بات کا برملا اعتراف کروں گا کہ میں نے ان جیسی ہنس مکھ اور خوش اخلاق خاتون نہیں

نہیں کر سکتے تو ایک سیب کھالیں۔ اسی طرح کچی گاجر میں یا کھیر ابھی بہترین متبادل ثابت ہو سکتے ہیں۔

چیونگم

والدین بچوں کو منع کرتے ہیں کہ وہ چیونگم نہ کھائیں۔ تاہم یہ دانتوں کی صفائی کرنے میں اس طرح مدد کرتی ہے کہ کونوں یا سوراخوں میں پھنس جانے والے ذرات نکال باہر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ تھوک کی مقدار بڑھاتی ہے جس سے ایسا قدرتی تیزاب دانتوں کی سطح کو ملتا ہے جو ان کی مضبوطی کا باعث بن جائے۔ جینی سے پاک چیونگم کا استعمال زیادہ بہتر ہے۔

زبان کی صفائی مت بھولیں

ہماری زبان خوراک جیسے چائے اور کافی کے ذرات اپنے نیچے دبا لیتی ہے۔ نتیجے میں اگر اس جگہ کی صفائی نہ کی جائے تو دانتوں کی بیماریوں کا سامنا ہو سکتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس صورت میں دانتوں کے امراض کے باعث بننے والے بیکٹیریا کی تعداد میں دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس مسئلے سے بچنے کا حل بہت آسان ہے یا تو اپنا برش زبان پر پھیر لیں یا زبان کی صفائی کے لیے ملنے والا آک گھر لے آئیے۔

دسلیں

کچھ مقدار میں دسلیں خواتین کے ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک دانتوں میں مشعل ہونے سے روکتی ہے۔ یاد رہے، لپ اسٹک کچھ عرصے بعد دانتوں پر داغ دھبوں کا باعث بن کر انھیں بد نما بنا دیتی ہے۔

معمولی سی توجہ اور درج بالا گھریلو ٹولوں سے آپ اپنے دانتوں کو حسین و جمیل مسکراہٹ دے سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ کسی مہنگے دندان ساز کے بی پاس جا کر، بھاری بھر کم فیس ادا کر کے دانتوں کو چمکایا جائے۔ یہ سب قدرتی طریقوں سے ممکن ہے اور سہل بھی۔

ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی خاطر کے لیے ایک چمچ نمک ایک کپ گرم پانی میں شامل کیجیے۔ پھر اسے ٹھنڈا کر کے ماؤتھ واش کے طور پر استعمال کریں۔

پنیر کا استعمال

یہ بھی دانتوں کی صفائی کے لیے ایک زبردست قدرتی غذا ہے جو دانت بھی مضبوط کرتی ہے۔ پنیر میں کیلشیم موجود ہوتا ہے جو دانتوں کی مضبوطی کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر سخت پنیر میں، جیسے چیدر چیر وغیرہ۔

ناریل کا تیل

ایک چمچ ناریل کے تیل سے دانت کو دھولیں کیونکہ یہ عمل انھیں داغ دھبوں سے بچاتا ہے۔ دانتوں کی صفائی کا یہ عمل جس حد تک ممکن ہو، دیر تک کریں۔ خاص طور پر پندرہ منٹ مثالی وقت ہے۔ اس سے بیکٹیریا کے خاتمے اور اس پر گندگی ہٹانے میں مدد ملتی ہے۔

دودھ کا زیادہ استعمال

اس فطری تخفیف میں موجود کیلشیم دانتوں کی سطح اور مجموعی ڈھانچا مضبوط کرتا ہے جبکہ جبروں کی ہڈی بھی سخت ہوتی ہے۔ دودھ کے علاوہ لیو، پانی یا ٹانک وغیرہ دانتوں کی جگہ گاہٹ بڑھانے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔

پاپ کارن

اس کو صفائی والی غذا کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ دراصل پاپ کارن کے سخت کونے دانتوں پر سے جراثیم ہٹانے یا صفائی کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے رات کو آپ اپنے دانتوں پر برش نہیں کر سکتے تو کوشش کیجیے کہ آخری غذا کے طور پر پاپ کارن کی کچھ مقدار کھالیں۔

روزانہ ایک سیب

یہ منفرد پھل ”قدرت کا ٹوتھ برش“ بھی کہلاتا ہے۔ ماہرین طب کی رو سے سیب دانتوں کی صفائی کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔ اگر کسی وجہ سے آپ دانتوں کی صفائی

تھیں، حالانکہ اس قسم کے ایسے لوگوں کو کوئی ڈکھ اور پریشانی نہیں ہونی چاہیے، لیکن قدرت کی مصلحت اور والدی بہتر جانتا ہے۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ ان کی گھریلو زندگی بڑی ہی ناکام اور قابل افسوس تھی۔ بظاہر تو یہی نظر آتا تھا کہ افضل صاحب بڑے ہی شریف اور نیک شخص ہیں اور ساری تفتیوں کی واحد ذمہ دار صرف اور صرف ان کی بیگم ہیں، لیکن... اصل حقیقت کیا ہے، یہ راز کبھی نہ کھل سکا۔ کسی کا دل یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ بیگم افضل جیسی خوش مزاج اور ہنس مکھ خاتون گھر میں سوائے لڑنے جھگڑنے اور ہک بک جھک جھک کرنے کے اور کچھ نہیں کرتیں۔ بہر حال، ایک بات تو مانتی پڑے گی کہ گھر میں خواہ کچھ بھی ہوتا رہے، وہ لوگ باہر کے کسی آدمی سے اس موضوع پر بات نہیں کرتے تھے اور یہی دکھاتے کہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

افضل صاحب کی شادی کو تیس سال گزر چکے تھے۔ اللہ جانے کس طرح انھوں نے اتنی طویل ازدواجی زندگی گزاری، لیکن شاید آخری عمر میں ان کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ چند ماہ قبل انھوں نے اپنا پورا یا ستر سینا اور اپنے گھر کو ہمیشہ ہمیش کے لیے خیر باد کہہ گئے۔ تمام اہل محلہ کے لیے سخت حیرت اور تعجب کی بات تھی کہ انھوں نے کسی سے کچھ بھی نہ کہا اور نہ جانتے وقت کسی سے الوداعی ملاقات کی۔ خاص طور پر مجھے تو یہ بات بڑی ہی شاق گزری۔ ہمارے اچھے تعلقات کی مناسبت سے ان کا یہ اخلاقی فرض بنتا تھا کہ کم سے کم مجھ سے تو ملاقات کر لیتے۔

وہ چلے گئے تو دوسرے دن بیگم صاحبہ نے مجھے اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دیتے ہوئے بتایا "افضل صاحب نے یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام عبادت میں گزاریں گے۔ وہ ایبٹ آباد میں اپنے جھیتے کے پاس رہیں گے۔ وہاں وہ پورے اطمینان اور یکسوئی سے عبادت کر سکتے ہیں۔"

ایک ہفتے بعد میں ان کی مزاج پُرسی کے لیے پھر وہاں چلا گیا۔ چائے ہمارے سامنے دھری تھی اور بیگم افضل ساکت و جامد چھت کو گھور رہی تھیں۔ پھر یکایک جیسے وہ کسی خیال سے چونک پڑیں۔ انھوں نے میری طرف نگاہ ڈالی اور بولیں، "چلو اچھا ہوا۔ افضل صاحب جہاں رہیں خوش رہیں۔ اب میں بھی اپنی عمر کا آخری حصہ اطمینان و سکون سے گزار سکوں گی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ہماری گھریلو زندگی خوشگوار نہیں تھی۔"

ان کی آواز میں بے انتہا کرب تھا۔ مجھے اپنا دل ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں سوائے زبانی دلجوئی کے اور بھلا کر بھی کیا سکتا تھا۔ بہر حال میں نے دل میں طے کر لیا کہ اب میں ان کا خاص خیال رکھوں گا اور جو بھی مدد ہو سکے، کرتا رہوں گا۔ چنانچہ جب وہ اپنے باغ کے ایک حصے کو کھودینے کے غم میں بے حد ملول اور دل گرفتہ تھیں تو میں ان کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے تھرست ہو گیا۔

"میرے باغ کا وہی حصہ سب سے زیادہ زرخیز ہے جس پر وہ قبضہ نہ کر چکا رہے ہیں۔ اگر وہ کوئی اور حصہ مانگتے، بلکہ زیادہ رقبہ بھی طلب کرتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن وہ میری بیش قیمت زمین کو بڑیوں کے مول زبردستی چھین لینا چاہتے ہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔" ان کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا اور پھر فوراً ہی وہ سسکیاں بھر نہ لگیں۔

ان کی مظلومیت کا احساس کرتے ہوئے میرا دل بھی بھر آیا۔ "آپ بالکل بھی فکر نہ کریں بیگم افضل! آپ کی مرضی کے بغیر وہ زمین کا ایک چپہ بھی نہیں حاصل کر سکتے۔ میں آج ہی بلکہ ابھی انتہائی سخت قسم کا خط انتظامیہ کو لکھتا ہوں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ وہ آپ کی زمین کے بجائے کوئی اور متبادل راستہ تلاش کر لیں گے۔" میں نے ان کی ڈھارس بندھانی اور انھیں اللہ حافظ کہہ کر اپنے گھر آگیا۔

گھر میں بیٹھ کر میں نے اس مسئلے پر سوچنا شروع کیا۔ جتنا بھی غور کیا، اتنا ہی مجھے یقین ہوتا گیا کہ میری کوشش افضل ثابت ہوگی۔ آخر بلدیہ کی انتظامیہ نے بہت اچھی طرح سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہوگا کہ شاہراہ کہاں سے گزرے گی۔ وہ لوگ بھلا ایک عورت کی خوشی کے لیے اتنا بڑا منصوبہ یکسر تبدیل کرنے سے تو رہے۔ بہر حال پھر بھی میں نے ایک موعوم سی اُمید کا سہارا لے کر درخواست داغ دی، صرف بیگم افضل کی تسلی کی خاطر۔

اور پھر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔ میری درخواست کا جواب آگیا۔ لکھا گیا تھا کہ اگر آپ کی تجویز پر عمل کیا جائے تو کروڑوں روپے برباد ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ دوبارہ نئی اسکیم ترتیب دینے اور اس کی منظوری میں بچانے لکنا عرصہ لگ جائے۔ اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے میں نے بیگم افضل کو اس فیصلے کی اطلاع دے دی۔

میں نے سوچا کہ بیگم صاحبہ پڑھی لکھی سمجھدار خاتون ہیں، وہ بلدیہ کا مکمل نظر ٹھنڈے دل سے سن کر اپنی ضد چھوڑ دیں گی، لیکن میری توقع کے برعکس وہ تو یہ سنتے ہی چراغ پا ہو گئیں اور مغالطات بکھنے لگیں۔ میں نے انھیں اس قدر شدید غصے کا اظہار کرتے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ منہ سے کف جاری ہو گیا اور چھوڑی بالوں کی لٹیں ان کے چہرے کے گرد پھیل کر ایک عجیب ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھیں۔

دانت پیستے ہوئے انھوں نے ایک زوردار منکا میز پر مارا اور گرجا آواز میں چلائیں "وہ ذرا میری زمین کو ہاتھ تو اکا کر دیکھیں۔ ایک ایک کا وہ حشر کروں گی کہ اگلے جہان میں بھی فریاد کرتے رہیں گے۔ بلڈ زرا اگر میری زمین کی حدود میں داخل ہوا تو وہ میری لاش پر سے گزر کر ہی اندر آئے گا اور مسٹر صفدر! ان کے غصے کا رُخ اپنا نک میری طرف مرو گیا۔" میں تمہاری چالاکی سمجھ رہی ہوں۔ تم مجھے یہ قیوف

بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں اچھی طرح جان گئی ہوں کہ درپردہ تم بلدیہ والوں سے ملے ہوئے ہو۔ بہتر ہوگا کہ تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور آئندہ کبھی یہاں آنے کی کوشش نہ کرنا۔"

ان کی زبان درازی کا طویل سلسلہ شاید میرے آنے کے بعد بھی ختم نہ ہوا۔ بہر حال میں بے حد شکستہ دل ہو گیا، لہذا میں نے دوبارہ ان سے ملنے کی ہمت نہیں کی۔

لیکن بیگم افضل کی ہمت کی میں داد دیے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ مجھ سے تعلقات ختم کر لینے کے بعد بھی وہ اپنے محاذ پر تنہا ڈٹی رہیں۔ مقامی کونسلر، ایمر پی اے اور ایم این اے وغیرہ کو مسلسل درخواستیں دے دے کر ان کا ناٹھ بند کر دیا۔ ان باتوں کا فائدہ ایک حد تک یہ پہنچا کہ فیصلے پر عمل درآمد میں تھوڑی سی تاخیر ہو گئی، لیکن نتیجہ بالآخر وہی ڈھاک کے تین پات۔ فیصلہ یہی ہوا کہ بیگم افضل خواہ وہ اوپلا چاری ہیں۔ ان کی ذاتی مصلحت کی خاطر رفاہ عامہ کے کام کو پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ اس فیصلے کے فوراً بعد ہی بلا تاخیر جبری خریداری کا چیک بیگم افضل کے نام جاری کر دیا گیا۔ اور پھر وہ افسوسناک اور المناک گھڑی آئی گئی۔ جسے اپنے سے دور رکھنے کے لیے بیگم افضل نے بچانے کتنی دعائیں مانگی تھیں اور بچانے کتنے وظیفے پڑھے تھے۔ بلدیہ والے ایک صبح بلڈ وزر لے کر ان دھمکے۔ اگرچہ یہ صورت حال ہم سب کو ناگوار اور نا پسند تھی، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں بھی تماش بینوں کی صف میں شامل تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں بیگم افضل کے خوبصورت اور دلکش باغ کا سنیا ناس ہو چکا تھا۔ دلفریب پھولوں اور خوشنما پھلدار درختوں کی جگہ اب مٹی کے ڈھیر نظر آرہے تھے۔ بیگم افضل کا چہرہ عجیب وحشت ناک ہو رہا تھا اور وہ بالگوں کی طرح دونوں بازو اٹھا کر فریاد کرتے ہوئے دیوانہ وار ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھیں۔ ان کی کر بناک التجائیں ہر دل کو

عافیہ مقبول جہانگیر

یقین دلانے میں کامیاب ہو ہی گئے کہ موصوف انتہائی اشرافیہ خاندان کے اکوٹے چشم و چراغ ہیں اور نہ صرف یہ خود بلکہ ان کا پورا خاندان جدی تہذیبی تعلیم پر یوں لے گھومتا ہے کہ کیا ہی کوئی بہادر جان لیے گھومتا ہوگا۔

بس پھر کیا تھا؟ محترمہ ان کی شکل و صورت کو قطعاً گھاس



فلٹر والا فلٹر

محبت سے مگر جانا ضروری ہو گیا تھا
پلٹ کر اپنے گھر جانا ضروری ہو گیا تھا

اتان چلو بھی ناکتنی دیر ہو چکی۔ وہاں وہ لوگ ہمارے انتظار میں سوکھ رہے ہوں گے۔ زیر کو ایک مل چین نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ جب سے نفیس بک پر اس پری دس، مسہوش، حور، ملکہ حسن کا شاہکار پانی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا تھا تب سے دل بے قرار پھڑک پھڑک کر باہر کیوں آ رہا تھا جیسے وہ اپنی شادی کے لیے لڑکی دیکھنے نہیں، سچا پرگو یا میڈل جیتنے کے بعد دنیا کے سامنے تقریر کرنے جا رہا ہو۔ خواتین و حضرات، یہ میری بیگم

میں نے ایسے ہی حاصل نہیں کیں۔ ہزاروں اکاؤنٹ بنا ڈالے طرح طرح کے ناموں سے نقلی آئی ڈیز بنا کر انھیں پھنسانے، میرا مطلب ہے جھانے بھانے کے بعد جا کر کہیں ان محترمہ نے تھوڑی سی لفٹ کروائی۔

لفٹ بھی کیا خاک کروائی سمجھو لٹھ مارا انداز میں آپ کون؟ کیا کام ہے؟ جیسے ”بداخلاق“ جیسے بول کر گوگول دال ناتواں ذبح کر ڈالا مگر زیر میاں بھی گٹوں کے پورے تھے۔ محال ہے جو ذرا شک ہونے دیا ہو کہ وہ بالکل انجمن، حیران، پریشان آدمیوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت اعتماد سے دو چار ادبی، علمی باتیں گھڑ کر محترمہ کو یہ

موجود ہوا۔ چند پڑوسی عورتوں کی مدد سے پولیس انسپکٹر نے بیگم صاحبہ کو ایک کمرے میں بند کر دیا تاکہ وہ سرکاری کام میں مداخلت نہ کر سکیں۔ بند کمرے میں بھی بیگم افضل کا احتجاج جاری رہا۔ وہ دروازے کو یوں پیٹ رہی تھیں جیسے اسے توڑ کر ہی دم لیں گی۔ ان کی گوبر نشانیوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، لیکن اب کسے پروا تھی۔

کھدائی کا کام پورے زور و شور سے جاری تھا۔ اچانک آپریٹرز نے بلند وزر ایک طرف کھڑا کیا اور خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا کہیں غائب ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پولیس کی ایک گاڑی سپاہیوں سے بھری ہوئی آن وارد ہوئی۔ بلند وزر آپریٹرز بھی ان کے ہمراہ تھا۔ انھوں نے آتے ہی بیگم افضل کو بند کمرے سے باہر نکال لیا۔ سب لوگ بھی سمجھے کہ حفظ ماتقدم کے طور پر وہ بیگم صاحبہ کو کہیں اور منتقل کر رہے ہیں، تاکہ زمین پر قبضے کا کام مکمل یکسوئی سے انجام دیا جا سکے۔ کام مکمل ہوتے ہی انھیں رہا کر دیا جائے گا۔

پھر کبھی احتیاط میں نے آگے بڑھ کر پولیس افسر سے دریافت کیا کہ وہ لوگ بیگم صاحبہ کو کہاں اور کیوں لے جا رہے ہیں اور ان کی واپسی کب تک متوقع ہے؟ پولیس افسر کے جواب نے مجھے اور وہاں پر موجود لوگوں کو حیران و ششدر کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا، ”آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ہم بیگم افضل کی مدد کو آئے ہیں نہ ہمیں کسی اور کی طرف داری کرنی ہے۔ ہم انھیں گرفتار کر رہے ہیں۔ کھدائی کے دوران ایک انسانی لاش برآمد ہوئی ہے اور ہمیں شبہ ہے کہ یہ مسٹر افضل کی لاش ہے۔ مزید تفصیل آپ لوگوں کو اخبارات کے ذریعے مل جائے گی۔“

اب ہم سب لوگ جان گئے کہ مسٹر افضل ایبٹ آباد نہیں گئے تھے بلکہ بیگم افضل نے اپنے شوہر نامدار کو عدم آباد روانہ کر دیا تھا۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ انھوں نے لاش اسی قطعہ اراضی میں دفن کر دی جواب بلند یہی عظیمی کو درکار تھا۔

خون کے آنسو لاری تھیں۔

”لڑک جاؤ! اللہ کے واسطے لڑک جاؤ۔ ان نازک پھولوں اور پھل دیتے ہوئے درختوں کو مت برباد کرو۔ میں کہتی ہوں... اللہ کے واسطے مجھ پر رحم کرو۔ یہ زمین ہماری نہیں ہے۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی کی زمین یوں لے رچی سے روئے ڈالو۔“

ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اور اگلے ہی لمحے وہ بلند وزر کے سامنے لیٹ گئیں۔ شاید ان کا پیرا چاک پھسل گیا تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے باغ کی پامالی کا صدمہ عظیم برداشت نہیں کر پائیں۔ بلند وزر کی ظالمانہ کارروائی روکنے کا یہی آخری طریقہ ان کی سمجھ میں آیا۔

بلند وزر ڈرائیور نے مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے جلدی سے بریک پر پاؤں رکھ دیا، ورنہ بیگم افضل کے کیلے جانے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ اس نے نیچے اتر کر بیگم صاحبہ کو شانوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بڑے انکسار سے انھیں سمجھانے لگا۔ شاید وہ بھی ان کی ذہنی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ ”محترمہ خاتون! یقین کیجیے میں بالکل بے قصور ہوں۔ مجھے تو بس اپنی ذمہ داری نبھانی ہے۔ میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ بلند وزر پر جا بیٹھا۔

لیکن بیگم افضل پر تو غصے کا بھوت سوار تھا۔ انھوں نے بلند وزر کے سامنے سے ہٹنے سے صاف انکار کر دیا اور ان کی زبان سے مغالطہ کا طوفان امنڈ پڑا۔ آپریٹرز یقیناً کوئی شریف آدمی تھا۔ وہ بیگم صاحبہ کو یونہی بٹکا جھٹکا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ پڑوس کے ایک مکان سے اس نے اپنے کسی افسر کو فون کیا اور کہا کہ ان حالات میں وہ اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتا۔ لہذا بیگم صاحبہ کو وہاں سے ہٹانے کا کوئی معقول بندوبست کیا جائے۔

اس افسر نے پولیس سے رابطہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ہمراہ موقع پر آن

نہ ڈالتے ہوئے صرف ان کے علمی ”رتے“ پر ہی دل وجان سے فدا ہو گئیں۔ بات چیت کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا اور باتوں باتوں میں ہی پتہ چلا کہ محترمہ کے گھر والے آج کل ان کے لیے کسی موزوں شریف زادے کی تلاش میں اسنے چراغ لیے گھوم رہے ہیں کہ اب تو ان کے محلے والوں کو لودھ شینک کا بھی چنداں غم نہیں رہا۔ کیونکہ حق جانے نہ جائے، ان کے گھر کا ہر فرد چراغاں کرتا محسوس ہوتا ہے۔

ادھر ذہیر نے بھی اپنی سب سے بہترین تصویر، جو بقول صرف اسی کے، ہو بہو پرانے زمانے کے چاکلیٹ ہیرو ووجید مراد سے کچھ ملتی جلتی تھی، وہی ڈی پی لگا ڈالی۔ (شکر ہے ووجید مراد حیات نہ تھے ورنہ لوگ مرنے والے کا ماتم کیا کرتے ہیں ووجید مراد کو اپنے زندہ ہونے پر بچھتاؤں کا ماتم کرنا پڑتا)۔ خیر ہمیں موضوع سے بھٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ذہیر میاں کا بھٹکانا کافی ہے اور وہ بھی در بدر۔ اس در بدر کی سمجھ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اور جب تک آئے گی ذہیر میاں اس بھٹکنے کے نتیجے میں اپنا سر پٹک رہے ہوں گے۔ تو ہوا کچھ یوں کہ ادھر ان محترمہ نے ذہیر کی تصویر دیکھتے ہی اپنا دل کھویا تو وہاں ذہیر نے ان کی ڈی پی دیکھتے ہی اپنا دل کھویا۔ جی ہاں فون کا بل جو پہلے صرف چند سو روپے تک محدود ہوتا تھا، اب ہزاروں میں بھر جانے لگا کیونکہ اب بات آگے بڑھ چکی تھی۔ تصاویر کو شرف قبولیت دونوں جانب سے بخشے جانے کے بعد فون نمبر کا تبادلہ ہوا اور پھر گفتگو لا محدود ہوتی چلی گئی۔ کس کے گھر میں کیا پکا، سے لے کر کس نے کتنی روٹیاں کھائیں اور کس نے گھر والوں سے جو بے ڈانٹ پھکار، سبھی کچھ ایسا نادر و محبوب ایک دوسرے سے ضمیر کرنے لگے۔

عشق و محبت کی رومانوی باتوں میں وہ سچائی اور حقیقت پسندی کہاں، جو گھر والوں کی لعن طعن ایک دوسرے کو سنانے میں ہے۔ محبوب کی جھوٹی سچی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے لے کر ہر شاعر کی شاعری خود پر فٹ کرنے

میں وہ حزا کہاں جو گھر کے راز ایک دوسرے کو بتانے میں اپنا نیت تھی۔ آج اماں نے کتنی بوٹیاں چھوئے تھیں کہ کھلائیں، ابا نے سستی اور لاپرواہی پر بیچارے ذہیر کو سوتیلی اولاد جیسا رویہ رکھنے تک کے طعنے دے مارے، یہ سب اپنی حور پری کو بتاتے ہوئی ذہیر یوں آبدیدہ ہو جاتا جیسے واقعی وہ ابا کی سوتیلی اولاد ہو یا ایسا لے پالک ہو جو کسی دور کے غریب رشتے دار نے صلہ رحمی و خوف خدا کے ڈراوے اور اپنی غربت کے واسطے دے کر ابا کی جھولی میں ”پھیپک“ دیا ہو۔

مدوش، (جی ہاں محترمہ کا نام بھی مدوش ہی تھا)، ذہیر کے ان ظالم گھر والوں کے ظلم و ستم پر ذہیر کے دکھوں میں برابر کی شریک ہوتی اور اسی آہ زاری و سسکیوں میں وعدے و وعید کیے جاتے کہ جس دن میں آپ کے گھر آگئی، آپ کو ماں کا پیار باپ کی چٹا بھائی کا لاڈ اور بہن کا (نہیں نہیں تو بہ تو بہ) بہن کے سوا باقی سب پیاروں کی کمی محسوس تک نہ ہونے دوں گی۔ ذہیر ٹھنڈی آہیں بھرتا اور جلد ہی اماں ابا کے ساتھ مدوش کے گھر آنے کی یقین دہانی کرواتا۔

ذہیر کی تو مانعید ہوگی جس دن ابامیاں نے اسے پاس بٹھا کر اس کے سرخروں سے شرط لگا کر سونے کی عادت سے پریشان ہو کر، خلاف عادت پچکار تے ہوئے پوچھ ہی لیا کہ آخر اسے روگ کیا ہے؟ اب یہ اور بات کہ ذہیر کو وہ پچکار کچھ کچھ سانپ کی پھنکار بھی لگی جسے اس نے اپنا واہمہ سمجھ کے جھٹک دیا۔ اب بیچارے سمجھتے تھے کہ وہ تمام دن چار پائی پر پڑا سویا رہتا ہے تو تمہیں یہ کوئی بیماری تو نہیں؟ انہیں کیا خبر کہ ذہیر سوتا نہیں بلکہ چادر کے اندر ایک عدد موہا بل فون چپکا کر، گھر کی ذمہ داریوں سے آنکھیں بند کیے اپنی مدوش کو اپنے نادیدہ دکھوں کا حال بتانے میں مشغول ہوتا ہے۔ باپ تو پھر باپ ہوتا ہے۔ ابامیاں کو بھی اپنی اس ناخلف اولاد پر ترس آ ہی گیا اور انھوں نے ذہیر کی اماں سے صلہ مشورہ کر کے حل یہ نکالا کہ برخواستہ شدہ قسم کی تنہائی کا شکار ہو چکے۔ اس سے

پہلے کہ یہ بیماری ان کے سپوت کو کہیں کا نہ چھوڑے (یا شاید ابا میاں کو کہیں منہ دکھانے لائق نہ چھوڑے) کیوں نہ ذہیر کی شادی کر دی جائے۔ ذہیر سے اس کی پسند پوچھی گئی تو اس نے جھٹ سے کہا کہ اس کے ایک دوست کے بھانسنے والے لڑکے۔ ان کو بھی اپنی بیٹی کے لیے کسی مناسب برکی تلاش ہے۔ تو کیوں نہ انھیں مناسب کے بجائے ”بہترین“ ملے۔ غریب لڑکے تو کیا، بہترین پر غریب کا حق پہلے ہوتا ہے۔ گھر والے ذہیر کی اس اعلیٰ ظرفی پر خوشی سے نہال ہو گئے۔ ابامیاں کو اچانک ہی اپنی یہ اولاد اللہ کا انعام لگنے لگی جو انھیں ضرور کسی نیکی کے عوض ملی تھی اور جو انھیں جنت لے جائے گی۔

ہاں ذہیر نے اتنا ضرور بتا دیا کہ اس نے لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا صرف ایک آدھ تصویر دیکھی ہے، وہ بھی بس دوست نے فیس بک پر دکھائی تھی۔ ابامیاں کیا جانیں فیس بک کس بھلا کا نام ہے۔ وہ تو اسے شبی مدد سمجھ اور چلنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ذہیر نے مدوش سے کہا کہ اگلی انوار ذہیر جی اماں ان کے گھر آئے گا اور پھر ایک حسین زندگی کی شروعات ہوگی۔

☆☆☆☆☆

ذہیر اماں ابا کے ساتھ مدوش کے گھر ہونقوں کی طرح منہ کھولے سامنے بیٹھی لڑکی کو تک رہا تھا جو کسی طور مدوش کی تصویر سے میل نہیں کھاتی تھی۔ کہاں وہ نیلی آنکھوں والی حسین بین نقش کی مالک دلی تیلی، مکان سے ابرو، لامی گھنسیری، پلکیں، حسین و شادابی رنگت، ملکوتی لب و رخسار اور کہاں یہ سامنے بیٹھا گوشت کا پھاڑ۔ رنگت تو سے بس تھوڑی ہی اگ، جیسے برتن دھونے والی لوہے کی جالی رگڑ رگڑ کر لے لے جھنگ تو سے کو گہرا بھرا کر نے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چڑیا کے گھونسلے نسا ہاں، جو لٹھیں کم اور جلا ہوا بھوسا زیادہ لگ رہے تھے۔ ذہیر کی آنکھوں کے سامنے مدوش کی لمبی دراز ریشمی لٹھیں بسمرانے لگیں۔ چھوٹا سا قد، بے تحاشہ وزن دار، موٹے موٹے بھدے بین نقش لیے لڑکی نما جیڑ کسی طور مدوش نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے حلق سے بے ساختہ چسچ نسا آواز نکلی، ”نہیں لیں۔“

”ہاں ہاں بیٹا! میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ ہم بھی نہیں لیں گے۔“ ابامیاں اپنا ہی راگ آلاپ رہے تھے۔

”ابا! ابا! کی بار ذہیر یا قاعدہ کر رہا۔“

”کیا ہے؟“ ابانے خشک شگیں نگاہوں سے بیٹے کو گھورا۔

انھیں ڈر لائق ہوا کہ کہیں ذہیر اس معصوم ہی اللہ میاں کی گائے، (گائے کی تشبیہ ابا کا صحیح اندازہ تھ) سے شادی کرنے سے مکر گیا تو اچھا بھلا تھہ آیا نیکی کا موقع ضائع ہو جائے گا۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اگر (خدا نخواستہ) وہ غیر مذہب کے ہوتے تو اسی وقت ذہیر کا انگوٹھا ایک کاٹنے والی چھری سے چیر کر چلا آتے، ”اٹھ بیٹا، میری ہونے والی بہو رانی کی مانگ بھر دے۔“ انھیں اس بات سے کیا سروکار کہ وہ بہو کم اور بچوں کو ڈرانے والا بھلاؤ زیادہ لگ رہی تھی۔

”اماں..... یہ وہ نہیں ہے۔“ ابا کی طرف سے مایوس ہو کر اماں کو مدد کے لیے پکارا۔

”اے کیا وہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے کی رٹ لگا رکھی ہے۔“ اماں نجانے کیوں ہیزا بیٹھی تھیں۔

مدوش نے موٹی موٹی جینس جیسی آنکھیں گھمائیں اور ذہیر کی طرف دیکھ کر غیر ضروری شرمانے کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی:

”زولی، یہ میں ہی ہوں تمہاری مدوش۔ دیکھو تو کیسے کہہ رہے ہو کہ مجھے نہیں جانتے۔ کہو تو ثبوت دے دوں۔ یاد کرو، پچھلے منگل ہی تم نے بتایا تھا کہ ٹینڈے کھانے سے تمہارا پیٹ خراب ہو گیا تھا اور تم ساری رات غسل خانے کے چسکر کاٹنے رہے تھے۔ آیا یاد؟“

مدوش نے ایسا گھٹیا راز سب کے سامنے کھول کر ذہیر پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔ اماں، ابا نے چونک کر ذہیر میاں کی طرف دیکھ کر کھٹے ہوئے سوچا، ”ناہنجار کہتا تھا کبھی بات نہیں

وادی کاغان کا بلند ترین دلکش مقام



درہ بابوسر

کھاتی سڑک اور ہی دنیا میں لے جاتے ہیں۔

ایک وادی سے نکل کر دوسری وادی میں داخل ہونے کے لیے چڑھائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے گھوم کر اوپر جائیں تو ایک نئی دنیا آپ کی منتظر ہوتی ہے۔ یوں وادیوں کا ایک کوہ در کوہ سلسلہ چلتا ہے۔ وہاں پہاڑوں کی خوبصورتی

دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مختلف رنگوں سبز، سرخ، سرمئی اور گلابی رنگ کے پہاڑیوں سے نظر آتے ہیں گویا تو سس قزح کے رنگ ہوں۔ مختلف جگہوں پر پگھلتی برف، بہتے چشمے اور آبشاریں آپ کو خوابوں کی دنیا میں لے جائیں گے۔

درہ بابوسر سے آگے چلاں اور ملگت کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس علاقے میں سفر کرتے اونچے سبز درخت اور جنگل، گھاس جابجا نظر آتی ہے۔ شاہراہ ریشم سے پہلے یہ راستہ پاک چین تجارت و آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ہزاروں فٹ نشیب میں اترتا چلاں کا راستہ مانسہرہ سے جدا ہونے والے بالا کوٹ کاغان وادی کے اس راستے کو دوبارہ شاہراہ ریشم سے جوڑ دیتا ہے۔ وادی کاغان کے اس آخری خوبصورت اور بلند ترین مقام تک جانے کے لیے یہ راستہ جولائی تا ستمبر عاثر ایک کے لیے کھلا رہتا ہے۔ تاہم مون

سون میں لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے بند بھی کر دیا جاتا ہے۔ کوہ ہمالیہ کا وہ پہاڑی سلسلہ جو کشمیر سے مانسہرہ اور وادی کاغان سے گزرتا ہے، بابوسر ناپ یا بابوسر پاس اس کا بلند ترین مقام ہے۔ موٹی کا مصلیٰ یہاں کی ایک اور بلند چوٹی ہے

ہمارا پیارا وطن اپنی خوبصورتی اور دلکشی کی وجہ سے دنیا بھر میں پہچان رکھتا ہے، خصوصاً پاکستان کے شمالی علاقے اور کشمیر سیاحتی مقامات میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وادی کاغان پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے دل کی دھڑکن ہے۔ برف کے بلند و بالا پہاڑ اور خوبصورت پھولوں سے آراستہ سرسبز میدان، آبشاروں سے گرتا پانی، ہرے بھرے جنگل، دل کے تاروں چھوتے خوبصورت اور سب سے بڑھ کر پرندوں کی میٹھی بولیاں اس دلکش وادی کی پہچان ہیں۔ اس خوبصورت وادی کا ایک دلکش نظارہ درہ بابوسر ہے۔ اس کو ”بابوسر ناپ“ بھی کہتے ہیں۔

یہ خوبصورت پہاڑی درہ سطح سمندر سے تقریباً ۱۳۶۹۱ فٹ بلند ہے۔ اس سے آگے چلاں کا مقام ہے جو ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بالا کوٹ سے درہ بابوسر کا فاصلہ تقریباً ۱۵۹ کلومیٹر ہے۔ چاروں طرف موجود پہاڑ اور جنگلات اس درے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ حیرت انگیز نظارے دل موہ لیتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے خوبصورت پہاڑ اور ان وادیوں کے درمیان دریائے کاٹھ سا تھ چلتی اور بل

یہ کیا؟ غبارے جیسا پھولا چہرہ ایک دم دہلا پڑا کسی سترہ اٹھارہ سال کی نازک و شیزہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔
”اب فلٹر نمبر تین میں جاؤ۔“

زبیر نے تین پر کلک کیا۔ اب یہ کیا.....؟ آنکھیں ایک دم نیلی نیلی اور جرتی جیسی بڑی چمکدار ہو گئیں۔
زبیر بھی موبائل کی اسکرین دیکھتا تو بھی سامنے بیٹھی جیتی جاگتی بھوتی کی طرف۔ بے یقینی سے اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

”اب فلٹر نمبر چار پر جاؤ۔“ مدوش نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

اب کی بار زبیر نے بغیر کچھ کہے نمبر ۴ کلک کر دیا۔ لمبی گھٹی زلفیں اس جیتے دیکھے حسین چہرے کا طواف کرنے لگیں۔

”اچھا اب آخری نمبر، فلٹر نمبر پانچ دباؤ پھر دیکھنا جاؤ۔“ مدوش جوش سے بولی۔ (اب تک جو بور ہا تھا، وہ کون سی حقیقت تھی، جاو ہی تو تھا)

تھوٹھ اٹھکیاں سوچیں ہیں ہم بیزاری بیٹھے ہیں آخری فلٹر دباتے ہی تصویر میں موجود بے ڈول ڈھول جیسا جسم کسی خوبصورت جل پری کے سراپے میں ڈھل چکا تھا۔ زبیر میاں کے ماتھے پر آئی پسینے کی بوندیں موبائل اسکرین پر ٹپک ٹپک کر اس حسینہ کے چہرے پر شبنم کے قطرؤں کا کام دے رہی تھیں۔ ابامیاں، جو اس ساری کارروائی کے دوران زبیر کے گھٹنے سے اپنا ٹھکانا جوڑے بیٹھے یہ سارا ”ڈیجیٹل انسان“ وجود میں آتا دیکر ہرے تھے، اب ساری بات سمجھ چکے تھے۔

انہوں نے گہرا سانس لیا اور غر آکر زبیر سے کہا۔
”گھر چل..... تیری شادی اب اسی سے ہوگی۔“
”پر اپنا.....؟“ زبیر میاں کھڑے ہوتے ہوتے لڑکھڑا گئے۔

”ہاں ہاں، (اسی سے ہوگی..... موبائل سے)۔“

ہوئی لڑکی سے، ”اوپر سے“ ایسی“ پریم کہانی؟ یہ بھی کوئی باتیں ہیں بتانے والی۔ ڈرنے من.....

”ہوسکتا ہے مدوش نے تمہیں ساری باتیں بتائی ہوں۔ ہوسکتا ہے تم اس کی کوئی دوست ہو اور اپنے ہونے والے بہنوئی سے مذاق کر رہی ہو۔ ابھی سے شرارتیں شروع.....؟“ زبیر نے شرما تے ہوئے کہا۔

”افو! اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟ اچھا سنو! دیکھو ابھی میں اپنی ایک سیلفی اتارتی ہوں۔ تم خود جان جاؤ گے کہ وہ میں ہی ہوں۔“

مدوش کسی معجزے کی بات کر رہی ہے۔ یہ شاید پاگل ہے یا مجھے بنارہی ہے۔ زبیر نے سوچا۔

مدوش نے کھٹاک سے اپنی ایک عدد سیلفی کھینچی اور مسکراتے ہوئے اپنا موبائل زبیر کو تھما دیا۔
”دیکھو اب اس تصویر کو اوپن کرو۔“

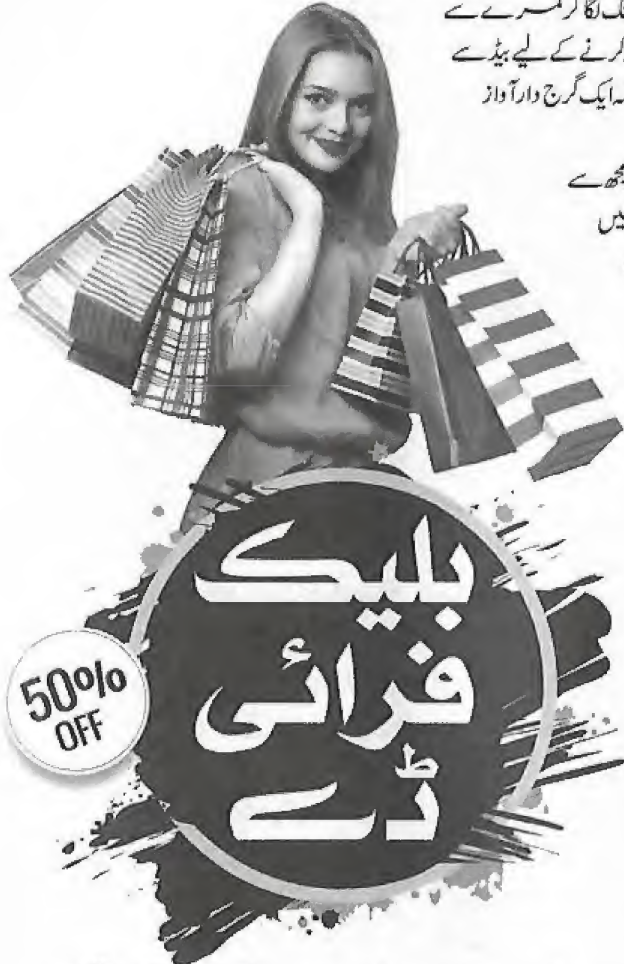
”ہاں کیا.....؟“ زبیر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں ہی عافیت جانی۔ اب کچھ تو کرنا ہی تھا اس شخص سے نکلنے کے لیے۔
”اب فلٹر اوپن کرو۔“

زبیر کو اس کی ذہنی حالت پر ایک بار پھر شبہ ہوا۔ یہاں اس کی جان پر بنی تھی اور اسے تماشے سوچ رہے تھے۔ اماں ابا چیک بیٹھے تھے۔ صرف لڑکی کی ماں مطمئن انداز میں سیٹھی چائے کے سڑپ سڑپ گھونٹ بھرتی اپنی بیٹی کو فخریہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”اب فلٹر نمبر ایک منتخب کرو۔“ مدوش نے اگلی ہدایت دی۔

ہاں کر دیا..... ہیں! یہ کیا؟ تصویر میں موجود چہرے کی رنگت یک دم چاند سے بھی دودھیا ہو چکی تھی۔
”اب فلٹر نمبر دو دباؤ۔“ اگلا حکم آیا۔

”جی جی، دباؤ۔“ زبیر نے ہکا تے ہوئے کہا۔



معاشرے کے بدلتے رجحانات کی عکاسی کرتی تحریر

صبح بیدار ہوئی تو اپنے سامنے ایک انجان وجود کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔ خوف کے مارے سانس تیز ہو گئی۔ کچھ مجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بستر سے چھلانگ لگا کر کمرے سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ عمل درآمد کرنے کے لیے بیڈ سے چھلانگ لگا دی۔ قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایک گرج دار آواز نے بلنے نہیں دیا۔

خبردار! کہیں نہیں جاسکتیں۔ تم ہمیشہ مجھ سے فرار اختیار کرتی آئی ہو لیکن آج تمہیں تمہیں کہیں بھی جانے نہیں دوں گا۔ جب تک تم میرے تمام سوالوں کے جواب مجھے نہیں دے دیتیں میں تمہیں اس جگہ سے بلنے نہیں دوں گا۔ میں نے اُسے اللہ کے واسطے دینا شروع کیے مجھے جانے دو میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں۔ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تم یہاں کیسے آئے؟ میرا تعارف سن کر تم رونوچ کر ہوا ہو گی۔ پہلے تم میرے سوالوں کے جواب دو

پھر میں اپنا تعارف کرواؤں گا۔ اب سکون سے بیٹھ جاؤ۔ میں ڈرتی کانپتی بیڈ پر بیٹھ گئی اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ”کیا تم جانتی ہو یہ کائنات کس کے لیے بنائی

ہے۔ جو بلندی سے آہستہ آہستہ نیچے اترتی وادی کا سلسلہ متعین کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس درے کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ بادل، بارش اور برف باری یہاں کا موسم خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ چونکہ یہاں آبادی نہیں لہذا آنے والے سیاح عموماً خیموں وغیرہ میں ٹھہرتے ہیں۔ اس خوشگوار موسم میں آپ کے کھانے میں گرم گرم پکڑے، سموے اور چائے ہو تو سیاحت کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔

اس درے کے راستے میں جھیل لولوسر بھی آتی ہے۔ جو لوگ جھیل لولوسر کا نظارہ کرنے آئیں، وہ اس خوبصورت درے کے دلکش نظارے اپنی آنکھوں میں سمو لیتے ہیں۔ وادی کا گافان کی سرحد کے قریب واقع اس جھیل کی خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے ہر سال ہزاروں سیاح ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ یہ جھیل ٹراؤٹ جھیل کی افزائش کے حوالے سے بھی مشہور ہے۔ مرغابیوں کی ایک کثیر تعداد قتل مکانی کر کے یہاں آتی ہے۔ مروہ اس جھیل کی خوبصورتی و دلکشی میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔

سحر انگیز نظاروں سے بھرپور یہ ایسا علاقہ ہے جس کی خوبصورتی سیاحوں کو کھینچ لاتی ہے۔ یہاں کئی خوبصورت نظارے چھپے ہوئے اور عموماً نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ان سے واقف ہونے کی خاطر آپ کو مقامی گائیڈ کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اس جھیل کے قریب ہی وہ مقام ہے جہاں سینکڑوں مجاہدین کو شہید کیا گیا تھا۔ اس مقام کو ”پوربی ناز“ کا نام دیا جاتا ہے۔

ذرائع نقل و حمل بہتر نہ ہونے سے سیاحوں کی کم تعداد اس درے کا رخ کرتی ہے۔ اگر درہ باہوسر کو سیاحتی حوالے سے اہمیت دی جائے تو نہ صرف سیاحوں کی بڑی تعداد ادھر کا رخ کرے گی بلکہ لوگوں کو درہ گار بھی مہیا ہوگا۔ یوں مجموعی طور پر قومی ملکی معیشت ترقی کرے گی۔

جس کی بلندی تقریباً ۱۳۳۷ فٹ ہے۔ یہ چوٹی اس درے کی طرف آنے والے سیاحوں کے ساتھ آنکھ پھولی کھلی نظر آتی ہے وہ یوں کہ اچانک کسی موڑ پر سامنے آ جاتی ہے۔ تب اس کے سر پر پڑی سفید برف اور دھوپ آنکھوں کو چندھیاتی ہے۔ تاہم یہ اس کے حسن میں بھی اضافہ کرتی ہے۔

درہ باہوسر ایک برفانی پہاڑی درہ ہے۔ اس لیے یہاں اسٹیشن کی سہولت نہیں۔ ہر طرف بلند و بالا پہاڑ اور برف سے ڈھکی چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ درے کے آس پاس آبادی نہیں جس کی وجہ سے کھانے پینے اور دیگر ضرورت کی اشیاء نہیں ملتی۔ چنانچہ آپ وہاں جائیں تو کھانے پینے اور دیگر ضرورت کا سامان ساتھ لے کر جائیں۔

یہ درہ اپنے برفانی حسن کی وجہ سے مشہور ہے۔ وادی کا گافان سے چلاس اور گلگت میں داخل ہونے کا راستہ باہوسر ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دور میں اس کا استعمال زیادہ ہو، تاہم اب اس درے کی اہمیت کم ہے۔ آبادی اور راستوں کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے سیاح بہت کم اس طرف کا رخ کرتے ہیں۔ باہوسر بہت اونچائی پر واقع ہے۔ سردیوں میں یہ درہ مکمل طور پر برف سے ڈھک جاتا ہے۔ جبکہ گرمیوں میں دھوپ کی وجہ سے برف پگھل جائے تو راستہ مکمل جاتا ہے۔ کہر اور بادل اکثر اس علاقے کو گھیرے رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بارش بھی ہوتی رہتی ہے۔ یہ زیادہ عرصے تک یہ درہ برف کی چادر اوڑھے رکھتا ہے۔ تاہم سیزن کے دوران یہاں ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔ اس درے کے آس پاس گھنے جنگل ہیں جہاں موجود پہاڑی پرندے اس علاقے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ مرغ ذریں اور کستوری یہاں کے مشہور پرندے ہیں۔ یہاں جنگلی جانور بھی پائے جاتے ہیں۔

باہوسر سے تھوڑا پہلے نازگار بت سے اوپر کی طرف اٹھتا اور پھیلتا ایک میدان نظر آتا ہے۔ یہ میدان انسان کو فطرت اور اس کی رعنائیوں میں محو کر دیتا ہے۔ یہ اس وادی کا آغاز

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ

- ☆ جو چٹائی جھوٹ کے مشابہ ہو، اسے اختیار نہ کرو۔
- ☆ خوف گناہوں سے بچانا ہے۔
- ☆ چٹائی کو کبھی نہ چھپاؤ۔
- ☆ کبھی تنگ نہ کرنا کسی بے گناہ کو۔
- ☆ جھوٹ رزق کو کھانا ہے۔
- ☆ خلعت قلب چاہئے تو حد سے دور رہو۔

جواب دیا۔ ابھی کچھ اور کہتی اس نے میری تھی ہوئی گردن دیکھ کر کہا، ”اکڑی ہوئی چیز جلد ٹوٹ جاتی ہے۔“

”گھل کتنے پیسے خرچ کیے؟“

میں نے لا پوراہی سے جواب دیا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ بل کریڈٹ کارڈ سے ادا کیا تھا۔“ مجھے خود بھی بل دیکھنے کا شوق ہوا۔ میں نے بیگ کھول کر بل تلاش کیا۔ بیگ کھولتے ہی بیگ میں رکھے برگر پر نظر پڑی جو کھل کھانا کھانے کے دوران بچ گیا تھا۔ میں نے اسے بیگ میں ہی رکھ لیا تھا۔

میرے ہاتھ میں برگر دیکھ کر وجود نے پوچھا۔ ”خراب ہو گیا؟“ میں نے برگر گھولا۔ سردی کی وجہ سے برگر ٹھیک تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وجود نے کہا ”شکر ہے۔“

وجود کی سوئی بل پر ہی اٹکی تھی۔ ”بل کتنا تھا؟“ میں نے اپنے سارے بل جمع کرتے ہوئے رقم بتائی۔ بل بناتے ہوئے ایک لمحے کو رکھی۔ چونکہ رقم میری توقع سے زیادہ تھی۔ سیل ہونے کے باوجود بل اٹھا رہا ہوں ہمارے ہاتھ زیادہ بنا تھا۔

مجھے اس وقت تشوکی ضرورت تھی۔ آسوصاف کر کے لیے نہیں بلکہ کل سے ہونے والے کام کی وجہ سے۔

کہتے ہوئے شاہجنگ بیگڑاس کے سامنے رکھ دیے۔ مجی نے بھی چیزیں خریدی تھیں وہ ان کے کمرے میں ہیں۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔

اس نے میری شاہجنگ دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ جس خریداری پر میں نے اتنا وقت لگا تھا۔ وجود نے اس پر ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہ کیا۔

اب وہ میری الماری کھول رہا تھا۔ ایک ایک کر کے الماری کے دروازے میرے سامنے کھلتے چلے گئے۔ مجھے اپنے کپڑے، بیگڑے، جوتے اور الماری میں رکھی ہر چیز ایک ساتھ نظر آرہی تھی۔ وجود نے ایک شرٹ نکال کر میسرے سامنے کی۔ ”یہ قمیص کتنی بار پہنی ہے تم نے؟“

میں نے ذہن پر زور دیا۔ یاد کرنے کی کوشش کی۔ ”یہی کوئی تین چار مرتبہ۔“ اس طرح اس نے دو تین قمیص نکال کر اپنے سوال کو دہرایا۔ میں کچھ سوچ کر اسے جواب دیتی گئی۔ کوئی بھی کپڑا ایسا نہیں تھا جسے میں دسویں بار پہن چکی ہوں۔ ایک بیگ اٹھا کر وجود نے کہا۔ ”یہ تو بالکل نیا ہے۔“

میں نے جواب دیا ”میں نے یہ بیگ استعمال نہیں کیا۔“ ”تم پھر دو بیگ لے آئی ہو؟“ وجود نے کہا۔

”وہ تو سیل لگی ہوئی تھی۔“ میں نے تو جیہدی۔ پھر اس نے میرے لائے ہوئے جوتوں پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے بعد جو تے ایک ڈبہ میری الماری سے نکالا اور اس پر لکھا ہوا نام باؤز بلند پڑھا۔ اس کے بعد میسرے طرف پشت کیے اس نے الماری میں موجود ہر چیز کے نام پڑھنا شروع کیے۔ اس فہرست میں بہت سے ملکی اور غیر ملکی برانڈ کے نام شامل تھے۔ ”تم نے کوئی بھی چیز کسی عام دکان سے نہیں خریدی۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”اس بات پر تو مجھے فخر ہے کہ میں برانڈ ڈچیزینز استعمال کرتی ہوں۔“ میں نے اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ

”کل سارا دن شاہجنگ کی تھی۔ بہت تھک گئی تھی۔ ہر جگہ سیل لگی تھی۔ کل بلیک فرائی ڈے تھا نا۔“ میں نے تفصیل سے جواب دیا۔

”یہ بلیک فرائی ڈے کیا ہوتا ہے؟“ وجود نے سوال کیا۔ میں نے پرجوش انداز میں بتانا شروع کیا۔ ”۲۴ نومبر کو ہر دکان پر سیل لگتی ہے۔ چیزوں کی قیمتیں کم کر دی جاتی ہیں۔ برانڈ کی دکانوں پر یہی قیمت کم کی جاتی ہے۔“

”پھر تو اسے گولڈن فرائی ڈے کہنا چاہیے۔“ وجود نے کہا۔

”اسے بلیک فرائی ڈے کیوں کہتے ہیں؟“ ذرا گولگھ تو کرو؟ یہ سن کر میں سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے اس کیفیت میں دیکھ کر وجود نے راہ دکھائی۔

میں نے بیڈ پر پڑے موبائل کو اٹھا لیا اور (History of Black Friday) کو گولگھ پر سرچ کیا۔ میرے سامنے جو معلومات آئیں میں انھیں بغور پڑھ رہی تھی۔

۲۴ نومبر کا واقعہ ہے، جب نیویارک کی گولڈ مارکیٹ کو برپا کرنے کی سازش کی گئی۔ سازش کرنے والے دو ساتھی Jay Gould, James Fisk تھے۔ ان دونوں نے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی غرض سے مارکیٹ سے سونا اٹھا لیا۔ اس خریداری کے نتیجے میں مارکیٹ تباہی کے دہانے پہنچی۔ امریکی صدر Ulysses S. Grant نے نازک صورتحال سے نمٹنے کے لیے چار ملین ڈالر سونے کی منڈی میں فراہم کرنے کا حکم جاری کیا۔ اس حکم نے امریکی معیشت کو بڑی تباہی سے بچالیا۔

یہ دن جمعہ مبارک کا تھا اور پہلی مرتبہ بلیک فرائی ڈے کہا گیا۔ یہ دن منافع خوروں کے خلاف احتجاج کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس نام کو تہدیل کرنے کی کوشش کی گئی پر کوئی بھی نیا نام عوام میں مقبول نہ ہو سکا۔

”تم نے کیا خریدا؟“

”میں نے بیگڑے، جوتے اور کچھ کپڑے خریدے۔“ یہ

گئی ہے؟ آسمان کا شامیانہ لگا گیا۔ زمین کا فرش بچھا یا گیا۔ موسم بدل کر، سورج چمک کر، بادل برس کر کس کو فائدہ پہنچا رہے ہیں؟ وجود نے سوال کیا۔

میں ہمت کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”ظاہری بات ہے انسان کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ کائنات انسان کے لیے ہی بنی ہے۔“

جواب سننے ہی اگلا سوال کیا گیا۔ ”انسان کا مرکز کیا ہے؟“

کچھ سوچتے ہوئے میں نے جواب دیا۔ انسان کا مرکز روح ہے۔

”کچھ وضاحت کریں گی آپ؟“

میں تقریری ولائل اپنے ذہن میں لائی اور اپنے مد مقابل کو چمت کرنے کی غرض سے گویا ہوئی۔ انسان کے جسم سے اگر روح نکل جائے تو وہ وجودنا کارہ ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ جسم کسی ڈاکٹر، انجینئر، وکیل یا کسی ملک کے وزیر اعظم کا ہی کیوں نہ ہو۔ چار کندھوں پر اٹھا کر اسے سپر واک کر دیا جاتا ہے۔

میرا مد مقابل قائل ہو گیا تھا یا نہیں۔ اس کے رد عمل سے میں جان نہیں پاتی۔ اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ اب وہ خاموش تھا۔ یہ وقفہ مجھے چھوڑ رہا تھا۔ وقفہ بدستور جاری تھا۔ اگلا سوال ابھی تک نہیں کیا گیا تھا۔ درحقیقت میں ان سوالوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔

”کل تمہاری نوکرائی کی بیٹی کی شادی تھی۔“ سوال کچھ غیر متوقع تھا۔ میں کسی فلسفیانہ سوال کے انتظار میں تھی۔ جس پر میں ویلیس قائم کر سکتی۔ میں نے مایوسی سے کہا

”ہاں۔“

”کل سارا دن تم نے کیا کیا؟“ وجود نے پوچھا۔ مجھے اس سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کا خوف یکسر غائب ہو گیا تھا۔



والدین اولاد کو متربانیاں دے کر
پروان چڑھائیں، تو اولاد کا بھی فرض
ہے کہ وہ ان کے لیے گھنی وٹھنڈی
چھاؤں بن جائے

برگد

کروانا ضروری ہیں ورنہ اس کا سرطان پھیل جائے گا۔
”سیر میں بیٹھنا اور غریب ہے۔ رقم کے لیے زکوٰۃ سے
انتظام کیا جاسکتا ہے مگر اس میں بھی شناختی کارڈ کی ضرورت
ہوتی ہے۔ بابا کے پاس نہ شناختی کارڈ ہے اور نہ ہی وہ کچھ بتاتا
ہے۔“ نرس بولی۔
نور محمد قبل اوڑھے لیے سوچ رہے تھے ”میری بیماری تو

نور محمد کے لیے آرام ملا۔ وہ نظام الدین کے بیٹے کی طرف پر
تشکر نظروں سے دیکھنے لگے۔
وارد دورے کے دوران انچارج ڈاکٹر سلیم کونرس نے
بتایا کہ لواحقین نے نور محمد کو داخل کروانے کے بعد دوبارہ
اسپتال کا رخ نہیں کیا۔ فون نمبر اور پتا بھی غلط لکھوایا۔ ڈاکٹر
نرس سے بولا ”علاج شروع کرنے سے پہلے کچھ مزید ٹیسٹ

رات کا گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تیز بارش ہو رہی تھی۔
بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج نے ماحول خاصا پراسرار بنا
دیا تھا۔ سخت سردی ہڈیوں میں گھسی جاتی تھی۔
بادلوں کے چھٹ جانے پہ چاند زمین پر نظر
ڈالتا تو برگد کا ایک درخت چاندنی میں
کسی بوڑھے کے مانند بھیگتا اور
سکپاتا دکھائی دیتا۔ اس کی
ڈاڑھی زمین کو چھوری تھی۔
اس نے ساری زندگی انسانوں
کو سایہ فراہم کیا تھا مگر اب وہ
تھکا تھکا سا نظر آتا۔

☆☆☆

سرکاری کینسر اسپتال میں
داخل بستر نمبر تین پر لیٹے نور محمد
کو پھر کھاسی کا دورہ پڑا۔ وہ
بھیچڑوں کے سرطان میں مبتلا
تھے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے کوئی
انھیں لیٹے نہیں آیا تھا۔ بستر نمبر
آٹھ پر لیٹے مریض نظام
الدین کے بیٹے نے نرس کی
منت سماجت کی تب وہ نور محمد کو
دیکھنے آئی۔ انکسشن لگنے پر نور

کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ میں نے سر اٹھایا تو کمرے میں کوئی
نہیں تھا۔ ابھی میں جس سے بات چیت میں مصروف تھی وہ
کہاں گیا۔ میں ڈر گئی۔ بالکل ویسا ہی خوف طاری ہوا جیسے
اچانک اس کی آمد سے مجھ پر طاری ہوا تھا۔ انسان بھی کیا چیز
ہے۔ جن چیزوں سے خوف کھاتا ہے کچھ ہی دیر میں ان
چیزوں سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ ان کی غیر موجودگی اچھی
نہیں لگتی۔

میں وجود کو تلاش کرنے کمرے سے باہر نکلی۔ لاؤنج میں
دیکھا۔ ہر جگہ اسے تلاش کیا پر وہ کہیں نہیں تھا۔ گیٹ تک گئی پر
وہاں کوئی نہیں تھا۔ ممی سے پوچھا ”کوئی آیا تھا؟“
انھوں نے جواب دیا ”نہیں بیٹا کوئی نہیں آیا تھا۔“
ممی مجھے کہہ رہی تھیں۔ اٹھ گئی ہو تو اب ناشتا کرو۔ شریا کی
ماں کو بتا دو کھانا ہے۔ شریا ہی تمہارا ناشتا بناتی تھی۔ اسے تو
تمہاری پسند کا پتا تھا۔ اس کی ماں بھی سکھ جائے گی۔ صبح سے
دس مرتبہ میں شریا کو آواز دے چکی ہوں۔

اس کی ماں سے کہا ہے میں نے کہ، شریا کے شوہر سے
پوچھ لو۔ اگر وہ اجازت دے تو شریا پھر سے آنا شروع ہو
جائے۔ مجھے شریا کی عادت بہت پسند ہے۔ چپ کر کے
سارا کام کرتی ہے۔ اپنی ماں کی طسرح ہزار سوال نہیں
کرتی۔
مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر ممی نے پوچھا ”تمہیں کیا ہوا
ہے؟“

میں نے پھر ممی سے کہا ”کوئی تو آیا ہوگا؟“
ممی مجھے حیرت سے تنک رہی تھیں۔ میں نے چند قدم
اٹھائے پھر تھک کر ٹھہر گئی۔ آواز کو میں پہچان سکتی تھی۔ کہا
جارہا تھا۔

”تم نے مجھے بہت تھک تھک کر سلا یا تھا۔ پر اب میں
بیدار ہو گیا ہوں۔ اب میں تمہیں کسی شریا کی شادی پر سکون د
اطمینان سے بلیک فرائی ڈے منانے نہیں دوں گا۔“ ♦♦♦

اچھی بھلی تھی میں۔ کل زمین پر بیٹھ بیٹھ کر زکام ہو گیا۔ میں نے
خود دکھائی کی۔ ٹشو تلاش کرتے ہوئے میں نے عادتاً شریا کو آواز
دی۔ شریا میری نوکرائی کی بیٹی ہے۔ جس کی کل شادی تھی۔ ٹشو
کا ڈبہ میری طرف بڑھاتے ہوئے وجود نے پوچھا۔ ”زمین
پر کیوں بیٹھی تھیں؟“

”ریش بہت تھا۔ ہم نے بہت سے کپڑے چیریں اٹھائی
تھیں تاکہ کوئی دوسرا نہ اٹھالے۔ خواتین کی دیکھا دیکھی ہم بھی
زمین پر بیٹھ گئے اور اپنا سامان منتخب کرنے لگے۔“
”سچ کہتے ہیں عورت ناقص اٹھل ہوتی ہے۔“ وجود
نے تبصرہ کیا۔ میں ابھی غصے کا اظہار کرتی کہ اگلا سوال داعسا
کیا۔

”شریا کی شادی کا تحفہ کیا دیا؟“

”میری بہت سی چیزیں جواب میں استعمال نہیں کرتی۔“
”کوئی نئی چیز نہیں دی؟ پیسے نہیں دیے؟ تاکہ وہ اپنی
مرضی سے کچھ لے سکتی۔ میں خاموش ہو گئی کیونکہ میرے علم
میں نہیں تھا کہ ممی نے اسے کچھ دیا ہے یا نہیں۔ مجھے شریا یاد آ
گئی۔

پچھلے کئی برس سے وہ میرے سارے کام خاموشی سے
کرتی آتی تھی۔ چاروں سے وہ مجھے نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے
ہوتے ہوئے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اسے اتنا یاد
کروں گی۔ وہ چپ چاپ میرے اور گھر کے ہر فرد کے کام
کرتی تھی۔ وجود کی موجودگی کو یکسر فراموش کر کے اب میں شریا
کے بارے میں سوچتی چلی گئی۔ نام و پیشان ہوتی تھی۔ میں
نے اس خاموش مددگار کے لیے ایک تحفہ بھی نہ خریدا۔ اس کی
شادی میں جانے کا خیال بھی مجھے نہیں آیا۔

اٹھارہ ہزار ایک دن میں خرچ کر دیے۔ شریا اور اس کی
ماں کو ہمارے گھر سے ملنے والی اجرت اٹھارہ ہزار سے کافی کم
تھی۔ احساس ندامت کہوں یا احساس جرم، جو بھی تھا مجھے دکھ
دے رہا تھا۔ میری سوچوں کا سلسلہ مو بائل پر آنے والے مسج

بڑھ گئی ہوگی۔ جس طرح برگد کا درخت دوسروں کو آرام پہنچاتا ہے اسی طرح میں نے بھی زندگی بھر سبھی کو سکون پہنچانے کی کوشش کی مگر آخری وقت کوئی میرے کام نہ آیا۔“

وہ سوچوں میں گم تھے کہ کسی نے ان کے بیڑ پر ہاتھ رکھ دیا۔ منہ سے چادر ہٹا کر دیکھا کہ نظام الدین کی چار سالہ پوتی سلمیٰ سگریٹ کے خالی پیکنوں سے بنا کھلونا ٹرک ہاتھ میں لیے کھڑی تھی جس میں کولڈ ڈرنک کے ڈھکنے والے پیسے لگائے گئے تھے۔

”یہ بولہ بالا میں تمہارے لیے لائی ہوں۔“ نفھی بولی۔
نور محمد نے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور اسے کچھ پیسے دینے کی خاطر تکیے کے نیچے پیسے ٹوٹے لگے مگر وہاں کچھ ہوتا، تو ٹکٹا۔ انھوں نے لگا ہوں پچی کر لیں۔ نفھی سلمیٰ بھاگ کر اپنے دادا کے پاس چلی گئی۔ نور محمد نے نظام کے بستر کی طرف دیکھا اور سوچا:

”کتنا خوش نصیب ہے نظام۔ ہر وقت اس کے پاس تیار دار موجود ہوتے ہیں۔“ وہ حسرت و یاس میں ڈوب گئے۔ ”مگر نہیں“ ان کے دماغ میں ایک دم آیا۔ ”میسری تیار داری کے لیے مجھے میرے خاندان والے منع ہیں۔“
انھوں نے بستر کے نیچے پٹی کے پچوں کو کھینٹ دیکھا جو میاؤں میاؤں کرتے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ زیادہ شرارت کرنے پر ماں مارتی تو وہ اس کے پاس دیک جاتے۔ انھوں نے پھر بستر پر بیٹھنے کھٹکوں کو دیکھا۔ تنہائی کا امارد نصیب بوڑھا جو انوں اور کیزے مکڑیوں کو ہی اپنا ہر دیکھنے لگا تھا۔ سچ ہے، دوسروں کی بے اعتنائی کا احساس کسی بھی انسان کو نیم پاگل بنا سکتا ہے۔

☆☆☆

نور محمد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ انھوں نے سلمیٰ کا دیا ہوا ٹرک نکالا اور اس کے پیسے گھمانے لگے۔ انھیں گھماتے گھماتے گویا وہ ٹائم مشین میں بیٹھ کر برسوں پیچھے چلے گئے۔ تب ان کی

زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔ وہ اپنے کنبے کا بہت خیال رکھتے۔ اچھے سے اچھا کھانا پینا۔ کپڑے سال میں تین دفعہ بنائے جاتے۔ بیوی بچوں کی ذرا سی تکلیف۔ پردہ تڑپ جاتے۔

ریٹائرمنٹ پر ملی رقم سے انھوں نے اپنے بیٹے آفتاب کو اچھے مستقبل کی غرض سے اعلیٰ تعلیم دلانے پر پے بھیج دیا۔ کچھ عرصے بعد آفتاب نے وہاں شادی کر لی۔ پیسا بھیجتا تو درکنار اس نے گھر والوں کی خبر تک نہ لی۔ بیوی کے سرطان کا علاج کروانے کے لیے انھوں نے ملے جلے والوں سے رقم ادھار لی۔ سوچا تھا کہ بیٹا رقم بھجوائے گا تو وہ واپس کر دیں گے۔

مگر کوئی رقم نہ آئی۔ بیوی کا انتقال ہو گیا اور وہ اکیلے رہ گئے۔ کئی دفعہ بیٹے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ پنشن بھی پابندی سے نہیں ملتے تھی۔ جب لوگوں نے ادھار واپسی کا تقاضا کیا تو انھوں نے ملے جلے والوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کئی ماہ سے کرایہ نہ دینے کے باعث مالک مکان نے ایک دن انھیں گھر خالی کرنے کا کہہ دیا۔

دوسرے بیٹے مہتاب کے آوارہ دوستوں نے اسے کہیں کانہ چھوڑا تھا۔ وہ نشہ کرنے لگا۔ کئی سالوں سے اس کی بھی کچھ خبر نہ تھی۔ تنہائی اور اندھیرا اب یہی دونوں ان کے ساتھی تھے۔

وہ کچھ عرصہ رشتہ داروں کے گھر رہتے رہے۔ پھر مسلسل کھانسی کی وجہ سے انھیں خیراتی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ بعد ازاں ان لوگوں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ رشتہ داروں نے اسپتال میں اپنا پتا بھی غلط لکھوا دیا تھا۔

☆☆☆

”تیار کی مکمل ہے؟“ ڈاکٹر اسلم نے نرس سے پوچھا۔
”جی سر“ نرس نے جواب دیا۔ ”میں نے خاکروب، وارڈ بوائے اور مالی سے کہہ دیا ہے۔ وہ دس پندرہ رشتہ داروں کو

لے آئیں گے۔ ان کے ساتھ تیار دار بھی ہوں گے۔“
”خیال رکھیں، وزیر اعظم کا دورہ ہے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو اور ہاں، صفائی کا خاص خیال رکھیے گا۔“ ڈاکٹر صاحب بولے۔

”آپ فکر نہ کریں سر، کام پکا ہوگا۔“ نرس نے جواب دیا۔
”کیا مریضوں کو این۔ جی۔ او کی طرف سے دیے گئے ٹیکہ لگا دیے گئے ہیں؟“ ڈاکٹر اسلم نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”جی سر“ نرس نے مسکرا کے جواب دیا۔
”مریض کو پتا بھی نہیں چلتا کہ اسے اصل دوا کی جگہ گلوکوز کا انجکشن لگا دیا گیا ہے۔“ نرس فخر سے بولی۔ ”نظام الدین کے گھر والے بڑے کایاں بنتے ہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک دیتی ہوں۔“
ڈاکٹر صاحب نے نرس کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا ”یہاں مریض قسمت ہی سے ٹھیک ہوتے ہیں۔“

”سر میرے لڑکے نور محمد کے بیٹے بن کر ساتھ بیٹھ جائیں گے۔“ نرس بولی۔ ”میں نے انھیں سمجھا دیا کہ پوچھنے پر انھیں وزیر اعظم سے کیا کہنا ہے؟“ نرس نے پھر لڑکوں کے کہا ”ڈاکٹر صاحب کو سبق سناؤ۔“

”سر یہاں مریضوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمارے اب کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ دوا اور کھانا وقت پر دیے جاتے ہیں۔ صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔“ لڑکے طوطوں کی طرح بولنے لگے۔

”شاباش نرس“ ڈاکٹر اسلم مسکرائے۔

☆☆☆

رات کو نور محمد نے ٹرک کے پیسے گھمائے، تو پھر یادوں کی پٹاری کھل گئی اور وہ ماضی میں پہنچ گئے۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ”نور محمد اٹھو۔“ بیوی کی گھبراہٹ آواز آئی۔ ”دیکھو آفتاب کی سانس تنگی زور سے چل رہی ہے۔ رنگ بھی نیلا پڑ رہا ہے۔“

نور محمد نے اٹھ کر جگر گوشے کو دیکھا تو لگا کہ ان کا رنگ بھی نیلا ہو گیا۔ وہ گھبرا کے باہر بھاگے اور پڑوس کا دروازہ پیسنے لگے۔ پڑوسی شہر یار آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔

”کیا ہوا چاچا؟“ خیریت تو ہے!“ اس نے پوچھا۔
”بیٹا..... وہ..... میرے بچے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ جلدی سے موٹر سائیکل نکالو۔ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہے۔“ نور محمد گھبرائے ہوئے تھے۔

”چاچا پریشان نہ ہوں، اللہ خیر کرے گا۔“ شہر یار نے انھیں تسلی دی۔ نور محمد آن واحد میں آفتاب کو کبل میں لوپیٹ گود میں لیے باہر آئے۔ منٹوں میں وہ ہستی کے مشہور ڈاکٹر قطب الدین کے کلینک پہنچ گئے۔ وہاں مریضوں کا ہر وقت جھوم رہتا۔ ہستی والوں کے مطابق اللہ نے اس کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی۔ اس وقت بھی مطب میں مریض موجود تھے۔
”ڈاکٹر صاحب..... ڈاکٹر صاحب!“ نور محمد گھبرائے ہوئے بولے ”میرا بچہ بہت بیمار ہے۔ پہلے اس کو دیکھ لیں۔“

قطب الدین دوسرے مریضوں کو چھوڑ کر بچے کا معائنہ کرنے لگا۔ نور محمد کو تسلی دی۔ بچے کو آسپین لگائی اور انجکشن دیا۔ نور محمد گھبراہٹ میں بغیر جوتی اور جزی پہنے ڈاکٹر کے پاس چلے آئے تھے۔ کچھ دیر بعد آفتاب کی طبیعت بہتر ہوئی تو وہ اسے گھر لے آئے۔ نور محمد اور بیوی نے سکھ کا سانس لیا۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے شہر یار کے بھی احسان مند ہوئے۔ اگلے روز نور محمد نمونیا کا شکار ہو گئے مگر انھیں اپنی پروا نہیں تھی۔ وہ مطمئن تھے کہ ان کا بچہ صحت یاب ہو گیا۔

☆☆☆

اچانک وارڈ میں کھلبلی مچ گئی۔ نظام الدین کے سینے میں شدید درد اٹھا تھا۔ وہ دوسرے ترے پہنچے لگا۔ بیٹا دوڑتا ہوا ڈاکٹر کو

آئیے...

کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریے

خزینہ مکتب



کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جو مسلم عاقل و بالغ ہو اور اس کے پاس سفر کا خرچ موجود ہو، تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب حج کا سفرنامہ ہے۔

جناب میاں محمد آصف اعلیٰ پولیس آفیسر رہے ہیں۔ انھوں نے بڑے جذبے اور روحانی کیفیت میں یہ سفرنامہ حج لکھا ہے۔ وقتاً فوقتاً حج کرنے کا طریقہ بھی بڑے سہل انداز میں بتایا ہے۔

ان مفید معلومات نے سفرنامے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ سفرنامہ حج لکھنا بڑا انھن کام ہے کیونکہ معمولی سی غلطی بھی کیے کرانے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ تاہم مصنف نے سب سے داری کا مل طور پر نبھائی ہے۔ سفرنامہ پڑھ کر قاری کو کسی قسم کی تنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ کتاب کے پانچ حصے ہیں جن میں حج سے وابستہ ہر پہلو کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب عمدہ کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ تین سو سے زائد صفحات پر

نام کتاب: دید آمد کا موسم، مصنف: میاں محمد آصف، ناشر: باب حرم بکلی کیشور، بلاک ایٹکس، نیو میٹلاٹ ٹاؤن، سرگودھا۔ فون نمبر: ۲۲۲۶۶۶۶-۳-۲۸-۰۴۸، قیمت: ۵۰۰ روپے۔

حج دین اسلام کا ایک اہم رکن ہے جس کے ذریعے مسلمان اللہ تعالیٰ کے گھر، خانہ کعبہ حاضری دیتے اور عبادت الہی



بائے گیا۔ ڈاکٹر بڑا اتار آتے اور آنکھیں ملتا ہوا آیا:

”کیا ہو گیا ہے۔ تم لوگ سکون سے سونے بھی نہیں دیتے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”ڈاکٹر صاحب، ابائے سینے میں شدید درد ہو رہا ہے۔“

نظام الدین کے بیٹے نے گھبراتے ہوئے کہا۔
ڈاکٹر نے نبض دیکھی، سینے پر اسٹتھو اسکوپ لگا دیا اور بولا
”انہیں دل کے اسپتال لے جاؤ۔ لگتا ہے دل کا دورہ پڑا ہے۔“

ڈاکٹر نے ایبولنس منگوانے کے لیے فون گھما دیا۔ نظامو کے گھر والے رونے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایبولنس آ گئی۔ مریض کو دل کے اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ نور محمد نے نظامو کی صحت کے واسطے دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔

صبح وار ڈاکٹر نے نور محمد کو نظام الدین کے انتقال کی اطلاع دی۔ انھیں لگا جیسے کسی نے ان کا دل آہنی پتھر میں دبا دیا ہو۔ ”نظام الدین تو صحت یاب ہو رہا تھا۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا؟“ انھوں نے اپنے آپ سے کہا اور رونے لگے۔

☆☆☆

عرس کا تیسرا دن تھا۔ لوگ مزار پر منتیں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے آئے ہوئے تھے۔ ”تاجدار حرم۔ ہو نگاہ کرم“..... محفل سماع زوروں پر تھی۔ لوگوں کا جم غفیر تھا اور کھوے سے کھواچھل رہا تھا۔

”ماسی، کتنی تھیلیاں باقی رہ گئی ہیں؟“ ایک آدمی نے پوچھا

”صاحب جی، پانچ چھ ہوں گی۔“ ماسی نے ٹوکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بیگم اجدلی باتو، رش بہت ہو گیا ہے۔“ آدمی نے بیوی سے کہا۔

”یہ یو بابا..... یہ یو بیٹا..... یہ یو اماں۔“ آدمی کہتا جاتا۔

☆☆☆

بستی میں آئے شدید طوفان باد و باران نے برگد کو بھی زمین بوس کر دیا۔ پرندے دوسرے آشیانے کی تلاش میں برگد کو تنہا چھوڑ گئے۔ کچھ دیر تک تو اس کی شاخیں سیلابی پانی کے اوپر یوں نظر آتی رہیں جیسے وہ مدد کے لیے چیخ رہا ہو پھر سیلاب نے اُسے بھی اپنے دامن میں چھپا لیا۔

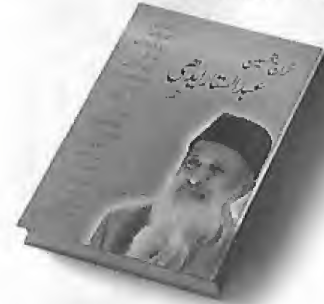
مشتمل کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ چھپائی عمدہ ہے اور پبلیکیشن بہت معیاری۔ اس بابرکت کتاب کو اپنے کتب خانے کا حصہ ضرور بنائیے۔

نام کتاب: ڈاکٹر نذیر علی کیس۔ ترتیب: چودھری محمد یوسف ناشر: اخوان بکلی کیشور۔ جہانگیر کالونی، کھوکھر کی، گوہر انوالہ۔ قیمت ۲۵۰ روپے۔ فون نمبر: ۳۲۱-۴۶۰۲۶۲۴۔



جرم و مزاکہ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اس کتاب کو معلومات افزو پائیں گے۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ معیاری ہے۔

نام کتاب: خراج تحسین عبدالستار ایڈمی باقصور۔ مصنف: مقصود احمد چغتائی۔ ناشر: ولید پبلشرز، ۳۹۴۔ بلاک 4-G، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور۔ قیمت ۲۰۰۰ (دو ہزار) روپے۔ فون نمبر: ۳۳۳۳۳۳۳۳۔



نام کتاب: کشف المحجوب اور اکیسویں صدی۔ مصنف: ڈاکٹر عازم بیگ قادری۔ پبلشر: جیلانی اینڈ سنی، زیر مسلم مسجد بیرون لوہاری گیٹ، لاہور۔ قیمت ۵۰ روپے۔ رابطہ: ۰۱۱-۳۲۴۳۰۰-۳۲۴۳۰۰۔



کچھ سال پہلے میں نے کشف المحجوب کا ایک اردو زبان میں نسخہ بہت شوق سے خریدا تا کہ اس جہد و دروس میں بھی آسان زبان میں ایک ایسی نافع کتاب کا مطالعہ خیر کا باعث بن سکے۔ لیکن پوری کتاب پڑھ ڈالنے کے بعد بھی بہت سے اسرار و رموز ایسے تھے جن سے پردہ اٹھانے کے لیے غصیر معمولی ذہانت اور وسیع علم کا ہونا بہت ضروری امر تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ عام علم اور احساسات و محسوسات کے حامل انسان کے لیے کشف المحجوب پڑھنا تو شاید آسان ہو مگر اس کے اندر پوشیدہ ایک جہان کو کھوجنا عام انسان کے بس کی بات ہرگز نہ تھی۔ تب مجھے ”کشف المحجوب اور اکیسویں صدی“ پڑھنے کا موقع ملا گویا میرے دل کی مراد برآئی۔ اس مختصر مگر جامع متن کی حامل اپنے آپ میں مکمل کتاب نے جیسے کشف المحجوب کے مشکل اسرار و رموز عام فہم کر دیے۔ مصنف محمد امین عازم بیگ قادری جیسی گراں قدر اور جلتی پھرتی یونیورسٹی کا درجہ رکھنے والی شخصیت نے کشف المحجوب کی گویا نہ صرف تلخیص کر دی بلکہ اصل نسخے کی خوبصورتی کو بھی چارچاپ ندلگا دیے۔ میری ذاتی رائے میں ہر گھر میں اس کتاب کا ہونا زحمت ضروری ہے۔ خاص طور پر نوجوان نسل کے لیے بحیثیت مسلمان اور اچھا انسان بننے میں یہ کتاب بے حد نافع ہے۔

کمپیوٹر اور ذرائع ابلاغ کے اس تیز رفتار بے ہنگم دور میں اپنے دین پر قائم رہنا اور اپنے اسلاف کو پہچاننا بے حد ضروری ہے۔ لہذا یہ تلخیصیں کتابت محض عازم بیگ قادری کے لیے صدقہ جاریہ کا درجہ رکھتی ہے۔ جنہوں نے ہر عمر اور علم کے ہر درجے کے انسان کے لیے کشف المحجوب تک رسائی کو ممکن بنایا اور اس کی تعلیم کو نہ صرف بڑوں بلکہ بچوں کے لیے بھی آسان پیرائے میں منتقل کر دیا۔ اللہ جل شانہ محمد امین عازم بیگ قادری صاحب کو صاحب دین کی اس راہ پر قدم بہ قدم کامیابی و کامرانی عطا فرمائے اور وہ یونہی بنی نوع انسان کو آسانیاں بانٹتے رہیں۔ (آئین)

نام کتاب: ریڈیو پاکستان میں تیس سال۔ مصنف: انور سعید صدیقی۔ ناشر: توکل اکیڈمی، دکان نمبر ۳۱، نوشین میٹرو، ایف اے بازار، کراچی۔ فون ۴۱۷۱-۳۲۲۱۷۱۔ قیمت ۹۵ روپے۔



یہ دلچسپ اور رنگارنگ واقعات سے بھرپور آپ بیتی ہے جس میں ریڈیو پاکستان کی تاریخ بھی جھلکتی ہے۔ مصنف نے ۱۹۷۷ء میں ریڈیو پاکستان سے ناسا جوڑا اور کنٹرولر نیڈی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ تیس سالہ پیشہ ورانہ زندگی کے دوران انور سعید صدیقی صاحب جن تجربات اور واقعات سے گزرے، وہ انھوں نے اپنی اس خودنوشت میں بیان کر دیے۔ آپ بیتی کے کئی واقعات سبق آموز ہیں۔ مصنف نے ان علمی، ادبی، سیاسی شخصیات اور فنکاروں کا بھی تذکرہ کیا ہے جن سے دوران ملازمت ملاقات ہوئی۔ ان ہستیوں کے مختصر

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی پتنگ چڑھی ہوئی تھی۔ روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے نے عوام کو اپنے حبال میں پھنسا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے، پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں بیشر نشینیت لیت لیں۔ تاہم ضلع ڈیرہ غازی خان میں جماعت اسلامی امیدوار، ڈاکٹر نذیر احمد نے پیپلز پارٹی کے امیدوار اور مرحوم صدر، فاروق لغاری کے والد کو شکست دے دی۔ ڈاکٹر نذیر احمد ہومیوپیتھ تھے اور ضلع کے غریب لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اسی سماجی خدمت کے بل بوتے پر وہ رکن قومی اسمبلی بننے میں کامیاب رہے۔ قومی اسمبلی میں پھر ڈاکٹر صاحب نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسیوں کو شدید کا نشانہ بنایا۔ اکثر وہ اپنے دلائل سے حکومتی وزراء کو زچ کر دیتے۔

بھٹو صاحب کی اتنا کسی ناقد کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ چنانچہ خیال ہے کہ ان کے اشارے پر جون ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر نذیر احمد کو قتل کر دیا گیا۔ زیر تبصرہ کتاب میں اسی قتل اور متعلقہ پولیس مقدمے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

خاکوں میں بھی دلچسپ اور پڑھنے کے لائق معلومات ملتی ہیں۔ مصنف نے بعض واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ معلومات کی فراوانی کے سبب انھیں پڑھنا بوجھ نہیں لگتا۔

جنرل مشرف کے دور میں انور سعید صاحب کو صوبہ سندھ میں شعبہ صحافت میں بدعنوانیاں پکڑنے کی مہم کی انخارج بنایا گیا تھا۔ اس مہم کی تفصیل بھی انھوں نے قلمبندی کی ہے۔ لگھتے ہیں کہ تب چار ہزار ڈیڑی اخبار بند کیے گئے۔ یعنی یہ اخبار مارکیٹ میں نہیں جاتے تھے، بس ان کی طبع شدہ چند کاپیاں صوبائی محکمہ

اطلاعات کے دفتر پہنچادی جاتیں۔ ان ڈی اخبارات کے مالکان سرکاری اداروں سے کروڑوں روپے کے اشتہار لے رہے تھے۔ اس دور کا ایک انوکھا واقعہ بھی مصنف نے لکھا ہے۔ ایک ڈی اخبار کے مالک کہنے لگے ”میں مانتا ہوں میرا اخبار ڈی ہے۔ لیکن میری بیٹی ایم اے فائنل میں ہے۔ اسی طرح ایک بیٹا ایم بی بی ایس کے آخری سال میں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میرا اخبار ایک سال جاری رہے۔ یوں میرے بچوں کی تعلیم مکمل ہو جائے گی۔“

انور سعید صاحب نے دریافت کیا کہ انھیں اخبار کے لیے کتنی رقم کے اشتہار ملتے ہیں؟ انھوں نے بتایا: ”محکمہ اطلاعات کی جانب سے ایک لاکھ روپے کے اشتہار ملتے ہیں۔ ستر ہزار روپے نکلے اطلاعات کے افسروں کی جیب میں جاتے ہیں۔ تیس ہزار روپے مجھے ملتے ہیں۔“

یہ واقعہ عیاں کرتا ہے کہ اطلاعات کے صوبائی محکموں میں کرپٹ افسر کس طرح کرپشن کرتے ہیں اور اشتہاروں کی بندر بانٹ کیونکر ہوتی ہے۔ کتاب عمدہ انداز میں شائع ہوئی ہے۔ کاغذ معیاری ہے۔ گونا گوں خوبیوں کے سبب اس آپ بیٹی کو اپنی لائبریری کا حصہ ضرور بنائیے۔

نام کتاب: حرمت مسلم اور مسئلہ تکفیر، تالیف: محمد یوسف ربانی، ناشر: دارالاندلس، ۴ لیک روڈ، چورجی لاہور ڈون نمبر: ۲۳۰۵۲۳-۲۲-۲۰۹۱۔ قیمت درج نہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: جس نے

ایک جان کو کسی جان کے (بدلے کے) بغیر یا زمین میں فساد کیے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے اُسے زندگی بخشی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی دی۔ (المائدہ-۳۲) کیا آیت واضح کرتی ہے کہ جو مسلمان کسی واضح شرعی وجہ کے بغیر کسی بھی انسان کو قتل کرے، تو یہ ایک سنگین جرم ہے اور یہ گناہ انجام دینے پر جہنم ٹھکانے کی۔ بدستی سے بیسویں صدی میں مخصوص مفادات کے تحت بعض علماء نے اختلاف کرنے والے مسلمانوں یا مسلم حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا جائز قرار دے ڈالا۔ اس روش نے جلد ہی عالم اسلام میں فتنے کی شکل اختیار کر لی جو مذہبی اصطلاح میں ”تکفیر“ کہلاتی ہے۔ تکفیر کے باعث پاکستان، عراق، یمن، صومالیہ اور دیگر اسلامی ممالک میں مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں کے باعث ہزار ہا مسلمان لقمہ اجل بن چکے۔

زیر تبصرہ کتاب میں وطن عزیز کے معروف داعی و خطیب، مولانا محمد یوسف ربانی نے عام فہم انداز میں مسئلہ تکفیر کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے قرآن و سنت کی روشنی میں بتایا ہے کہ خون مسلم کی عظمت و حرمت کیونکر اہم ہے لہذا تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قتال سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ تصنیف عام مسلمانوں کو فتنہ تکفیر کے جال میں بھٹنے سے بچاتی ہے۔ کتاب سفید کاغذ پر عمدہ انداز میں شائع ہوئی ہے۔ مسئلہ تکفیر کی تاریخ اور حیثیت سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم



چمن خیال



تصویر کا دوسرا رخ

کچھ عرصہ قبل عاصمہ جہانگیر کے زیر زمین چلے جانے کے بعد پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اُن کی اتنی خوبیاں بیان کی گئیں جیسے اُن میں کوئی خامی ہی نہیں اور وہ فرشتہ تھیں حالانکہ اُن کی زندگی کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اُن کے نظریات اور ظاہری اعمال کئی حوالوں سے قابل اعتراض تھے، خصوصاً اسلام اور پاکستان کے بارے میں اُن کا نقطہ نظر! وہ تقسیم ہند کی بنیاد، دو قومی نظریے کے سخت خلاف تھیں۔ اس حوالے سے اُن کی کئی تقریریں اور تحریریں آن ریکارڈ ہیں۔

عاصمہ جہانگیر بلاشبہ جرأت مند اور بے باک حسناتوں تھیں۔ اپنے پروفیشن (وکالت) اور انکمن و قانون کی پاسداری

میں اُن کا بڑا نام تھا۔ انسانی حقوق خصوصاً عورتوں کے ضمن میں اُن کی خدمات تاریخ کا حصہ ہیں۔ تاہم یہ ساری خصوصیات یوں محل نظر ہیں کہ اُن کی اپنی مخصوص سوچ اور رائے تھی۔ وہ جھوٹ اور سچ کو اپنے معیار پر پرکھتیں۔ انھوں نے جابر سلطان کے سامنے وہی کلمہ حق کہا جسے وہ خود حق سمجھتی تھیں۔ حکمرانوں کو لکارنے کا بھی اُن کا پاپا انداز تھا۔

جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے، انھیں پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق تو نظر آتے تھے لیکن مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر بھارتی فوج کے مظالم کی انھوں نے کبھی بھارت کا نام لے کر مذمت نہیں کی۔ توہین رسالت کے مرتکب سلامت مسیح کے حق میں تو آواز اٹھائی مگر امریکا میں بے گناہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والی عائشہ صدیقی کے

لیے اُن کی زبان پر تالے لگے رہے۔ نتیجے قلعہ بندیوں پر اسرائیل کے جبر و تشدد اور افغانستان پر روس کے غاصبانہ قبضے کے وقت بھی وہ خاموش رہیں۔ کیا وہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی تھی؟

وہ خواتین کے حقوق کی علمبردار تھیں لیکن زیادہ تر اُن عورتوں کی جو ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کرنا چاہتی تھیں چنانچہ گھر سے بھاگ کر آنے والی نوجوان لڑکیوں کے لیے اُن کا گھر اور دفتر پناہ گاہ تھے۔ بے شک اسلام نے بالغ لڑکی کو اپنی شادی کے معاملے میں پسند و ناپسند کا اختیار دیا ہے تاہم اس سلسلے میں والدین کے بھی کچھ حقوق ہیں جنہیں نظر انداز کرنا دین و دنیا دونوں کی نظروں میں ناپسندیدہ فعل ہے، جبکہ عاصمہ جہانگیر نے عمر بھر ایسی متعدد لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں قانونی امداد فراہم کر کے اُن کے عہدائے سہولت دیا۔

ہمارے اذلی دشمن بھارت کے ساتھ تعلقات کی بحالی بلکہ دوستی اُن کی دیرینہ خواہش تھی۔ بھلا ۱۵ / اگست کو واہگہ بارڈر پر جا کر بھارت کا یوم آزادی منانا اور بھارتی فوجیوں کے ساتھ ہنگاموں سے ڈانٹا کی پاکستانی کو زیب دیتا ہے؟

اسی پر بس نہیں، جب وہ بھارت گئیں تو انھوں نے انتہا پسند ہندو راہنما بال ٹھا کرے جیسا لباس پہن کر اور ماتھے پر تلک لگا کر اُس سے ملاقات کی۔ گاندھی کی تصویر کو ہندووانہ انداز میں پرانام کیا۔ اپنی نظارہ یاروں کی وی ٹاک میں پاکستان اور پاکستانی فوج کے بارے میں بالواسطہ یا بلا واسطہ ہندوستان کے نقطہ نظر کے تاہیک کی اور انسان دوستی کے نقاب میں وطن عزیز کی سالمیت پر حملے کیے۔ کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں۔

(محمد عارف قریشی، بھکر)

قومی بیداری و خود اعتمادی

قومی بیداری اور خود اعتمادی میں وہی رشتہ ہے جو شعر اور

تخیل میں ہوتا ہے۔ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ قومی بیداری کا مطلب ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جو اعتماد کی دولت سے مالا مال ہو۔ اس طرح ساری کی ساری قوم مختلف الاعضاء ہونے کے باوجود جسم واحد ہو جاتی ہے، اس کی روح میں ایسی یکسانی آ جاتی ہے کہ اس کی آواز اور پرواز دونوں میں یک رنگی ہو۔ قدم اٹھتے ہیں تو ایک ساتھ، ہاتھ بڑھتے ہیں تو ایک ساتھ بڑھتے ہیں۔ ہاتھیں کھلتی ہیں تو ایک ساتھ کھلتی ہیں۔ دل بولتے ہیں تو ایک ساتھ بولتے ہیں، دماغ سوچتے ہیں تو ایک ساتھ سوچتے ہیں اور یکساں سوچتے ہیں۔

مرکز ایک ہے، قیادت ایک ہے، مقصد ایک ہے، موقف ایک ہے، نصب العین ایک ہے، حمد و ستائش صرف ایک اللہ کے لیے اور تعریف و تہنیک ان کے لیے جو اللہ کے لیے لڑتے ہیں۔ ہر طرف بازوؤں میں ضرب گلیوں اور دلوں میں شہید ابراہیمی ہے، بچے معوذہ اور معاذ ہیں۔ جوان خالد جاناں ہیں۔ بوڑھے ابو عبیدہ اور عبدالرحمن بن عوف ہیں۔ غرض ایک نئی دنیا پیدا ہو جاتی ہے۔ معاشرہ کا ہر فرد اپنے فرض جان جاتا ہے۔

آج ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی بیداری کی پوری حفاظت کریں۔ خود اعتمادی کی عمارت کو متزلزل نہ ہونے دیں۔ غنیم سر پر بیٹھا ہوتا ہے نفس کی حفاظت کرنا بھی جہاد ہے۔ یہ عمر جو ہم گزار رہے ہیں، بلاشبہ فانی ہے۔ دوام صرف عمل کو ہے اور اُچی قوموں کو دوام حاصل ہوتا ہے جو اپنی انا اور خودی کو بقا دے سکتی ہیں۔

پاکستان نتیجہ ہے خاص قسم کے نظریات و تصورات کا، جب تک یہ چیزیں باقی رہیں گی اس وقت تک پاکستان کا وجود ہر خطرے اور خدشے سے محفوظ رہے گا۔ اگر اسی نظریے اور اس تصور ہی کو اپنی جگہ سے ہلا دیا جائے اور ان کی جگہ

دوسرے نظریات کو راہ دی جائے تو ظاہر ہے کہ دماغ بدل جانے سے جسم بدل جاتے ہیں۔ ایک قوم یا ملک اس وقت تک پنپ سکتے ہیں جب تک وہ اپنی آئینہ یا لوجی اور اپنی خودی سے رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ جب یہ تصور اور یہ خودی جھٹکا کھانے لگتی ہے تب ان کی دیوار کے بیٹھ جانے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر فکری موت کا نتیجہ ملی موت ہوتا ہے۔

خیبر سے لاہور تک اور لاہور سے کراچی تک نوے فیصد لوگ مایوسیوں کا شکار ہیں۔ ان کے جذبات دکھتے پھوڑے کی طرح ہیں۔ وہ مثبت سے زیادہ منفی خیالات پر سوچتے اور ایک ہزیمت خوردہ انسان کی طرح گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر چیز دھوپ چھاؤں کی طرح ہے۔ ایسے حالات میں ہمیں ضرورت ہے اپنی قومی بیداری اور خود اعتمادی کو جگانے کی۔ جس طرح ہم نے ۱۹۶۵ء میں ثابت کیا تھا کہ ہم ایک قوم ہیں، ایک ملت ہیں، جسم واحد ہیں، اسی طرح آج پھر دنیا کو بتلانے کی ضرورت ہے کہ ہم ایک قوم ہیں اور ہم ۶۵ء کی طرح ہی جسم واحد ہیں۔ ہم اپنے پیارے ملک پاکستان کے لیے اپنی ذاتی لڑائی جھگڑوں کو چھوڑ کر ایک قوم ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں ایک قوم بنائے۔ آمین ثم آمین

(حافظ محمد عدیل عمران)

قارئین کی آراء

اُردو ڈائجسٹ ایک مثالی جریدہ ہے۔ اپنی تحریروں سے وہ جس طرح انسانیت کی فلاح و اصلاح کے لیے سرگرم عمل ہے، اس پر رشک آتا ہے۔

(عائشہ خان، لاہور)

☆☆

شمارہ جنوری ۲۰۱۸ء میں ڈاکٹر محمد رفیق کی سرگرمیوں کے بارے میں پڑھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب اور

ان کی ٹیم کے حوصلے بلند رکھے۔ (سید ارشاد وارث، اسلام آباد)

☆☆

گل رنگ تحریروں سے سچا شمارہ مارچ زیر مطالعہ رہا۔ الطاف حسن قریشی صاحب کا مضمون ”لہجہ تو شائستہ ہونا چاہیے“ ایک حقیقت کا عکاس تھا۔ سفر نامہ یمن، میری پہلی محبت، کرکڑ معین علی کی داستان اور خصوصی لوگوں پر مضمون پسند آیا

(اقراء کا شرف زبیر، پشاور)

☆☆

اُردو ڈائجسٹ ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس سے میری دانش کی سال پرانی ہے۔ (نواب افشار، گاؤں مہورہ ضلع انک)

☆☆

شمارہ مارچ میں ”پیشل“ لوگوں پر لکھا فیچر پسند آیا۔ ”کیپٹن دوہ“ والی تحریر نے دماغ میں سرگردیاں سوچا کہ ہم کیا پی رہے ہیں؟ (پروفیسر ڈاکٹر حبیب ظفر انوار، کراچی)

☆☆

اُردو ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں۔ رسالے میں طبع شدہ عالمی اور قومی سیاست پر مضامین معلومات افزا اور کام کے ہوتے ہیں۔ (چودھری محمد اکرم، چک ۲۵ جنوری، ضلع سرگودھا)

☆☆

اُردو ڈائجسٹ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ تمام تحریروں شوق سے پڑھتا ہوں۔ یہ رسالہ میرا دوست، فضل رحمن، سابقہ فورمین اے ایس ٹی (AST) دہلی، بھی پڑھتا تھا مگر اب وہ گمشدہ ہو چکا۔ شاید یہ خط پڑھ کر وہ مجھ سے رابطہ کر لے۔ (احسان الہی، سیالکوٹ)

کتاب سے بہتر دوست کہاں !!! جمہوری سے بہتر کتابیں کہاں !!!

ملاقاتیں کیا کیا الطاف حسن قریشی کی معرکہ آرا کتابیں جنگ ستمبر 1965ء کی یادیں

دفاع وطن کے 17 دنوں کی داستان
نایاب قومی اور عالمی شخصیات کے انٹرویوز قیمت 1490 روپے
نادر تاریخ، پہلی مرتبہ کتابی صورت میں قیمت 1000 روپے

مجھے کیوں نکالا؟ نواز شریف کے فوج سے اختلافات اسد اللہ خان مصنف
انکشافات سے لبریز کتاب۔ سول ملٹری کے تعلقات کے چشم کشا حقائق قیمت 640 روپے

پاکستان سے بنگلہ دیش۔ اُن کی جدوجہد	860	سلطنت عثمانیہ سے جمہوریہ ترکیہ	نصیر احمد ہاشمی	400
بادشاہی سے جلاوطنی۔ بہادر شاہ ظفر	فرخ سہیل گوندی	380	تاریخ عالم	ڈاکٹر رفیعہ کریم
ترکی ہی ترکی سفرنامہ، تاریخ و تہذیب	فرخ سہیل گوندی	480	اکہتر کے وہ دن (شرقی پاکستان کے آخری 49 دن)	جہاں آرا امام
بکھرتا سماج	فرخ سہیل گوندی	380	امریکہ کی عوامی تاریخ	ہارڈ ڈون
عالمی بینکاروں کی دہشت گردی	فرخ سہیل گوندی	180	مسلمان انڈس میں	شیخ لیتن پول
سکندر اعظم۔ دنیا فتح کرنے کی تاریخ	نیر الدار برٹ لیب	540	ناموس	ناول
سلیمان عالی شان۔ تاریخ سلطنت عثمانیہ	نیر الدار برٹ لیب	520	رسول کائنات (میرتنبوی)	عبدالحکیم شمر
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	نیر الدار برٹ لیب	590	سرخ میراث	ناول
حیات قائد اعظم	ہیکٹر بولٹو	580	اُجڑے دیار	ناول
ایم ٹی وی سے مکہ تک۔ اسلام کے میرے کالیڈس	کرستیان بیکر	990	سرزمین	ناول
سندھ ساگر اور قیام پاکستان	اعتر ارا حسن	800	چلتا مسافر	ناول
ایشیا کا مقدمہ (سابق ذرا اعظم لائیبی کی کتاب)	مہا تیر محمد	300	خواب گر	ناول
دہشت گردی۔ ایک فکری مطالعہ	سلمان عابد	780	خشکے کا آدمی (مختصر روئی افسانے)	ڈاکٹر نجم احمد

مرد آہن۔ روسی صدر پوتن کی سنسنی خیز سوانح
چالیس چراغ عشق کے (ترجمہ)
کہانی جاوید الدین روی کی
ایلیٹ شفق
Rs. 380 (The Forty Rules Of Love)

Free Delivery ایک خون کا ل پر گھر بیٹھے کتاب خریدیں

جمہوری پبلیکیشنز 2۔ ایوان تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

www.jumhooripublications.com

آرڈر ڈائجسٹ 220 اپریل 2018ء

وہ جو گھر جوانی کے عہدے پر ازل سے ہے
اس کی فرمیں بھی ہیں میری جاب کی طرح

☆☆☆

امجد علی راجا



نویذ ظفر کیانی

دل میں ایک لہری اٹھی ہے ابھی
اک غزل میں نے بھی کہی ہے ابھی
چھوڑ دوں میں ابھی وزارت کیوں
اک تجوری فقط بھری ہے ابھی
کیسے محفل میں حسن کو دیکھوں
سر پہ بیگم کھڑی ہوتی ہے ابھی
چور ڈاکو پہنچ گئے پہلے
جبکہ بستی نہیں رہی ہے ابھی
شادیاں چار ہو گئیں لیکن
جان من آپ کی کی ہے ابھی
چھوڑ دے ڈانگ باہر سے بیگم
دیکھ پہلی مری جڑی ہے ابھی
بینک سے لی تھی لیز پر گاڑی
بیچ کر قسط اک بھری ہے ابھی
بعد شادی کے آگ اگلے گی
وہ حسینہ جو پھلجھڑی ہے ابھی
مجھ کو طعنہ نہ دے بڑھاپے کا
تاڑ میں میری اک پری ہے ابھی
چھوڑ سکتی نہیں ابھی وہ مجھے
ایک کوٹھی میری بیچی ہے ابھی
جاگ جائے گی قوم بھی اک دن
”غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی“

☆☆☆

آرڈر ڈائجسٹ 221

اپریل 2018ء

6-i) The Procuring Agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of bids or proposals.

ii) The procuring Agency shall upon request communicate to any bidder, the grounds for its rejection of all bids or proposal, but shall not be required to justify those grounds.

Sr.	Name of Work	Estimated Cost (Rs.)	T.S No. & dated	Tender Price (Rs.)	Last date for submission of application to purchase tenders	Last date and time for receipt / opening of tenders
1.	Department of approach road, bridge and provision of Overhead Water Tank at Hiran Minar Sheikhpura. (Construction of Pile Foundation over Bridge over Sheikhpura Distributory) (Bridge Portion only)	8.42	538/M/CB Dated 05.05.2018	10000	16.04.2018	18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm
2.	Soil Investigation Bridge over Daik Nullah Thatha Waseeran including Bhattian Wala District Sheikhpura. Length 104 Rft.	0.400	2447/M/CB dated 17.08.2017	200	16.04.2018	18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm

TENDER NOTICE

- Scaled tenders based on item rates on approved estimate (DNIT) are hereby invited for the works mentioned below from the Contractors/Firms enlisted/renewed with Communication & Works Department for current financial year 2017-18 in field of Highway Works/Bridge works and specialized in soil Investigation works.
- Tender documents can be obtained from the date of publication of invitation to bides in the newspaper from any of the below mentioned offices, upon written requested accompanys with attested copies of enlistment/upto date renewal letter, PEC License, Identity Card of Contractor/Managing Partner/Director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee inform of CDR/Bank Draft/Cashier's Cheque of any schedules Bank.
 - Commissioner Lahore Division Lahore.
 - Chief Engineer (Central Zone) Punjab, Highway Department 2-Lake Road Lahore.
 - Superintending Engineer, Highway Circle, Lahore Office adjacent (Roads Research & material Testing Institute Canal Bank Lahore.
 - The Deputy Commissioner, Sheikhpura.
 - Executive Engineer Highway Division/Sheikhpura.
 - Assistant Commissioner Sheikhpura /Ferozewala.
- Tendered rates and amounts should be filed in figures as well as in words & tenders should be signed as per general direction given in the tender documents, No rebate will be acceptable.
- Tender will be received in the offices of Commissioner Lahore Division, Lahore and Chief Engineer (Central Zone) Punjab Highway Department 2-Lake Road Lahore and will be opened simultaneously on fixed date and time by the respective Tenders Opening Committee at the above venues in the presence of intending contractors or their representatives who opt to be present.
- Conditional tenders and tenders not accompanied with Earnest Money @ 2% of the estimated cost in shape of CDR/Bank Drafts/Cashier's cheque of any scheduled Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

دانیہ صدیقی

ہست گئی۔ اس مرتبہ
دڑی بلند تھی۔
اراکائی... پورا جو بن
دے اپنے ہی...
بچی خانے میں ہی چلا
زے کی طرف پیٹھ
تھی۔ باورچی خانے
رہی مرچوں کی من
تھی۔
نے پیار سے اسے
ہٹ تھم گئی مگر وہ پللی
مانے میں سل بیٹے کی
ٹ اٹھرتی رہی۔ کرم



CNICDI

Sr.	Name of Work	Estimated Cost (Rs.)	T.S No. & dated	Tender Price (Rs.)	Last date for submission of application to purchase tenders	Last date and time for receipt / opening of tenders
3.	Soil Investigation of Proposed Bridge at Construction of Front Approach Road of QAAP Length 2.00 Km in District Sheikhupura (734.62 Kanal)	0.400	2535-41/Plg dated 08.05.2018	200	16.04.2018	<u>18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm</u>
4.	Soil Investigation of 01 No. Bridge on Dualization of Road Jandiala Sher Khan Hiran Minar Road to Chico ki Mallian via Ailama Mashraqi Park along Railway Line 11.16 Km.	0.400	3073/plg dated 17.04.2015	200	16.04.2018	<u>18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm</u>
5.	Rehabilitation of Metalled Road from Rana Town G.T Road to Audhian PSO Petrol Pump in Tehsil Ferozewala District Sheikhupura (Group No.1) Section 0.00 to 1.524 Km) Length = 1.524 Km.	42.098	314/CDB dated 21.03.2018	16.04.2018	<u>18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm</u>	<u>18.04.2018 upto 1.30 pm to 2.00 pm</u>

IPL - 3900

Executive Engineer
Highway Division Sheikhupura

Superintending Engineer
Highway Circle Lahore

دوبارہ اپنے کام میں جُست گئی۔ اس مرتبہ گنگناہٹ کی آواز تھوڑی بلند تھی۔
جو کچھ مانگے رنگ کی رنگائی... مورا جو بن گروی رکھ لے... موہے اپنے ہی...
کرم دین مجبوراً باورچی خانے میں ہی چلا آیا جہاں رضیہ دروازے کی طرف بیٹھ کے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ باورچی خانے میں لہسن، پودنے اور ہری مرچوں کی سن موہنی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”رضیہ!“ کرم دین نے پیار سے اسے پکارا۔ رضیہ کی گنگناہٹ تھم گئی مگر وہ پالی نہیں بس باورچی خانے میں سل بٹے کی مانوس سی کھٹ کھٹ ابھرتی رہی۔ کرم



پودنے کی چٹنی

سیدھے سادھے معاشرے
میں جینے والی عورت اپنی اولاد کے
لیے بھلے ہی خود کو بدل ڈالے، اپنا
سنہرا ماضی کبھی نہیں بھولتی
ایک ایسی ہی عورت کی دل گداز کہانی...

”موہے! اپنے ہی رنگ میں رنگ لے... تو تو صاحب میرا محبوب الہی... ہماری چندریا... پیا کی پگڑیا...
”رضیہ!!! اور رضیہ!! میرا توشہ دان تو دے دے۔ دیکھ مجھے آج کام پر پھر دیر ہو جائے گی۔“ کرم دین کی آواز پر سل بٹے پر تیزی سے چلتے رضیہ کے ہاتھ ذرا سی دیر کو تھمے۔
اس نے پلو سے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھا اور



چونکہ مکتبہ محمدیہ افضل انڈیا سنٹر
نیوز ایجنسی، کیاقت پور
0322-6901705, 0300-7325575

دین مسکرایا اور رضیہ کے قریب بیڑی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ رضیہ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہی۔ کرم دین نے شرارت سے اس کے گالوں کو چھوئی بالوں کی لٹ کھینچ کر کہا۔
”میری طرف دیکھ!“ مگر رضیہ نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب نہ دیکھا۔

”ابھی تک ناراض ہے کیا مجھ سے؟“ رضیہ نے شکوہ بھری لگائیں اس پر ڈالیں اور سل پر سے چٹنی سیٹنے لگی۔ کرم دین نے تڑپ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، ”بول ناراضہ! دیکھ اگر تو مجھ سے یونہی ناراض رہے گی تو میرا دل کام پر بھی نہیں لگے گا۔ اچھا مجھے معاف کر دے! کل دوستوں کی باتوں میں آکر زندگی میں پہلی اور آخری بار بیڑی کو ہاتھ لگا بیٹھا۔ میری توبہ، جو اب اس کی جانب دیکھوں بھی تو!“ کرم دین نے مزاحیہ انداز میں اپنے کان پکڑے تو رضیہ ہنس پڑی۔

”بس بس! رہنے دے کرم دین۔ جیسے میں تجھے جانتی نہیں! شادی ہوئے تیس سال ہوئے کو آئے۔ اٹھارہ سال کا جوان بیٹا ہے ہمارا! اگر تو ہی سگریٹ بیڑی کے شوق پال لے گا تو اس پر کیا اثر پڑے گا۔ کبھی سوچا ہے تو؟“ ایسے ہی زمانہ کتنا خراب ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے بیٹے کو کوئی بڑی لٹ نہیں۔ بس تو بھی باپ ہونے کے ناتے کچھ خیال کر لیا کر۔“

کرم دین نے مسکرا کر اپنی سمجھ اور دور اندیش بیوی کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر مامتا کا نور چھایا تھا۔
”ہاں ہاں جھلیے، میں بھی یہ سب باتیں سمجھتا ہوں۔ بس کیا کروں، کبھی کبھی دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ تو ہے نا مجھے سمجھانے کے لیے۔ چل اب جلدی سے میرا توشہ ان دے تو میں کام پر نکلوں۔“

رضیہ پھرتی سے اس کے لیے توشہ دان تیار کرنے لگی تو کرم دین چھپوڑنے کی خاطر بولا، ”میرے لیے پودینے کی چٹنی تائی ہے یا لاڈلے بیٹے کی ناراضگی میں وہ بھی بھول گئی؟“

رضیہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تیرے لیے پودینے کی چٹنی نہ بناؤں۔ توشہ دان میں سب رکھ دیا ہے۔ بس، مصروفیت میں کھانا ہی نہ بھول جانا۔“
کرم دین کو زحمت کر کے وہ کمریسی کرنے ڈراسی دیر لیتی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ابھری۔ رضیہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو منیر کھڑا تھا۔

”کیا ہوا منیر؟ آج تو کانچے سے اتنی جلدی کیسے واپس آ گیا؟“ رضیہ اس کی بے وقت واپسی پر حیران ہوئی۔
”ارے کچھ نہیں اماں، کالج میں دو سیاسی جماعتوں میں جھگڑا ہو گیا تو انتظامیہ نے حالات کے پیش نظر کالج جلد بند کر دیا۔ اگر کھانا تیار ہو تو مجھے جلدی سے دے دے۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

”ہاں ہاں، کھانا تو تیار ہے۔ تو ہاتھ منہ دھو لے۔ میں اتنی دیر میں کھانا لگاتی ہوں۔“

رضیہ جب باورچی خانے سے کھانا لے کر آئی تو کٹورے میں موجود پودینے کی چٹنی دیکھ کر منیر بے اختیار ہنس پڑا۔
”کیا اماں آپ بھی نا اکل رات ہی آپ کی بابا سے کتنی بحث ہوئی۔ آپ کتنا لڑیں ان سے، مگر آپ نے آج بھی توشہ دان میں پودینے کی چٹنی کے بغیر انھیں جانے نہیں دیا۔ کیونکہ آپ کو علم ہے کہ پودینے کی چٹنی کے بغیر بابا لقمہ حلق سے نہیں اُتارتے۔ بابا آپ کی اسی محبت کا فائدہ اٹھاتے ہیں بس!“

رضیہ چپ چاپ مسکراتی ہوئی کرم دین کا چھٹا ہوا کرتا سینے میں مصروف رہی۔ وہ اب بیٹے کو کیا بتاتی کہ میاں بیوی کی یہی معمولی نوک جھونک اور چھوٹے موٹے جھگڑے زندگی میں چٹنی جیسے ہی ہوتے ہیں۔ جس طرح روکھی سوکھی روٹی تازہ مسالوں اور ہسری سے بنی سوندھی سوندھی چٹنی کے ساتھ کھانے سے اس کا روکھا پن جاتا رہتا ہے بالکل ویسے ہی یہ چٹنی ان میاں بیوی کے بیچ مضبوط ڈور کے مانند تھی۔

جس کی سوندھی سوندھی خوشبو میں رضیہ کے ہاتھوں کی تھکاوٹ محبت بن کے رہتی ہوئی تو دوسری طرف کرم دین اپنی بیوی کی اس درجہ توجہ اور خیال رکھنے کی عادت پر قربان ہو ہو جاتا۔ چٹنی جیسے ان کی محبت کی زبان تھی۔

”وہیے ایک بات ہے اماں، آپ کے ہاتھ کی بنی اس پودینے کی چٹنی کا کوئی جواب نہیں! کوئی شک نہیں کہ بابا کیوں اس کے دیوانے ہیں۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ آپ سے اس چٹنی کے بڑے بڑے مرتبان بھرا کر ساری زندگی کے لیے ذخیرہ کر لوں۔“

رضیہ دھاگے کو دانتوں سے کاٹتی ہوئی بولی، ”کیوں... ذخیرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو فکر نہ کر، میرے بعد تیری بیوی ایسی ہی مزیدار چٹنی بنا کر تجھے کھلایا کرے گی۔ میں خود اپنی ہو کر پودینے چٹنی بنانا سکھاؤں گی۔“

پس کرم منیر نے زوردار تہقہ لگایا، ”اماں اب ہر کوئی بابا کی طرح خوش قسمت تو نہیں ہوتا نا۔ ضروری نہیں کہ مجھے بھی ایسی ہی خیال رکھنے والی بیوی ملے۔ آپ تو بہت بھولی ہیں۔ اور ویسے بھی، وہ بنائے نہ بنائے، میں تو آپ کے ہی ہاتھ کی چٹنی تمام عمر کھاؤں گا۔“

رضیہ نے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگاتے ہوئے کہا، ”کیوں نہیں بنائے گی۔ دیکھنا، وہ تجھے اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلائے گی۔“ منیر بدستور مسکرا رہا تھا۔

”میری پیاری اماں، بچپن سے لے کر آج تک مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی دسترخوان پر پودینے کی چٹنی موجود نہ ہو۔ یہاں تک کہ بیمار ہونے کے باوجود آپ نے کئی بار ضد کر کے سل بٹے پر ہی چٹنی پیسی جبکہ بابا نے آپ کو گرا سنڈر بھی لا کر دیا، لیکن صرف اس لیے کہ آپ جانتی ہیں بابا ہاتھ کی پیسی چٹنی پسند کرتے ہیں، آپ نے گرا سنڈر کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ مجھے کبھی حیرت ہوتی ہے کہ معمولی سی پودینے کی چٹنی کو آپ نے کس طرح اپنی وفاؤں اور چاہتوں کا پیکانہ بنا

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

لیا ہے۔“

”اماں، اماں!“ ردا بڑی دیر سے اپنی ساس کو آواز میں دے رہی تھی۔ بستر پر لیٹا استخوانی وجود سسکتا ہوا اپنے ماضی کی یادوں سے آئیں بھرتا باہر نکلا اور ڈراسی جنبش کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”اماں، یہ زہیب اور نادیہ مجھے بہت پریشان کر رہے ہیں اگر آپ ان کا ناشتا بنانے میں میری تھوڑی سی مدد کر دیں تو...“ آگے کا جملہ قصدا یوں ادھورا چھوڑ دیا گیا جیسے پوری امید ہو کہ اتنا کہنا ہی کافی ہوگا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں ہو۔ تم بچوں کو سنبھالو میں ناشتا بنا لیتی ہوں۔“ ردا کی آنکھوں میں ساس کے لیے تشکر ہلکورے لینے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں ناشتا بن کر تیار ہو گیا۔ ردا بھی جلدی جلدی دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر آگئی تھی۔ اس نے آتے ہی میاں کو آواز لگائی۔ ”آجائیں بھئی، ناشتا تیار ہے۔ آج تو آپ نے مجھے دفتر بھی ڈراپ کرنا ہے۔“ ردا نے ذیل روٹی پر کلھن لگا یا اور بڑے بڑے لقمے توڑنے لگی۔

گھر میں ایک دم خاموشی کا احساس ہونے لگا تو رضیہ نے پوچھا، ”بہو، بچے اسکول چلے گئے؟“

”جی اماں، انھیں تو میں نے ناشتا کروا کر ڈرائیور کے ساتھ اسکول بھیج دیا۔ اصل میں آج ان کی دین ہی نہیں آئی اس لیے کام باز ہنے کی تھوڑی پریشانی ہو گئی ورنہ میں آپ کو ناشتا بنانے کی زحمت نہ دیتی۔“ (اے اماں بی کا اپنے باورچی خانے میں تسلط ہو کر گزیرنا پسند نہ تھا)۔ ردا نے دکھاوے کے معذرت خواہانہ لہجے میں میاں اور ساس کی جانب دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو رضیہ بول پڑی، ”کیسی غیروں والی باتیں کرتی ہو ہو ہو، اپنے بچوں کے لیے کھانا بناتے ہوئے بھلا کوئی ماں تھکتی ہے؟ اب تم دونوں آرام سے ناشتا کرو۔“ سہری فریج میں رہتی ہوں۔“ اس نے جوش سے تازہ سہری

میں اور فریج کی طرف چل پڑی۔

کریا کو سلیقے سے جھانپتے ہوئے اچانک اس کے
نقہوں سے مانوس سی خوشبو نکلتی اور بے اختیار اس کے منہ
سے نکلا، ”ارے بہو، میں نے کل ہی سہری والے سے تازہ تازہ
پودینہ خریدا تھا۔ دیکھو تو، کیسا خوشبودار ہے! فریج کھولتے ہی
سارا باورچی خانہ مہک گیا۔ بیزار غرق ہو اس جوڑوں کے درد کا
درد نہ بل ہی اس کی چٹنی پیس کر رکھ دیتی۔ رضیہ بیگم کی تو جیسے
مرا در آتی تھی باورچی خانے میں آتے ہی۔ ایسا کرتی ہوں کہ
تمہارے میاں کو بھی میرے ہاتھ کی پودینے کی چٹنی بہت پسند
ہے۔ میں اس کی پتیاں الگ کیے دیتی ہوں تم انھیں۔“

”افوہ اماں! آپ بھی کس زمانے کی باتیں لے کر بیٹھ
گئیں۔ مجھے اب اتنی فرصت کہاں کہ پسند اور نا پسند کے
جھیلوں میں پڑوں۔ بھلا چٹنی نہیں بناؤں گی تو منیر مجھے چھوڑ
تھوڑی ندریں گے۔ ذرا سی چٹنی کے لیے کون اپنی جان جوہم
میں ڈالے۔ میرا مشورہ مامیں تو آپ بھی پودینہ مت خریدا
کریں۔ بھلا بتاؤ، اس کا فائدہ ہی کیا ہے۔ کتنی کے چند
کھانوں میں ڈالتا ہے اور وہ بھی اگر نہ ڈالو تو گزارا ہو ہی جاتا
ہے۔ اوپر سے مہک اتنی تیز کہ دماغ پر چڑھ جائے۔ اچھا،
آپ فکر نہ کریں۔ چٹنی ہی تو کھانی ہے نا۔ میں آج دفتر سے واپسی
پر سہرا سلور سے بنی بنائی پودینا چٹنی کی بوتل لیتی آؤں گی۔“

بہو کی بات مکمل ہوئی تو اُسے جیسے کوئی پرانی بات یاد آ
گئی۔ ”(ماں... تیرے ہاتھ کی چٹنی میں ذخیرہ کر کے رکھوں
گا)۔“ اس نے چونک کر بیٹے کی شکل دیکھی جو اسی کی
جانب دیکھتا ہوا کھانا ہور ہا تھا۔ ردا اپنا پرس اٹھاتی کرسی
سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلیں منیر، ویسے ہی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اب آپ
جاتے ہوئے مجھے بھی دفتر چھوڑتے ہوئے جائیں۔“ پھر وہ
چونک کر رضیہ کی جانب مڑی۔

”ارے ہاں اماں، بچے اسکول سے آجائیں تو انھیں
کھانا کھائے بغیر سوئے مت دیجیے گا اور زوہیب چاہے کتنی

بھی ضد کرے آپ اسے بھوکے پیٹ ہرگز مت سلائیے گا۔
بڑی پتیلی میں پچوں کے لیے نوڈلز تیار رکھے ہیں۔ کل شام ہی
کو میں نے زوہیب کے لیے اس کا پسندیدہ کیک بھی بیک
کیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ بھی ضرور اسے دے دیجیے گا۔ میں
نے نادیر کے لیے ملک شیک بھی بنا کر فریج میں رکھا ہے۔
آپ تو جانتی ہی ہیں کہ مجال ہے اس لڑکی کے حلق سے ملک
شیک کے بغیر کھانا اتر جائے۔“

ردا تیزی سے اپنی بات مکمل کرتی ہوئی باورچی خانے
سے نکل گئی۔ منیر بھی کھانے انداز میں اُسے الوداع کہتا ہوا
اٹھ گیا۔ رضیہ اپنی سوچوں میں گھری باورچی خانے میں ایکلی
کھڑی رہ گئی۔ اُس نے بڑھ کر فریج کھولا اور پودینے کی کٹھی
ہاتھ میں ایسے احتیاط سے تمام لیا جیسے کوئی مقدس چیز ہو۔

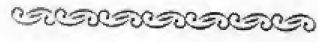
پودینے کی نرم نرم پتیاں ہاتھ سے مسلتے ہوئے اس کے رگ
وے میں نا معلوم سی تنکنا اترنے لگی یہاں تک کہ اس کے پاؤں
لرزنے لگے۔ وہ بائیں ہوتی کرسی گھسیٹ کر اس پر ڈھیر ہو گئی۔
دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہری مریچوں، ہسن،
سفید زیرے اور پودینے کی سوندھی سوندھی خوشبو اسے اپنے حصار
میں لینے لگی۔ اس پاس ہی کہیں کرم دین مسکرانے لگا۔

جانے کتنے ہی لمحے گزر گئے پھر اچانک جیسے چھنا کا سا
ہوا۔ رضیہ تڑپ کر اٹھی۔ اس نے پودینے کی کٹھی کو زور سے
کوڑے دان میں پٹھا، اسٹینڈ پر سے پلیٹ اٹھائی اور پتیلی
سے نوڈلز نکال کر اوپر تک بھر کر مزے سے میز پر پیٹھ کر دونوں
ہاتھوں سے نندیوں کی طرح نوڈلز کھانے لگی۔

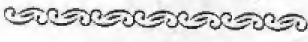
آج کے تیز رفتار زمانے میں شاید کھانے کے بل
بوتے پر دل جیتنے کا رواج نہیں رہا تھا۔ کرم دین اور رضیہ کی
سوندھی محبت کی جگہ منیر اور اس کی ملازمت پیشہ بیوی کے
فاسٹ فوڈ نے لے لی تھی۔

زکریا نے جد پایا کھارا... جس دم وجیا عشق فقارا...
دھریا سرتے نکھا آرا... کیٹا ایڈ زوال... ایس نیونہ دی
الٹی چال

جہنمی عورت



ہمارے معاشرے میں آج بھی عورت کو
خود سے بہتر دیکھنے کا حوصلہ کئی مردوں میں
نہیں۔ پاکباز، باحیا اور شکر گزار بیوی بھی
انھیں پاؤں کی جوتی ہی لگتی ہے... یا اُن
کے اندر کا احساس کمتری اور جھوٹی انا انھیں
سچ قبول کرنے نہیں دیتی۔



”اب“ تم تو بند کرو یہ ڈرامہ... سارا دن ہو گیا۔ پورے خاندان کے سامنے نمونہ بنا بیٹھا ہوں۔ کبھی یہ کہڑے پہنوں پھر سارے خاندان کے سامنے نانی نہلانے کی رسم پوری کرے گا۔ پھر سہرا باندھو... اللہ اللہ کر کے ان جھمیوں سے جان چھوٹی تو اب تو سامنے بندر یا بنی بیٹھی ہے۔ چل جا اٹھ کر مندرہو۔ ڈھنگ کے کہڑے پہن۔ اتنی گرمی میں اتنے غمرے اور رسمیں۔ غلام محمد جھلسا دینے والی گرمی میں پھول پتیوں سے بچے کمرے اور بیچ پر بیٹھی نسیم کو دیکھ کر بڑی طرح چڑا گیا تھا۔ ”اچھا جی...“ نسیم جو پچھلے دو گھنٹے سے اس صحن زدہ کمرے میں لال جوڑا اپنے اور اپنی ساس کی زیر ہدایت پورا گھوگھٹ نکالے پسینے میں شرابور بیٹھی تھی، سہم گئی۔ خوف کے مارے اس نے اپنا گھوگھٹ اٹھا کر پلنگ سے اترنے کی کوشش کی۔ سامنے ہی غلام محمد ہاروں کے ڈھیر سے لدا، لال گوٹے والا دوپٹا کندھوں پر اوڑھے غصے میں بھرا کھڑا تھا۔ گرمی، تھکن، پسینے اور کوفت نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا مگر نسیم کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اب غصے کے ساتھ ساتھ شدید حیرت بھی اتر آئی۔ سامنے سنگھار میز کے شیشے میں نسیم نے اپنی صورت دیکھی تو پہلے خود اس کی اپنی چیخ جی نکل گئی۔ پسینے اور آنسوؤں نے اس کے چہرے کو خوفناک حد تک کالا کر دیا تھا۔ سرخ جوڑے میں سے جھانکتا وہ سیاہ کالا چہرہ واقعی بیہت ناک لگ رہا تھا۔ رہی سہی کسر نہ اور غصے کے بڑے اور بے ڈھنگے سائز نے پوری کر دی تھی۔ اس حیرت کے جھٹکے کے بعد دونوں دلہا دلہن ایک دوسرے کی حالت دیکھ کر ہنس پڑے۔ دونوں ہی کارٹون لگ رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان موجود تناؤ وقتی طور پر یہی سہی مگر کافی حد تک ختم ہو گیا۔

نسیم اور غلام محمد کی شادی شدید گرمی اور جاتے ساون کے شدید جنس میں دونوں کے بڑوں نے بہت جھگڑوں کے بعد طے کی تھی۔ دونوں آپس میں ماموں پھوپھی زاد تھے۔ غلام

محمد نسیم کی پھوپھی اماں کا اکلوتا سپوت تھا۔ غلام محمد سے بڑی تین بیٹیوں کو بیاہنے کے چکر میں اس لاڈلے کی عمر بیستیس سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ نسیم کی خوبصورتی کی وجہ سے پھوپھی اماں نے یہ رشتہ بہت عرصے سے مانگ رکھا تھا۔ نسیم بمشکل سولہ برس کی ہوئی تھی اور اب اس کے آٹھویں جماعت میں فیل ہونے پر یہ شادی ہو رہی تھی۔ اگر نسیم آٹھویں جماعت پاس کر جاتی تو شادی دو سال بعد ہوتی مگر غلام محمد کی ماں اور بہنوں کی دن رات کی دعا میں رنگ لائیں۔ باقی پرچے تو ٹھیک ہوئے مگر وہ صرف حساب میں پانچ نمبروں سے فیل ہو گئی۔ اس ناکامی کا نتیجہ اس سڑی جنس زدہ گرمی میں شادی کی صورت نکلا تھا۔

معمولی شکل صورت والے غلام محمد نے پرچوں کی ایک چھوٹی سی دکان گھر کے قریب ہی کھول رکھی تھی۔ ایک ساڑھے تین مرلے کا مکان بھی اسے باپ کے مرنے کے بعد ملا تھا۔ دکان ہی اس کی آمدن کا واحد ذریعہ تھی۔ سو بہت مشکل سے اس نے شادی کے دنوں میں دو دن کے لیے اسے بند کیا تھا۔ اگلے روز وہ لیمہ تھا۔ دوپہر تک دعوت ولیمہ سے فارغ ہو کر اس نے دکان پھر سے کھول لی۔

نسیم کو اس کی اوقات کا احساس پہلے ہی روز دلایا گیا۔ اس کا حسن، کم عمری اور تعلیم اپنے باپ کے گھر یقیناً اہم ہوں گے مگر یہاں غلام محمد کی ساری محنت، اہمیت اور توجہ پانی ذات اور پھر کاروبار پر تھی۔ پھوپھی اماں کا یہ ایک ہی بیٹا تھا۔ لہذا بہو گھر پر حاوی ہو جائے، یہ ان سے ہرگز برداشت نہ ہوتا۔ سولہ سترہ سالہ نسیم کو بیک وقت دو محاذوں کا سامنا تھا۔ جہاں اس کی کم عمری، نا تجربہ کاری اور بے تحاشہ حسن سب سے بڑی کمزوری تھی۔ غلام محمد کے گھر کی روٹین لگی بندی تھی۔ وہ صبح سویرے مندرہو جھیرے اپنی دکان کھولتا۔ دہی اور انڈے اس وقت خوب بکتے۔ نو دس بجے وہ ناشتا کرنے نکلتا۔ نسیم گھر صاف ستھرا کر کے چکا چکی ہوتی۔ اس وقت ناشتا کیا جاتا جس

میں کچھ نقص نکالنا پھوپھی اماں اپنا فرض سمجھتیں۔

”نسیم! روٹی موٹی پکائی ہے۔ غلام محمد کے لیے بل والے پراٹھے بنانا۔ آج چائے پتلی ہے۔ کل ہی انڈہ بنایا تھا، آج دہی منگوا لیتی“۔ رہی سہی کسر غلام محمد پوری کر دیتا۔ پھوپھی اماں لاکھ اعتراضات کے باوجود نسیم کے ہاتھ کا بنانا ناشتا رغبت سے کھالیتیں۔ بقول نسیم کی ماں کے کہ ”تیری پھوپھی زبان کی کڑوی ہے مگر دل کی اچھی ہے“ مگر غلام تو زبان کا کڑوا ہونے کے ساتھ ساتھ دل کا بھی بہت سخت تھا۔ بچپن سے ہی اس نے تین بہنوں کے اکلوتے بھائی ہونے کا بہت فائدہ اٹھایا اور اب رعب اور عقہ اس کی فطرت کا حصہ بن چکے تھے۔

نسیم فی الحال گھریلو کاموں میں بہت طاق نہیں تھی۔ اس نے تو بس اسکول میں خوب دل لگا کر پڑھا اور قرآن پاک کی قرأت بہت محنت سے سیکھی تھی۔ سو ان چولے بانڈی کے کاموں میں وہ گھبرا جاتی۔ نسیم کی خوبصورتی غلام محمد کے غصے کو مزید بھڑکا دیتی اور اس کا احساس کمتری عود کر آتا۔ غلام محمد کے غصے کی وجہ سے وہ شادی کے ابتدائی دنوں میں بھی سنگھار نہ کر سکی لیکن وہ اپنے سفید رنگ اور قدرتی گلابی گالوں کا کیا کرتی جو سادہ پانی سے بھی دھل کر نکھر اٹھتے۔ سادہ کپڑوں اور سیدھی چٹیا میں بھی وہ سب تندر کے درمیان بیٹھی مور پری لگتی۔ سو صبح صبح غلام محمد اسے دیکھ کر چڑا جاتا۔ کبھی پراٹھوں پر اعتراض ہوتا تو کبھی سائیں پر... برتن روز چلنے جاتے۔ شروع کی ڈانٹ ڈپٹ میں رفتہ رفتہ مار پیٹ بھی شامل ہونے لگی تھی۔

آس پاس محلے کی عورتوں نے نسیم کی خوبصورت قرأت کئی بار سنی تھی۔ انھوں نے پھوپھی اماں سے اصرار شروع کیا کہ نسیم کو ہماری بیٹیوں کو قرآن پڑھانے کی اجازت دے دیں۔ غلام محمد نسیم کے کسی سے ملنے کے بھی حق میں نہ تھا مگر ماں کی سفارش اور قرآن کی تعلیم پر اس کو اجازت دینا ہی پڑی۔

”دیکھ نسیم! تو قرآن پڑھا دیا کہ مگر میرے دکان پر جانے کے بعد بیچیاں آئیں اور میرے آنے سے پہلے جا چکی ہوں۔“ غلام محمد نے شرط لگائی ”ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا“ نسیم پر جوش انداز میں بولی۔

”صبح فجر کے بعد بیچیاں آیا کریں گی۔ پھوپھی اماں کے سامنے ہی انھیں سبق دوں گی اور گھنٹا بھر میں سب واپس“ نسیم بولی۔

”دیکھ مجھے کوئی شکایت نہیں ملتی چاہیے۔“ اب غلام محمد ذرا سختی سے بولا۔ دراصل نسیم کا خوشی سے کھلا چہرہ اسے فکر مند کر رہا تھا۔

”کسی بچی سے فالتوبات نہ کرنا“۔ اب وہ غزایا ”معتصوم بچپن نے کون سی فالتوبات کرنی ہے۔“ نسیم سادگی سے بولی۔

”بس! یہ خاندانوں کے آگے زبان چلانے والی عورتیں ہی جڑی ہوئی ہیں۔“ نسیم کے جواب نے غلام محمد کے تن بدن میں گویا آگ ہی لگادی۔ وہ ایک طرف ہولتا رہا اور بہت لمبی نظر پر کے بعد اس نے آخری جملہ یہ کہا۔

خاندانوں کی ناشکری کرنے والی عورتیں سیدھی دوزخ میں جائیں گی۔ اتنی لمبی تقریر سن کر نسیم کی بھوری کانچ سی آنکھیں خوف، حیرت اور دکھ سے پانیوں سے بھر گئیں۔ اس کی ناک مزید گلابی ہو گئی۔ غلام محمد کے اندر کے کینے مرد کو عجیب سی تسکین ملی۔ اس کا دل اب اس ملول زندہ لڑکی کو دیکھ کر مطمئن تھا۔ عمر میں بیس برس کا فرق اور نسیم کی بے نیازی و بے فکرگی، یہ وہ خوف تھے جو غلام محمد کو دن رات بے چین کیے رکھتے۔

اگلے روز فجر کے بعد جب غلام دکان پر چلا گیا تو محلے کی مائیں اپنی بیٹیوں کو قرآن پڑھانے کے لیے لانا شروع ہو گئیں۔ دروازے کے سامنے ہی پھوپھی اماں اپنی چار پانی بھرا کر بیٹھی تھی۔ ہر عورت پہلے ان سے دعا سلام کرتی اور پھر

نسیم کے پاس بچی چھوڑ جاتی۔ زمین پر چٹائیاں بچھا کر جگہ بنا لی گئی تھی۔

ساتھ والی محمد بخش کلرک کی بیوی اپنی دو بیٹیوں کو لائی، تو سامنے والی شریف صاحب کی بیگم اپنی تین پوتیوں کو لے آئیں۔ دو گھر چھوڑ کر رہنے والی باجی طاہرہ بھی اپنی بھانجی کے ساتھ آن پہنچیں۔ شروع میں یہ چھ بچیاں قرآن پڑھنے آئے لگیں۔ نسیم نے نورانی قاعدے سے پڑھانا شروع کیا۔ صبح حج ان کا صحن بچپوں کی آوازوں سے مہکتے لگتا۔

بچیاں الفاظ کی ادائیگی سے زیادہ توجہ اپنی ایک لے رکھنے پر دیتیں۔ کبھی کبھی کوئی بچی منید بھی ہوتی تو دوسری بچیاں اس کا مذاق اڑاتیں۔ نسیم کی تلاوت کلام پاک واقعی بہت خوبصورت تھی۔ اکثر مائیں اور دادیاں بھی اس کی تلاوت سننے وہیں بیٹھ جاتیں۔ نسیم قرآن پڑھا کر آخر میں بہت دل سوزی سے دعا مانگتی۔ اس کا مقصد اس طرح بچپوں کو دعا مانگیں یاد کروانا ہوتا۔ روز مائیں بھی اپنی دعائیں اس دعا میں شامل کر دیتیں۔ وہ سب اس دعا کے ذریعے رب کے ساتھ بھی جڑتی جا رہی تھیں اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے محبت کے رشتے مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔

کچھ عرصے بعد ماؤں کے اصرار پر اب عصر کے بعد بھی نسیم بچپوں کو قرآن پڑھا لے لگی۔ یہ بچیاں صبح شام اس کے ساتھ مل کر گھر کے بہت سے کاموں میں مدد بھی کر دیتیں۔ سبق یاد کرتے کرتے بہت سے کام ہو جایا کرتے۔ اب بھوپھی اماں کا دل بھی اس آمدورفت سے خوش رہتا۔ البتہ ایک غلام محمد تھا جس کے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی کے کوئی آثار نہ تھے۔

نسیم کا پاؤں بھاری ہونا پورے گھر کے لیے خوشی کی خبر ثابت ہوئی۔ بھوپھی اماں نے پہلے ہی روز نسیم کو دھمکی دے ڈالی کہ پٹا پٹا ہونا چاہیے۔ نسیم کی ماں بھی اس روز بیٹی سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ اُسے یہ دھمکی بہت ناگوار گزری اور اس

سے ربا نہ گیا۔

”آپا خود تو پہلے تین بیٹیاں پیدا کیں چوتھے نمبر پر غلام محمد پیدا ہوا تھا اور میری معصوم بچی کو پہلی بار میں یہ دھمکی...“ بھوپھی اماں بھادج کے سامنے تو خاموش ہو گئیں مگر رات گئے غلام محمد کی آمد پر خوب دل کی بھڑاس لگائی اور بھادج کی باتوں کا غصہ بھوپر خوب اچھی طرح نکالا۔

اس خوش خبری کا استقبال اس بھیا نک انداز میں ہوگا، یہ نسیم کے دہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آج تو غلام محمد نے تھپڑوں اور گھونسوں کا بھی خوب استعمال کیا اور اس جہنمی عورت کے دوزخی ہونے پر مکمل فتویٰ لگا دیا۔ جس عورت سے اس کا شوہر راضی نہیں وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ نسیم صفائی دینے کے لیے بولنے کی کوشش کرتی تو نیا فتویٰ لگ جاتا، خاموش رہتی تو الگ۔ غلام محمد کی طویل تقریر اور مار پیٹ کے ختم ہونے تک اس پر اپنے ماں باپ کے ساتھ ساتھ تمام بہن بھائیوں سے ملنے پر پابندی لگ چلی تھی۔ بقول غلام محمد ایک بیوی پر سب سے زیادہ حق اس کے شوہر کا اور شوہر پر اس کی ماں کا ہی ہوتا ہے۔

نسیم کے لیے اس پہلی خوش خبری کا ایک ایک دن نئے عذاب کی طرح تھا۔ پٹا پیدا کرنے کی یاد دہانی ہمہ وقت کروائی جا رہی تھی اور بیٹی ہونے کی صورت میں نتائج کی ذمہ داری نسیم ہوتی۔

نسیم کا قرآن پاک پڑھانے کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ دس بارہ سال کی بچیاں نسیم کے ہر ہر کلمہ کو سمجھنے لگی تھیں۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ وہ اپنی استانی جی کی کوئی مدد کر سکیں۔ بچیاں صبح سویرے اس کے گھر کی صفائی کر دیتیں۔ برتن دھو کر آٹا گوندہ دیتیں بلکہ ناشا بھی بنا دیتیں۔ شام والی بچیاں کپڑے دھو کر ڈال دیتیں کھانے کا انتظام کر دیتیں۔ شام کے وقت کوئی نہ کوئی بچی اچھی چیز یا مزے کا سائیں اکٹھے بچا کر نسیم کے کمرے میں رکھ جاتی اور دعاؤں کے رشتے نے تو ان

سب کو ایک دوسرے سے جوڑ ہی رکھا تھا۔

ان نو ماہ میں روز صبح شام سب نے نسیم کے لیے اولاد نرینہ کی دعا کی۔ اس لیے نہیں کہ ان کی نظر میں بیٹے کی ہی اہمیت تھی، بلکہ اس لیے تاکہ نسیم پر آنے والی متوقع مصیبتوں کو نالا جائے۔ نسیم نے آدھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر بیٹا مانگا تھا۔ پورا محلہ اس کے لیے دعا گو تھا۔ یہ سردیوں کی ایک سرد اور دھند میں لپٹی صبح تھی جب مقامی اسپتال میں نسیم نے ایک بچی کو جنم دیا۔ بھوپھی اماں اور غلام محمد تو بچی کی ولادت کا سنتے ہی واپس گھر آ گئے۔ بھوپھی اماں نے مہربانی یہ کہ نسیم کی ماں کو فون کر دیا۔ اسپتال کا بل ادا کر کے نسیم کی ماں اسے اپنے گھر لے گئی۔ چالیس روز نسیم وہیں رہی۔ خفی بچی بالکل اپنی ماں جیسی تھی۔ بھولوں کی سی کھلی کھلی۔ سفید روٹی کے گالوں جیسی اور ماں جیسی بھوری کاٹچ سی آنکھیں۔ نسیم نے اس کا نام عائشہ صدیقہ رکھا۔ اس کے محلے کی عورتیں اور اس کی شاگرد بچیاں بچی کو دیکھنے نسیم کی ماں کے گھر آئیں اور اپنی استطاعت سے بڑھ کر بچی کو تحائف اور قوم دیں۔

سوا مہینے بعد بھوپھی اماں پوتی کو لینے بھائی کے گھر آئیں۔ بھائی کے سامنے نسیم کی ہزار برائیاں اور سب سے بڑا قصور بیٹی پیدا کرنے کو معاف کرتے ہوئے ساتھ لے جانے کی خوش خبری سنا کر گویا ان پر احسان جتانے لگیں۔ کہنے کو تو نسیم کی ماں کو کبھی لاکھ گلے تھے مگر بھائی اپنی بیٹی کا گھر بچانے کے لیے خاموش رہا۔ گلابی کبل میں لپٹی اس پیاری سی بچی کو لیے نسیم واپس سسرال آ گئی۔ اس کے حساب میں ایک اور گناہ لکھ لیا گیا تھا اور میکے والوں سے ملنے پیامت کرنے پر پھر سے پابندی لگادی گئی تھی۔

غلام محمد ہمیشہ اپنی بہنوں کے بچوں کے خوب چونچلے اٹھایا کرتا مگر خفی عائشہ کو دیکھنا بھی اس کی آنا کے خلاف ٹھہرا۔ نسیم کا اتنے دن میکے پر جناہ جرم تھا جس کی معافی ممکن نہ تھی اور سب سے بڑا احسان نسیم کو بچی سمیت گھر واپس آنے

کی اجازت دینا۔ اپنے تئیں غلام محمد نے بہت اعلیٰ ظرفی دکھائی تھی۔ اس کی دکان ان دو سالوں میں ڈیپارٹمنٹل سٹور بن چکی تھی۔ شادی کے بعد سے اس کی آمدن میں نمایاں اضافہ ہوا تھا۔

نسیم کو خرچ کے نام پر الگ سے ایک پیسا بھی دینے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی۔ بچی کی پیدائش پر بھی سارا خرچ نسیم کے والدین نے اٹھایا تھا۔ نسیم کی واپسی پر اس کی ایک شاگردہ نے اپنے گھر سے روز دودھ لاکر دینا شروع کر دیا۔ دوسری شاگردہ کی ماں ویسی بھی تو تیسری پنچیری بنا کر لے آئی۔ بچی کو سنبھالنے کے لیے یہ بچیاں ہمہ وقت تیار رہتیں۔ کوئی نہ کوئی عورت عائشہ کے لیے فراک سی کر لے آتی۔ گھر میں قرآن کی تعلیم پھر سے جاری ہو گئی۔ نسیم اس میں خوب مصروف رہتی۔ غلام محمد کے گھر آنے کے اوقات میں خاموشی ہو جاتی۔ عائشہ کو کبھی سلا دیا جاتا تو اس کی آواز سن کر غلام محمد ناراض ہوتا۔

باپ نے عائشہ کو پہلی بار گود میں اٹھایا جب گرمیاں آ چکی تھیں۔ چھ سات ماہ کی گول منول سرخ سفید بچی گھٹنوں گھٹنوں چلتی خود ہی باپ کے پاس آ گئی۔ نسیم کسی کام میں مصروف تھی۔ اتنی معصوم مسکراہٹ پر باپ نے بیٹی کو گود میں اٹھایا لیا پھر نسیم کو آواز دی اور ماؤں کے اولاد کی طرف سے ایسے غافل رویے پر بہت سی وعیدیں سنائیں۔ آخری جملہ وہی تھا کہ جس عورت سے اس کا غاوند راضی نہیں وہ جہنمی ہے۔ عائشہ کو گود میں لے کر پشیمان اور شرمندہ نسیم اندر کرے میں چلی گئی۔

اگلے سال پھر وہی آزمائش آن پڑی۔ نسیم پھر امید سے تھی اور اس مرتبہ غلام محمد نے بیٹی ہونے کی صورت میں طلاق کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ نسیم کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ طلاق کی تلوار غلام محمد روز اس کے سر پر لگاتا۔ نسیم کا مگر جھایا ہوا زرد چہرہ اسے نفسیاتی تسکین دیتا۔

نسیم کے جیمز اور بری کے کپڑے پہن پہن کر اب بالکل گھس چکے تھے۔ پھوپھی اماں نے کئی مرتبہ گرمیوں اور سردیوں میں اپنے اور بیٹے کے بہت سے کپڑے خریدے اور سلوائے مگر نسیم دونوں میں سے کسی کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس مرتبہ اس کے ہاں دوسرے بچے کی پیدائش گرمیوں میں متوقع تھی۔ یہ پرانے اور خستہ حال کپڑے اس کے پھیلے ہوئے وجود کو ڈھانپنے میں ناکام تھے۔ شام کو جب غلام محمد گھر آیا تو نسیم بیٹی کو چار پانی پر بٹھا کر کھانا کھلا رہی تھی۔ اس کے دوپٹے کے شگاف اس کے بال ڈھانپنے سے قاصر تھے قییس کو تین جگہ سے سیا گیا تھا مگر پھر بھی اس کا جسم کہیں کہیں سے نظر آ رہا تھا۔

غلام محمد کی نگاہ نسیم کے بے رونق اور خشک ہوئے زرد چہرے پر پڑی اور ساتھ ہی اس نے نسیم پر تھپڑوں اور گھونسوں سے حملہ کر دیا۔ ”لعنت ہے ان عورتوں پر جو کپڑے پہن کر بھی تنگی رہتی ہیں۔ یہ تم قرآن پڑھاتی ہو؟ اور خود ایسے عربیائی اور فحاشی پھیلا رہی ہو۔“ نسیم خوفزدہ ہو کر مار کھاتی رہی۔ عائشہ سہم کر زور زور سے چیخنے لگی۔ سیانی پھوپھی اماں ایسے موقعوں پر کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھیں کہ یہ میاں بیوی کا آپس کا مسئلہ ہے۔ نسیم بے دم ہو کر چار پانی پر ڈھسے گئی۔ اس کے کپڑے مزید پھٹ گئے۔

”جاؤ جا کر ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔“ غلام محمد غصے سے چلایا۔

”کون سے کپڑے؟ میرے تو سارے کپڑے ایسے ہی پھٹے ہوئے ہیں۔ عورتوں کے جسم ڈھانپنے کے لیے کپڑے خریدنے بھی تو پڑتے ہیں۔“ نسیم کا پچھتے ہوئے سہم کر بولی۔ ”شوہروں کے آگے زبان چلانے والی عورتیں جنہی ہوتی ہیں۔“ غلام محمد غرا یا

غصے سے نسیم کو دیکھا وہ کمرے میں آ گیا۔ نسیم کا بکس کھولا جو واقعی سارا ہی پھٹے پرانے کپڑوں سے بھرا تھا۔ ”چار سال

میں اس منحوس عورت نے ایک بھی کپڑا سلامت نہ چھوڑا۔ پورے دس جوڑے بنائے تھے میری ماں نے۔“ غلام محمد کا کمال بھی تھا کہ وہ ہر بات میں تصور بیوی ہی کا نکال لیتا۔

”اللہ بھی اپنے پیارے بندوں کا ہی امتحان لیتا ہے۔ یا شاید میں واقعی جہنمی ہوں۔ میں نے کتنا تڑپ تڑپ کر بیٹا مانگا، کتنی ہی منتیں مانگیں۔ کتنا قرآن پڑھا، پڑھا یا۔ دعائیں کیں مگر اللہ ساتیں نے مجھے پھر بیٹی دے دی۔“ نسیم لیڈی ڈاکٹر کو اپنی ماں کا فون نمبر دیتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی کیونکہ اس مرتبہ پھوپھی اماں اور غلام محمد اُسے تنہا اسپتال میں چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ یہ تو اس کی شاگردہ کی ماں تھی جو عائشہ کو لیے لیبر روم کے باہر موجود بیچ پر بیٹھی رہی اور جس کے پاس فی بیچی کے لیے کپڑے بھی تھے۔

اس مرتبہ پھر نسیم پر فرد جرم لگا دی گئی تھی۔ اس کا تصور دوسری مرتبہ بیٹی کی پیدائش تھا۔ غشی فاطمہ زہرا بہت ہی حسین بچی تھی۔ بالکل صابر اور پرسکون۔ اس بار نسیم پورے تین ماہ اپنی ماں کے گھر رہی۔ پھوپھی اماں اور غلام محمد نے ایک مرتبہ بھی آنے کی زحمت نہ کی۔

ان دنوں غلام محمد کو کاروبار میں بہت منافع ہوا۔ اس نے اپنے سنٹر کو سیلف سروس مال بنالیا۔ اس کے ملازمین کی تعداد بھی بڑھ گئی اور اس کی کھٹارا موٹر سائیکل کی جگہ ایک کار بھی خرید لی گئی۔

تین ماہ بعد پھوپھی اماں پھر نسیم اور اپنے بھائی پر احسان کرتی اسے لینے آ گئی تھیں۔ مجبوری تھی کہ اس بڑھاپے میں گھر کے کام کاج اور غلام محمد کے نخرے اب اٹھائے نہ جاتے تھے۔ سارا گھر ان ہی نسیم کا محتاج تھا مگر اس حقیقت کا ادراک کبھی نسیم کو نہ ہونے دیا گیا۔

”پھوپھی اماں! غلام محمد نے تو مجھے بچی ہونے کی صورت میں طلاق دینے کا کہا تھا۔ میری بچی کے بعد میری تو طلاق ہو گئی ہے ناں۔“ نسیم نے دل کی بات کہہ دی۔

”ارے بیٹا یہ تو سارے مرد ایسے ہی کرتے ہیں۔ بھلا دھمکیوں سے طلاق تھوڑی ہو جاتی ہے۔ وہ تو بس تجھے غصے میں دھمکاتا تھا۔“ پھوپھی اماں بڑی محبت سے بولیں۔

”ابا جی! اب آپ کسی عالم سے فتویٰ لیں۔“ نسیم نے باپ کو کچھ میں ڈالا۔ ابا جی اور غلام محمد ایک مفتی صاحب کے پاس گئے اور پھر طلاق نہ ہونے کے فیصلے کے ساتھ واپس آئے۔ خاندان بھر میں اس معاملے کا چرچا تھا۔ نسیم کو پھوپھی اماں دونوں بچیوں کے ساتھ واپس لے آئیں۔

ڈھائی سالہ عائشہ صدیقہ اور تین ماہ کی فاطمہ زہرا۔ غلام محمد نے دونوں کو ہی دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ کاروبار میں زبردست ترقی کا کچھ بھی اثر گھر کے ماحول یا رویوں پر نہ پڑا تھا۔ صرف پھوپھی اماں کے بازو میں دو کڑے، کانوں میں بالیاں اور مینگے کپڑوں کا اضافہ ضرور ہوا۔ اس کے علاوہ گھر کی ہر چیز ویسی کی ویسی تھی جس میں سب سے اہم چیز نسیم کی اپنی اہمیت اور حیثیت۔

قرآن کی تدریس کا سلسلہ پھر شروع ہو چکا تھا۔ اب عائشہ بھی دوسری بچیوں کے ساتھ دوپٹا اوڑھ کر بیٹھنے لگی تھی۔ زندگی دھکے کھانے کے بعد پھر سے رواں ہو رہی تھی۔

نسیم کی زندگی میں تیسرا امتحان اگلے برس ہی آن پہنچا۔ نسیم نے اس بار خود کو اپنے رب کے حضور گڑ گڑانے والی بنا لیا۔ وہ خاموشی سے غلام محمد کی باتیں سننے، مار کھاتی پر ایک حرف زبان پر نہ لاتی۔ غلام محمد کو اس کی خاموشی پر بھی آگ لگ جاتی۔ اس کے صبر کو وہ ڈھٹائی کا نام دیتا۔

”شوہروں کی ناشکری کرنے کی وجہ سے عورتوں کی اکثریت جہنم میں ہوگی۔“ اگر عورت کو اللہ نے عقل دی ہوتی تو وہ بھلا کیوں اس کی گواہی کو آدھا کر دیتا۔ عورت کم عقل ہے۔ ناشکری، زبان دراز، جہنمی۔۔۔ جتنا وقت وہ گھر میں رہتا، یہی جملے دہراتا رہتا۔

باپ کو دیکھ کر بچیاں کونوں میں چھپ جاتیں۔ نسیم خاموشی سے اپنے کاموں میں لگ جاتی۔ بچوں کی مسکراہٹ، شونہیاں اور معصومیت سب ہی گم ہو جاتا۔ نسیم کے لیے یہ نو ماہ پہاڑ جیسی آزمائش کے تھے۔

تیسری مرتبہ اللہ کے کرم سے نسیم نے جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا۔ غلام محمد بہت خوش تھا۔ پھوپھی اماں نے مٹھائی تلے بھر میں تقسیم کروائی۔ نسیم کو اسپتال سے گھر لائیں۔ بیٹیوں کی خوب آواز بھگت ہو رہی تھی۔ نندہ بھی بھاگی بھاگی آئیں۔

یہ نسیم کی خام خیالی تھی کہ بیٹیوں کے بعد اس کی آزمائش کچھ کم ہو جائے گی اور اب غلام محمد اپنی اولاد پر کچھ خرچ کیا کرے گا مگر ہوا یہ کہ بیٹیوں اور بیٹیوں کے لیے رویوں کا فرق ایک نئے پہاڑ کی صورت کھڑا ہو گیا۔ عائشہ اور فاطمہ دونوں بہت حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھیں مگر غلام محمد انہیں تعلیم دلانے کے قی میں نہ تھا۔ نسیم نے بڑی مشکل سے باپ سے اجازت لے کر انہیں سرکاری اسکول میں داخل کر دیا۔ چند ہی برس بعد عمر اعلیٰ کے لیے مینگے انگریزی میڈیم اسکول کا انتخاب ہوا۔ کاروبار میں بے تحاشا اضافے کے باوجود نسیم کو گھر کے خرچ اشیاء کی تعلیم کے لیے بہت ہی کم پیسے دیے جاتے۔

”فضول خرچ عورتیں جہنمی ہوتی ہیں۔“ قرآن پڑھانے والی لیکن اس پر عمل نہ کرنے والی عورتیں بھی دوزخ میں ہی جائیں گی۔“ جانے عورتوں کے جہنم میں جانے کی اتنی بے شمار احادیث غلام محمد کو کس نے سنائی تھیں۔ شوہر کے آگے بولنے والی، بات کرنے والی، اپنی بات کی وضاحت دینے والی، سب عورتیں ناشکری ہو جاتی ہیں اور پھر بیٹی جہنم میں پہنچ جائیں۔

عائشہ اور فاطمہ نے سرکاری اسکول سے ایشیائی مہروں سے میٹرک کر لیا۔ وہ گھر کا کاموں میں بھی بہت ملال تھیں۔ ان کی خواہش تھی، معصومیت اور سکھ رہیں لے انہیں ہر جگہ

نمایاں کر رکھا تھا۔ نسیم انھیں اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتی تھی۔

اب اس کے پاس قرآن پڑھنے آنے والی بچیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ ماہیں اپنی بچیوں کو استانی جی سے قرآن پڑھنے بہت شوق سے سمجھتیں۔ عائشہ اور فاطمہ بھی ماں کی طرح خوبصورت قرأت سکھ چکی تھیں سوا کثروہ دونوں بھی بچیوں کو سبق دے دیا کرتیں۔ علی اور عمر بھی ماں ہی کی طرح بہت سہجے ہونے خوفزدہ نہ تھے۔ باپ کی ماں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا اثر بچوں پر بہت گہرا تھا۔ اچھا اسکول بھی انھیں اعتماد دینے سے قاصر رہا تھا اور درجیب خرچ کے طور پر ملنے والی رقم بھی ان کے دلوں میں باپ کی محبت یا لگاؤ پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔

فجر اور عصر کے بعد پرندوں کی چھپا ہٹوں کی مانند بچیوں کی قرآن پڑھنے کی آوازیں نسیم کے صحن کو رونق بخش دیتیں۔ کبھی کوئی بچی گھٹنوں تک آتے فراک پر بڑا سو پٹا اوڑھے نورانی قاعدہ پڑے آن پہنچتی تو کوئی توتلے انداز میں الفاظ دہرا رہی ہوتی۔ کچھ بچیاں ہفتوں ہفتوں بس بٹنے اور سر بلانے کی مشق کرتی رہتیں۔ اب اس کی شاگردوں کی دوسری نسل بھی اس کے پاس آنے لگی تھی۔ محلے بھر میں استانی جی کی شرافت اور قرآن سے محبت کی مثالیں دی جاتیں۔ محلے کی ہر ماں اپنی بچیوں یا بیٹیوں کے لیے مشورہ کرنے، دعائیں کروانے نسیم کے پاس آتیں۔ پھوپھی اماں کی چار پائی اب بھی داخلی دروازے کے سامنے ہوتی، بس اب عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تیز گاہیں کچھ کمزور ہوتی جا رہی تھیں مگر ان کی نگرانی اب بھی بہت کڑی تھی۔

عائشہ کے میٹرک کرنے کے بعد نسیم پر ایک اور کڑا امتحان آن پڑا۔ بچی پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور اسے پڑھنے کا شوق بھی بہت تھا مگر غلام محمد اس حق میں نہ تھا۔ اوپر سے تینوں نندوں نے اپنے اپنے بیٹوں کے لیے سوال کر رکھا

تھا۔ غلام محمد کے بھانجے اسکول کی شکل بھی نہ دیکھے ہوتے تھے۔ ایک مستری، دوسرا ویلڈر اور تیسرا بس مرغے لڑاتا یا بیٹوں پر شرطیں لگاتا۔ باپ سعودی عرب سے محنت کر کے پیسے بھینچتا اور بیٹا اپنے شوق پورے کرتا۔

پھوپھی اماں کے لیے تینوں نواسے برابر تھے اور ”بہترین“ بھی مگر پوتی فی الحال ایک ہی تھی۔ سو فیصلہ کرنا کٹھن تھا۔ نسیم کو یوں لگتا جیسے وہ اپنے ساتھ کم عمری میں ہونے والی زیادتیوں کا اپنی بیٹی کے لیے دروازہ کھول رہی ہے۔ اللہ سے مانگتے گلو گزوانے کا سلسلہ پھر بہت طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اللہ تو مسبب الاسباب ہے، مقرب القلوب ہے، فتح الالباب ہے۔ میری فریاد سن لے۔ صبح شام دعائے استخارہ پڑھتی کہ ”اے اللہ اگر اس معاملے میں بھلائی ہے تو ٹھیک اور اگر برائی ہے تو اسے مجھ سے دور کر دے۔“

گرمیوں کی طویل دوپہر کے بعد عائشہ نے عصر کے وقت صحن میں چھڑکاؤ کر کے چار پائیاں بچھا دیں۔ بچیاں اپنا سبق یاد کر رہی تھیں۔ ساتھ والے پڑوسی محمد بخش صاحب کی بیگم اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ چلی آئیں۔ یہ دونوں نسیم کی پہلی شاگرد تھیں۔ اندر کمرے میں بیٹھ کر پانی پیتے دونوں بچیاں حیران تھیں کہ سولہ سترہ برسوں میں استانی جی خود اور ان کا گھر بالکل ویسے کے ویسے تھے جبکہ غلام محمد کی کریانے کی دکان اب علاقے کے بہترین شاپنگ مال میں تبدیل ہو چکی تھی۔

استانی جی آج ہم آپ سے عائشہ کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ مانگتے آئے ہیں۔ بڑی بیٹی نے ماں سے پہلے اپنے آنے کا مقصد بتا دیا۔ آری میں کیپٹن ڈاکٹر وحید سے بھلا استانی جی کیسے ناواقف ہو سکتی تھیں۔ کتنے سال انھوں نے اپنی پڑوسن کے کہنے پر اس کا نام لے لے کر کامیابی کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اب وہ پڑوسن اپنے سب سے لائق بیٹے کے لیے نسیم کے سامنے جھولی پھیلائے بیٹھی تھیں۔

”بے شک میرے رب تو ہی میرا مولیٰ ہے، میرا مالک ہے۔ تو سنا ہے۔ تو دور کھولتا ہے، آسانیاں کر دیتا ہے“

بے اختیار نسیم کی آنکھوں سے ننگھرے موتی بہنے لگے۔ اب یہ رشتہ غلام محمد کے سامنے رکھا گیا۔ مگر بھانجوں کا پلڑا بھاری تھا۔ نسیم نے زندگی میں پہلی بار غلام محمد سے بحث کی۔ آخر پھوپھی اماں اور غلام محمد نے نسیم کو اپنے بل بوتے پر بیٹی کی شادی کرنے کی اجازت دیتے ہوئے ہر خرچ سے لاتعلقی ظاہر کر دی۔ غلام محمد نے نسیم کو اس من مانی کے لیے ایک دھیلا بھی دینے سے انکار کر دیا۔

محمد بخش کے گھر والوں نے جہیز کے نام پر کچھ بھی لینے سے منع کر دیا تھا پھر بھی ایک ماں اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ کیسے رخصت کر دیتی۔ اور کچھ نہیں تو کھانے پینے اور بارات کے کھانے پینے کا انتظام تو کرنا ہی تھا۔ نسیم کے پاس بیج پونجی کے نام پر کچھ بھی نہ تھا۔ پھوپھی اماں کے کونے اور بددعائیں الگ جاری تھیں۔ مگر نسیم نے اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہوئے رشتے کے لیے ہاں کر دی۔ اب اس کا ساتھ دینے کے لیے سارا محلہ کھڑا تھا۔ اس کا باپ، بھائی سب موجود تھے۔ شادی کی تاریخ فوراً طے کر دی گئی اور اگلے مہینے ہی کیپٹن صاحب کو بارات لانے کی تاریخ دے دی گئی۔ پورا مہینہ نسیم نے جان کنی کی حالت میں گزارا۔ شادی کے لیے واقعی کچھ ہاتھ پلے نہ تھا۔ عائشہ کی بارات سے ایک روز پہلے غلام محمد حسب معمول اپنے اسٹور پر جا چکا تھا۔ نسیم کی تینوں نندیں اپنے بچوں کے ساتھ تماشا دیکھنے آئیں۔ عائشہ سسرال کی طرف سے آئے پہلے جوڑے میں خوف سے بیٹھی ہول رہی تھی۔ ماں کی یہ پہلی بغاوت نہ صرف اس کے بلکہ باقی تینوں بزدل بہن بھائیوں کے لیے بھی ایک خوفناک ہم کی مانند تھی۔

شام ہوتے ہوتے محلے سے نسیم کی تمام شاگردیں سب

سنوریں آنا شروع ہو گئیں۔ صحن میں شامیانہ لگ چکا تھا۔ دیکھیں محلے کے میاں جی اپنی زیر نگرانی پکوار ہے تھے۔ شادی کا تمام انتظام اہل محلہ سنبھال چکے تھے۔ گھر کا کاپ کمرہ خالی کر دیا گیا تھا جس میں عائشہ کے جہیز کی چیزیں اٹھنی کر کے رکھی جاتی تھیں۔ گھٹنے بھر میں بہترین چمکتا ہوا فرنیچر، فریج، ولی وی، پنکھا، کراکری، بیٹی، بستر سب جمع ہو چکے تھے۔ سب خواتین نے باقاعدہ منصوبہ بندی سے چیزیں ہاتھ میں قسم کی قسم لے لیں۔ بھلا اٹھارہ برس سے بلا معاوضہ قرآن پڑھا لے والی استانی جی کو کیسے تنہا چھوڑا جاسکتا تھا؟ کپڑے اور زینہ بھی اس کمرے میں پیک شدہ بیچنے چکے تھے۔ سب چیزیں پھوپھی اماں اور ان کی بیٹیوں کی تسلی کے لیے یہاں اٹھنی کی گئی تھیں اور رات کو کیپٹن صاحب کے ہاں پہنچا دی گئیں۔

اگلے روز بارات کا انتظام اس سے بھی زیادہ شاندار تھا۔ غلام محمد مجبوراً دنیا دکھاوے کو بارات کے استقبال کے لیے آن پہنچا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے بڑی تنہدگی اور مدداری سے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ یوں کہ جیسے وہ دہائی آتا تو کوئی کام رکے والا نہ تھا۔ شادی میں شریک ہر ایک مرد نے غلام محمد کو مبارکباد کے ساتھ سلامی کا لفظ دیا۔ دن میں بیٹوں کی مالیت ہزاروں میں تھی۔ کراچ میں حق مہر خاصا بھاری باندھا گیا جو فوری طور پر دلہانے ادا کر دیا۔ بڑی عزت احترام سے عائشہ رخصت ہو کر اپنے سسرال گئی۔

منونیت سے اس کا سارا سسرال بچھا چلا جا رہا تھا۔ نسیم کے لیے نیا جوڑا جانے کون لایا تھا مگر اس خوبصورت سوٹ میں وہ جنت کی حور کی مانند سیٹھ میں بند موتی لگ رہی تھی۔ بے شک میرا مولیٰ سنا ہے۔ بے شک شکر کے الفاظ اور اشکوں کے موتی مسلسل اس کی زبان اور آنکھوں سے رواں تھے۔ اللہ اس کا سب سے بڑا سہارا، اس کا مددگار تھا۔

اگلے روز ولیدہ بہت شاعر تھا۔ غلام محمد، اس کی ماں اور بہنیں سارے انتظامات، عانتہ کا لباس اور زیورات حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کپڑے وحید اور اس کے رشتے داروں نے انھیں کسی بات پر شرمندہ نہ کیا تھا جیسے اپنی شادی سے لے کر آج تک غلام محمد اپنے ماموں کو کرتا آیا تھا۔ عانتہ کی پڑھائی دوبارہ سے شروع کروادی گئی تھی۔ نسیم اپنی بیٹی کی خوش گوار ازدواجی زندگی دیکھ کر بہت خوش تھی۔

غلام محمد کی اپنے گھر سے بے نیازی اب مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ نسیم کو بات بے بات زیادہ لگانی ہونے کے طعنے دیتا اب وہ جنہی عورت منافق بھی بن چکی تھی جس نے خود پر مظلومیت کا پردہ ڈال کر سارے محلے کو بے وقوف بنایا تھا۔ قرآن کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا اور قرآن پڑھانے کا معاوضہ بیٹی کے جہیز کی صورت میں وصول کیا تھا۔

عانتہ کی شادی کے دو سال بعد نسیم نے اسی طرح فاطمہ کا بھی بہت اچھی جگہ رشتہ کیا۔ محلے کے لوگ پھر نسیم کے لیے ڈھال بن گئے۔ دونوں بیٹیوں کو اپنے گھر میں آباد دیکھ کر نسیم اپنے دکھ بھول بی گئی۔ وہ اب بھی بہت دلچسپی سے قرآن پڑھاتی۔ اس کی تلاوت سننے بہت سی خواتین آتیں اور پھر وہ سب دعاؤں کی لڑیوں میں جڑ جاتیں۔

عمر اور علی نے بھی پڑھائی کے میدان میں کامیابی حاصل کی۔ غلام محمد ان دونوں کے میٹرک کے بعد انھیں اپنے کاروبار میں شامل کرنا چاہتا تھا مگر بیٹیوں اور باپ کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ وہ عموماً باپ اور دادی کی ماں سے زیادتیوں پر غصے میں آجاتے مگر ماں نے ہمیشہ انھیں خاموش رہنے اور باپ کا احترام کرنے کا درس دیا تھا۔

ایف ایس سی کے زلزلے سے پہلے ہی دونوں بیٹیوں کی سلیکشن فوج میں ہو گئی اور دونوں لیے تربیتی کورس کے لیے

کا کول چلے گئے۔ غلام محمد نے اس فیصلے پر بھی نسیم سے بہت جھگڑا کیا۔ اب وہ منافق سے جھوٹی، دکار اور دھوکے بازی مسد پر فائز ہو چکی تھی، جس نے بچوں کو باپ سے منکر کر دیا تھا۔ نسیم سب باتیں، گالیاں، دھمکیاں سن لیتی مگر یہ انہیں کی دھمکیاں نہ بچھلے بیس برس سے تسلسل اور تواتر سے دی جا رہی تھیں اس کے حوصلے کو توڑ کر رکھ دیتیں۔ وہ عورت جس سے اس کا فہم راسخ نہیں وہ جنہی ہے۔ یہ غلام محمد کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔

پھوپھی اماں اب ضعیفی کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھیں جہاں انھیں نسیم کی مکمل مدد ہر وقت درکار ہوتی۔ نسیم انھیں بہت محبت اور ذمہ داری سے سنبھالتی۔ بچوں کے اپنے گھروں کو جانے کے بعد اب دونوں ساس بہو ایک دوسرے کے لیے سہارا بنی تھیں مگر پھوپھی اماں اب بھی شام کو غلام محمد سے اس کی بیوی کا گلہ کرنا نہ بھولتیں۔ روز اس کی کوئی نہ کوئی کوتاہی ان کی زبان پر ہوتی۔ اب منافق، جنہی اور دھوکے باز کے بعد نسیم سست، کاہل اور احسان فراموش بھی ہو گئی تھی۔ ساس کی خدمت میں کوتاہی پر کوئی وعید غلام محمد کو تلاش کے باوجود ملتی تھی۔ سواب اس کی گالیوں کا رخ اس کی ذات کی طرف ہو چکا تھا۔

استانی جی کی شاگرد اب ہر عمر کی تھیں۔ چھوٹی پانچ چھ برس کی بچیوں سے لے کر بڑی عمر کی خواتین تک۔ قرآن کی تعلیم نسیم کی زندگی کا وہ مقصد اور کام تھا جو اسے مصروف بھی رکھتا اور اسے سکون بھی دیتا۔

اب نسیم کے بیٹے بھی کمانے لگے تھے۔ وہ چھٹیوں میں ماں کے لیے کسی نہ کسی سہولت کا انتظام کر جاتے۔ برسوں بعد اس گھر کی مرمت ہوئی۔ سفیدیاں کروائی گئیں، غسل خانہ دوبارہ سے بنایا گیا، پانی کی موٹر اور ٹینکی لگوائی گئی۔ اگلے برس بیٹیوں نے ماں کے لیے نئے بیڈ اور صوف خریدے۔ نئے برتن اور گھر کے لیے نئی چیزیں جن کی خواہش کبھی نسیم

کے دل میں ہوتی تھی۔ عانتہ اور فاطمہ ہر بار ماں کے لیے کپڑے سلوا کر لے آتیں۔ نرم اور آرام دہ جوتے، چپل۔ نسیم نے اس گھر سے نکلنا عرصہ دراز سے چھوڑ دیا تھا۔ جب کبھی اس نے کسی نئی خوشی میں جانے کی اجازت مانگی، تو غلام محمد نے اسے گھر میں ٹک کر رہا کر دیا تھا۔

دنیا کے رنگ، نئی چیزیں، نئے لوگ استانی جی کے لیے افسانوں کی طرح تھے۔ غلام محمد کا سنور ہر نئے فیشن کی چیز سے بھرا ہوتا۔ کراچی، ڈیپور، پٹن، دیپوری، جوتے، پرس، الیکٹرانکس، موبائل مگر نسیم کو کبھی گھر سے نکلنے کی اجازت نہ ملی۔ جب اس نے پہلی بار اپنی عانتہ کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھ کر پوچھا تھا کہ یہ کیا ہے، تب بیٹی کو ماں پر بہت پیار آیا۔ وہ خوب ہنسی اور پھر اسے موبائل پر دنیا کی بہت سی تصویریں دکھائیں۔ پہاڑوں، دریاؤں کا ذکر تو نسیم نے سنا تھا مگر اصل میں یہ کیسے دیکھتے ہوں گے اس دن موبائل پر دیکھا۔

عید الفطر کی آمد آمد تھی۔ نسیم اس بار اپنے بچوں کی منظر تھی۔ وہ روز پھوپھی اماں کے سامنے عانتہ اور فاطمہ کو عید پر بلانے کا ذکر کرتی۔ علی اور عمر کو بھی چھٹیوں پر گھر آنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس بار اس نے عید کے دن غلام محمد کو بھی بچوں کے ساتھ رہنے کا کہا تھا۔ تم جیسی ناشکری عورتیں ہی مردوں کو خراب کرتی ہیں۔ بھلا کاروبار میں بھی ایسی عیاشیاں کی جاسکتی ہیں؟ عید کے دن چھٹی، یعنی عین کام کا، آمدنی کا دن اور ان مولوئی صاحبہ کے کہنے پر چھٹی کرلوں۔ جانتی ہو علاقے کی عورتیں، بچیاں اور عزت دار لوگ بہت اعتماد سے ہمارے سنور پر آتے ہیں۔ اب اس اہم دن پر چھٹی کرلوں۔ میں گھر رہ کر کیا کرلوں گا؟ عجیب دوزخ بنا رکھا ہے اس گھر کو تم نے۔ جس شوہر کو اس کی بیوی سے گھر کا سکون ملے، وہ گھر دوزخ ہوتا ہے۔ غلام محمد صاحب پھر ڈانٹنے، ناراض ہونے سنور پر

چلے گئے۔ اب بڑھاپا آن پہنچا تھا مگر ان کا غرور، غصہ اور بد مزاجی کا عالم وہی تھا۔

روزوں میں نسیم کی صحت میں نمایاں فرق پڑا۔ جس کا سارا الزام پھوپھی اماں اور غلام محمد اس کی سستی اور کام چوری کو دیتے رہے۔ گرمیوں کے طویل روزے اور پھوپھی اماں کی مسلسل بیماری، ان کا ہر کام کے لیے بہو کو آواز دینا۔ گھر میں کوئی بھی دوسرا کسی کام اور مدد کے لیے موجود نہ تھا۔ رمضان کے آخر تک نسیم کی کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ کام کے دوران آنے والے پھر اب آرام کے اوقات میں بھی آنے لگے۔ دل کی گھبراہٹ بھی بڑھنے لگی۔

چاند رات کو علی اور عمر دونوں چھٹی پر گھر پہنچے۔ عانتہ اور فاطمہ بھی اپنے سسرال سے سیدھی ماں کو ملنے آئیں۔ پھوپھی۔ ماں کی صحت خاصی تھوڑی سا تھوڑی تھی۔ گھر کا سارا کام بچوں نے سنبھال لیا۔ دونوں بیٹے بھی ماں کے ساتھ لگ گئے۔ عید کے دن بچوں کو دیکھ کر نسیم میں طاقت آگئی۔ بیٹے، بیٹیاں، داماد، نواسے سب گھر میں جمع تھے۔ عید کی نماز پڑھ کر نسیم کے والد اور بھائی بھتیجے بھی عید ملنے آگئے۔ بیٹیوں نے ماں کو نئے ٹوٹوں کی گلدی دی تھی تاکہ وہ سب کو عیدی دے سکیں۔ نسیم نے سب کو عیدی دی۔

پھر ایک سلسلہ اس کی شاگردوں کی آمد کا تھا۔ جو سب کھانے پینے کے منت بنے بیکان لیے چلی آ رہی تھیں۔ عید کی صبح خوب پُور رون تھی۔ آج تو غلام محمد کو بھی نسیم کی صحت کی خرابی کا احساس ہوا۔ اس کا سفید گلانی چہرہ بالکل زردی مائل تھا۔ آواز میں کھنکھناتہ مفقود تھی مگر اس کے لیے اتنی فکر مند اولاد دیکھ کر وہ پھر چڑ گیا۔ ”ڈرامے باز عورت... سب کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ڈرامہ کر رہی ہے۔“ نسیم کے سامنے یہ فقرہ کہتا ہوا وہ اپنے سنور چل دیا۔

ظہر کی نماز کے بعد نسیم کو بڑا زوردار چکرا آیا۔ جہانماز سے



سالانہ خریداری فارم

نام

پتا

میں ماہ 20 سے اردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریداری فارم چاہتا ہوں۔ مجھے اردو ڈائجسٹ ارسال کرو دیجیے۔

1۔ بذریعہ دی بی بی میں سالانہ قیمت پوسٹ میں کو آدا کرو دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم..... روپے کا بینک ڈرافٹ اسمنی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے..... روپے اردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر A/C #: 6010052701400011

IBAN#-PK34BPUN6010052701400011

4۔ خریداری کے لیے ہمیں ای میل کریں subscription@urdudigest.pk۔ یا

5۔ سالانہ خریداری کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں 0333-4713631۔

تاریخ

اردو ڈائجسٹ سرکولیشن منیجر - III-325، جوہر ٹاؤن لاہور پاکستان
فون نمبر: +92-42-35290734-8, +92-42-35290707

اردو ڈائجسٹ 241 اپریل 2018ء

336000	17000	336000	17000	336000	17000
640000	30000	640000	30000	640000	30000
1190000	60000	1190000	60000	1190000	60000

Authorized Dealer
CREC
City Real Estate Company

Corporate Office:
Office# 5, 3rd Floor Plot# 48-C
Lane# 13, Phase 6 Bukhari
Commercial DHA Karachi
Tel: 021-35250283-84
Cell: 0302-5559502
0822-4444326

Gwadar Office
Razzak Plaza
Airport Road Gwadar
Cell: 0322-4444326
0302-5559502

Dubai Office
Shop# 3, Rivera Lake
View Apartment
Building# CBD 34 INT
City Dubai UAE
Tel: 00971-44542760

اپریل 2018ء URDU DIGEST اردو ڈائجسٹ

وہ مشکل اٹھ کر اپنے بستر تک آئی۔ ابھی دعا مانگتا رہتا تھا۔
خالہ جان آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ ڈاکٹر وحید کو سب سے
پہلے اندازہ ہوا۔ انھوں نے نسیم کی ہنسی چیک کرنے کی
کوشش کی۔ عمر اور علی ماں کو دیکھ کر لپکے۔ سب اس کے
پاس تھے مگر اس کی روح اپنے رب کی طرف لوٹ چکی تھی۔
پرندہ اپنا گھونسل چھوڑ چکا تھا۔ چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ
تھی۔ لبوں پر کلمہ مکمل ہو چکا تھا۔ آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں،
”اے نفس مطمئنہ چل اپنے رب کی طرف، وہ تجھ سے راضی اور تو
اس سے راضی۔“
کیسا نفس مطمئنہ تھا کہ اپنے چاروں جگر گوشوں کے
درمیان دنیا سے رخصت ہوا۔ جس کے ذمے کسی کا کوئی
قرض، احسان، بوجھ کچھ بھی نہ تھا۔ بس اطمینان ہی اطمینان۔
استانی جی کے انتقال کی خبر منٹوں میں محلے بھر میں پھیل
گئی۔ پورا محلہ یوں اس گھر میں امنڈ آیا جیسے یہ گھر گھر کے
اپنے عزیز کی فوسیدگی ہے۔ سارے انتظامات اہل محلہ نے
سنجھال لیے۔ غلام محمد کو گھٹنے بھر بعد یہ خبر ملی۔ استانی جی کو
رات بھر رکھنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ تمام اولادیں، رشتے دار
سب ہی تو عید کی وجہ سے موجود تھے۔ عصر کے بعد عائشہ اور
فاطمہ نے خود اپنی ماں کو نہلا دھلا کر تیار کیا۔ آج اس کی شان
بی نرالی تھی۔ خوبصورت چہرہ اور پرسکون مسکراہٹ اور ٹھیک
اسی وقت جب اس کا صحن برسوں سے تلاوت سے مہک رہا
ہوتا تھا، اسے رخصت کر دیا گیا۔ اسے کدہا دینے کے لیے
اس کے جوان بیٹے، بھائی، بھتیجے، داماد سب موجود تھے۔
غلام محمد نسیم کا آخری دیدار کرنے کا موقع قبرستان میں
ملا۔ جب اسے قبر میں لٹایا جا چکا تھا۔ بیٹوں نے باپ کو آگے
کیا، وہ اسے دیکھنے کو جھکا۔ نسیم بالکل تازگی سے مسکراتی ہوئی
نئے سفید کفن میں لیٹی تھی۔ وہ گلابی ہونٹ جس کی تازگی سے وہ
عمر بھر چلتا آیا تھا آج بہت ہی خوبصورتی سے مسکرا رہے
تھے۔ وہ یقیناً نفس مطمئنہ تھی۔ غلام محمد کے دل نے گواہی دی،
اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور سیدھے قبر میں جا گرے۔
استانی جی کا جنازہ بہت بڑا تھا۔ ان کی شاگردیں
صدے سے اس قدر نڈھال تھیں کہ سگی بیٹیوں اور باقی بچپن
میں فرق کرنا مشکل تھا۔
اگلے روز صبح سویرے پھر ان کا صحن تلاوت کی مسحور کن
آوازوں سے گونج رہا تھا۔ آج وہ خوبصورت تلاوت کرنے
والی استانی جی نہیں بلکہ ان کی وہ ہزاروں شاگردیں تھیں
جنہوں نے قرآن پاک پڑھنا، اس پر عمل کرنا اور رب سے
مانگنا انہی سے سیکھا تھا۔ ہر ہر بیٹی صدقہ جاریہ تھی۔ یہ وہ
ہزاروں گواہیاں تھیں جو غلام محمد کل سے مسلسل سن رہا تھا۔
استانی جی کے ایمان اور تقویٰ کی گواہیاں۔ اس ”جنہی“
عورت کے جنتی ہونے کے حق میں بے شمار گواہیاں۔
عید کے تیسرے روز عائشہ، فاطمہ، اپنے گھر کو جبکہ
عمر اور علی اپنے کاموں پر روانہ ہو گئے۔ کیسی بے ضرر ماں تھی
کہ بچوں کو چھٹی لینے کا ترڈ دہی نہ کرنا پڑا۔ خاموشی سے ساری
زندگی گزاری اور اس سے بھی زیادہ خاموشی سے چلی گئی۔
پھوبھی اتان تنہا اپنی چار پائی پر لیٹی دن رات نسیم کو یاد کر
رہی ہیں اور غلام محمد اس خالی درود یوار کو دیکھتے ہوئے سوچے
چلا جا رہا ہے کہ بھلا اس معمولی سی عورت کے جانے کے بعد
اس گھر کا سکون، رحمت اور برکت کہاں کھو گئی ہے۔ جانے یہ
پہلے دوزخ تھا یا اب۔ لیکن یہاں اس قدر وحشت پہلے تو کبھی نہ
تھی۔ وہ ”جنہی“ عورت جنت اپنے ساتھ لے گئی تھی۔
یہی وہ آگئیں ہیں جو گھر گھر کی زینت ہیں
بہی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں
بہی فرحت بھی راحت بھی
انہی سے رونق محفل انہی سے حرمت محفل
بہی جنت کے زینے ہیں ♦♦♦

اپریل 2018ء

اردو ڈائجسٹ 240